’’چہارسُو‘‘

..... ڈاکٹر تحسین فراقی .....

اس کتابیات کا ڈول آج سے کم وبیش دوسال قبل ڈالا گیا۔اس دوران اپنی بے پناہ مصروفیات سے کچھ نہ کچھ وقت نکال کر کتابیاتِ تحسین فراقی کی ترتیب میں لگا رہا۔خدا کا شکر ہے کہ اب یہ کتابیات کم سے کم اس حالت میں ضرور تیار ہوگئی ہے کہ اسے شائقینِ علم کے سامنے پیش کیا جا سکے۔اگر چہ اب بھی اس میں بہتری کی کافی گنجائش ہے لیکن خیال ہوا کہ کاملیّت پسندی بعض اوقات حق تلفی کا سبب بنتی ہے اور پھر تحقیق کا در تو کبھی بند نہیں ہوتا۔میں نے پیشِ نظر کتابیات میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی متنوع تحریروں کے علاوہ اُن کے فکر وفن کے حوالے سے لکھی گئی تحریروں کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔تحریروں کے علاوہ اُن کے پیش کردہ خطبات ومقالات، مکالمے (انٹرویوز)، نشریات، علمی مجالس میں شرکت اور اُن کے سَندی مقالات کی فہرست بھی پیش کردی ہے جن کی انہوں نے نگرانی کے فرائض انجام دیے۔کتابیات کو تین بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصّہ اول ڈاکٹر تحسین فراقی کی شخصیت سے متعلق ہے۔اس میں اُن کے ذاتی حالات وکوائف، تعلیمی پیش رفت اور پیشہ ورانہ خدمات کی تفاصیل درج کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اُن کی فتوحاتِ علمی اور نمایاں کارناموں اور خدمات کی تفصیل بھی مہیا کی گئی ہے تا کہ اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آسکیں۔

.....رفاقت علی شاہد

قیمت:۲۰۰، دستیابی: القمر انٹر پرائز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

..... ڈھلتی شام کے سائے .....

اب تک مجھے ان کے تین افسانوی مجموعے ''مردہ لمحوں کے زندہ صنم''۔''اجلی زمین میلا آسمان'' اور ''بے سورج بستی'' ۱۹۹۶ء تک ملے۔جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ افسانے کی ہیئت، تکنیک اور فن سے بھی واقفیت رکھتی ہیں اور انہیں ان اصولوں کو برتنے کا بھی سلیقہ ہے۔اپریل ۱۹۹۶ء میں ان سے ملنے کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ وہ ایک نفیس، شستہ اور شائستہ خاتون ہیں اور اخلاقی اقدار کی پاسدار۔ان کا شعری مجموعہ پڑھنا شروع کیا تو ختم کیے بنا سو نہ سکا۔ان کی شاعری میں ان کی شناخت اور انفرادیت ہے۔ناقدین کے مطابق اچھی شاعری کی طرف پہلا قدم زمان ومکان کی وسعتیں ہیں۔گہری فکر، ذات سے کائنات کی طرف سفر ہے۔ان کی ان کثیر الجہتی میں اقبال کی شاعری کا عکس ہے۔مجھے ان کا کلام پڑھ کر نا قابل بیان مسرت ہوئی، اس لیے بھی کہ ان کا تعلق گورکھپور کے ایک اعلیٰ خاندان سے ہے اور وہ گزشتہ چار دہائیوں سے بال بچوں کے ساتھ برطانیہ میں مقیم ہیں۔

.....ڈاکٹر افغان اللہ خان

قیمت:۵۰۰ روپے، دستیابی: کاروانِ ملت پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

..... اردو ادب کے مختلف زاویے .....

اردو ادب کے مختلف زاویے میری ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو نامساعد حالات میں لکھے گئے ہیں۔لکھنے کا وقت تھا نہ ماحول۔۔۔لیکن یہ کوئی فطری مجبوری تھی جس نے ہمیشہ بے چین رکھا۔افسانے، ناول، تحقیق اور تنقید جو کچھ بھی لکھا اسی بے چینی کا شاخسانہ تھا۔کسی بھی تخلیق کے لیے یکسوئی اور علمی ماحول کے بجائے اگر باہر کی نفرت اور تعصب کے بارودی ماحول سے محفوظ رہنے کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس میں شائد وہ قوت پیدا نہیں ہوسکتی جو خداداد صلاحیتوں اور پُر امن علمی ماحول کی ہم آہنگی سے جنم لے سکتی ہے۔موضوع عام ہو یا خاص اہم بات یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی تحریر میں موضوع کے ساتھ کتنا Commited ہے۔کیونکہ یہی وہ سچائی ہے جو تحریر میں تاثیر اور اسلوب کی قوت بن کر سامنے آتی ہے۔

.....ڈاکٹر فردوس انور قاضی

قیمت:۶۰۰ روپے، دستیابی: الحمد پبلی کیشنز، لاہور۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۶،شمارہ:نومبر،دسمبر۲۰۱۷ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِ سالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1 ، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III ، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

روشنی کا آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقبال راہی ۵
بہاروں کی آرزو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶
گرینڈ مدر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۸
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۱
آنر کلنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۲۰
درویشنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عصمت بانو ۲۲
انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔صفیہ صدیقی ۲۴
کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔عدیم ہاشمی ۲۶
عورت، خوشبو اور نماز۔۔۔۔۔۔۔۔بشریٰ رحمٰن ۲۸
گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو۔۔۔۔۔۔شبنم شکیل ۳۱
آدھی چادر کے پورے رنگ۔۔۔۔۔حیدر قریشی ۳۳
رضیہ اسماعیل کی آدھی چادر۔۔۔۔۔۔سلمیٰ اعوان ۳۷
وصال کے موسم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۳۸
روشنی کا تعاقب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۴۲
اک خواب سہانا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۶
سرخ دروازہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کنگ وینکلس ۵۰

نقشِ کہن

محمد ہارون اکسیر، ڈاکٹر انیس الرحمٰن۔ ۵۳

افسانے

نادیدہ فصیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انل ٹھکّر ۵۴
ریٹائرمنٹ پلان۔۔۔۔۔۔۔شہناز خانم عابدی ۶۰
دروازے اور کھڑکیاں۔۔۔۔۔۔یوگیندر بہل تشنہ ۶۲
منزل بے نشاں۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عشرت ناہید ۶۵
بالجبر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نقشبند قمر نقوی بخاری ۶۸
وہی خدا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۰

جبر کی زنجیر

منظر ایوبی، محمود الحسن، عبداللہ جاوید، غالب عرفان، آصف ثاقب، شاہین، نسیم سحر، حسن عسکری کاظمی، ساغر ترپاٹھی، مناظر عاشق ہرگانوی۔ ۷۴

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۷۹

خاکہ

دل کے دریچوں کی مکیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۸۷

وصل اور ہجر

فرح کامران، مراق مرزا، احسان قادر، ملک زادہ جاوید، عارف شفیق، خورشید انور رضوی، ابراہیم عدیل، زیبا سعید، سبیلہ انعام صدیقی، نوید سروش، شگفتہ نازلی، قیصر ضیا قیصر، حبیب الرحمٰن، فیاض احسن، خالد راہی۔ ۹۰

حرف بولتے ہیں

اردو نوشت میں غیر اردو الفاظ۔۔۔۔۔۔حسن منظر ۹۵

زندگی نایاب ہے

ڈایالیسس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۱۰۱

ضربِ قلم

یونس شرر، شاہین، ڈاکٹر ریاض احمد، پرویز شہریار، شگفتہ نازلی، تسنیم کوثر، سیفی سرونجی، جاوید صدیق۔ ۱۰۴

آئینۂ فن

زندہ باد اے وطن۔۔۔۔۔۔۔۔مشاہد حسین ہاشمی ۱۰۸
قلبِ ماہیت کا اسرار۔۔۔۔پروفیسر آصف ہمایوں ۱۱۰

نشانِ راہ

وکرم صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر شمیم حنفی ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

ناصر حسین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار ۱۱۷

''روشنی کا آئینہ''

رضیہ اسماعیل ہیں مہماں ہماری دیکھنا
آئی برمنگھم سے ہے ان کی سواری دیکھنا

یہ جو موتی ٹانکتی ہیں گفتگو کے درمیاں
رقص کرنے لگتی ہے دل کی زمیں پر کہکشاں

فاصلوں کی حد میں رہتی ہیں صباحت کی طرح
جانتی ہیں کیسے پڑتی ہے محبت کی طرح

آگہی تقسیم کی ہے صورتِ بادِ صبا
سانس کی لہروں پہ جیسے روشنی کا آئینہ

گفتگو کرتی ہیں یہ لہجے میں مصری گھول کر
مطمئن ہوتا ہے قلب و ذہن ان سے بول کر

یہ سمجھتی ہیں رفیقِ زندگی کو زندگی
ظلم کو کہتی ہیں ظلمت، روشنی کو روشنی

ان کی حق گوئی پہ نازاں کیوں نہ ہوں اہلِ سخن
جگمگاتی ہیں وطن کا نام بیرونِ وطن

رضیہ اسماعیل سے ملنا ہوا مدت کے بعد
سیج پر آنکھوں کی اترا یہ دیا مدت کے بعد

اس دیئے کی روشنی سے راستہ ملتا رہے
کوئی بھی موسم ہو راہی یہ چمن کِھلتا رہے

اقبال راہی
(لاہور)

☆
☆☆
☆●☆
☆☆☆☆

قرطاسِ اعزاز

●☆●

رضیہ اسماعیل

●☆●

کے نام

☆☆☆☆
☆●☆
☆☆
☆

بہاروں کی آرزو

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

خاندانی نام : رضیہ خالدہ سلطانہ
قلمی نام : رضیہ اسماعیل
پیدائش : ۹رجون(۱۵ررمضان المبارک) بھروکی چیمہ(پاکستان)
برج : جوزا
اولاد : دوبیٹیاں
ثناء عائشہ اسماعیل
ڈاکٹر وردہ اسماعیل
شریکِ سفر : محمد اسماعیل اعظم

پہلی شعری کاوش:

۱۹۷۱ء سنٹرل گورنمنٹ گرلز کالج اسلام آباد کے انٹر کالجیٹ مشاعرے میں طرحی مصرع پر غزل لکھی جو بعد میں کالج میگزین میں شائع ہوئی۔

؎ آگئے پھر میری زنجیر ہلانے والے

پہلی نثری کاوش:

۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات میں افسانہ نویسی کے مقابلے میں انعام حاصل کیا

برطانیہ آمد:

۳ردسمبر۱۹۷۳ء

تعلیم وتربیت:

بی اے (آنرز) پنجاب یونیورسٹی لاہور
ایم اے انگلش کراچی یونیورسٹی
ایڈمنسٹریشن آکسفورڈ یونیورسٹی

ڈپلومہ

مانٹیسوری(Montessori) ٹیچنگ ڈپلومہ لندن
سوشل ورک ڈپلومہ برمنگھم
ایم اے سوشل ورک-واروک یونیورسٹی

ڈاکٹریٹ:

لندن یونیورسٹی-موضوعِ مقالہ ''خانگی تشدد کے بچوں پر اثرات''
(ہر امتحان امتیازی نمبروں اور اسکالرشپ کے ساتھ پاس کیا)

ملازمت/پیشہ وارانہ خدمات:

برٹش سول سروس
بی سی سی آئی بنک
ایوننگ میل نیوز پیپر (برمنگھم)
ایجوکیشن ویلفیئر سروس
سوشل سروسز برمنگھم
کمیونٹی والنٹری سروس
(ایڈوائزر اینڈ کنسلٹنٹ)
(فلاحی اداروں سے وابستگی اور رضا کارانہ خدمات)

آگہی:

پاکستانی خواتین کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی بانی اور تاحیات صدر
(تنظیم کی بنیاد ۱۹۹۷ء میں رکھی گئی)

ریڈیو:

نیوز ریڈر ریڈیو ایکس ایل (XL)
شائیر ریڈیو براڈ کاسٹر

دوسری سرگرمیاں:

ویمن ایڈ (Women Aid)
بلیک ویمن فورم (Balack Women Forum)
سال ہیتھ کمیونٹی فورم
اقبال اکیڈمی
نیشنل اکیڈمی آف برٹش رائٹرز
سردار میموریل ویلفیئر ٹرسٹ
برطانیہ میں بہترین کمیونٹی خدمات پر ملینیئم کمیشن کی تاحیات فیلوشپ

مشاغل:

کتب بینی ، قلم کی ناز برداریاں، دل چسپیاں مطالعہ فطرت، خود کلامیاں، سیر وسیاحت، فلم بینی اور خدمتِ خلق

پسندیدہ عالمی شخصیات:

ہیلن کیلر، ذوالفقار علی بھٹو، میلکم ایکس، شہزادی ڈایانا، نیلسن منڈیلا، عبدالستار ایدھی اور عمران خان۔

تخلیقی جہات:

غزل، نظم(پابند، آزاد، نثری)، ماہیے

کاوشات: دوہے، افسانہ، کہانی، مختصر ڈراما، کالم، رپورتاژ، انشاپردازی، طنز و مزاح اور سفر نامہ۔

شاعری:

گلابوں کوتم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں)............۲۰۰۰ء

سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں)......۲۰۰۰ء

میں عورت ہوں (نثری نظمیں+انگریزی ترجمہ) جون ۲۰۰۰ء

پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے) ۲۰۰۱ء

ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں دوہے)............۲۰۱۱ء

خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات)......۲۰۱۲ء

نثر:

چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح)................۲۰۰۰ء

کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں)......۲۰۱۲ء

کاغذی ہے پیرہن (افسانے)

ہم روحِ سفر (ایک منفرد سفرنامہ)

چشمِ آگہی (شخصیت اور فن)

تالیفات:

نذرانۂ عقدت......مجموعۂ درود شریف......۱۹۹۷ء

نیشنل ویمن ڈائریکٹری............۱۹۹۹ء

(برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز)...... بہ اہتمام ''آگہی''

رائٹ ٹریک (Write Track)......۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)

پوئٹری ٹائم (Poetry Time) ۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)

قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب)......۲۰۰۲ء

''آگہی'' ویب سائٹ کا اجراء ۱۹۹۹ء

www.aaghee.co.uk

رابطہ: ای میل: aaghee@hotmail.com

رضیہ اسماعیل کے کئی روپ

رضیہ اسماعیل کو میں ایک سوشل ورکر اور پھر حقوقِ نسواں کی جنگ لڑنے والی ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جنھوں نے خواتین کے لئے ۱۹۹۷ء میں ''آگہی'' نامی ایک تنظیم قائم کی۔ رضیہ اسماعیل نے قلیل وقت اور محدود وسائل کے باوجود برطانیہ بھر کی اہلِ قلم خواتین کو ایک گلدستہ میں کچھ اس طرح سجایا کہ ایک ''وومن ڈائریکٹری'' مرتب کرتے ہوئے خواتین کا مختصر تعارف، ادبی کاوشوں اور رابطے کے فون نمبر اور پتے اس میں شامل کر دیئے۔ اس ڈائریکٹری نے برطانیہ بھر کی اُردو کی اہلِ قلم خواتین کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

رضیہ اسماعیل نے ڈائریکٹری کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے سکولوں میں زیرِ تعلیم طالبات کے لئے ورکشاپس کا بندوبست کیا۔ ان ورکشاپس میں نامور شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا جو بچیوں کو شاعری کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں ادب تخلیق کرنے کے گُر سکھاتے رہے۔ پھر جوان خواتین کے تخلیقی کام کو جمع کر کے اُسے کتابی شکل میں شائع کروایا۔ رضیہ اسماعیل نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انھیں اپنانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ نئے دور کی اہم ضرورت کمپیوٹر اور ویب سائٹ ہے۔ رضیہ اسماعیل نے www.aaghee.co.uk کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی تیار کروائی ہے جس میں چالیس خواتین کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسروں کے لئے کام کرنے والی رضیہ اسماعیل غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ شاعری اور نثر نگاری کا نہ صرف غم پالتی ہیں بلکہ اب تک ان کی چھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری کی کتابوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی ایک نثری کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' بھی شائع ہوئی ہے۔ رضیہ اسماعیل نے شاعری، نثر نگاری اور خواتین کی سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ اپنے گلشن، اپنے گھر کو بھی معطر کیا ہوا ہے۔ اور گھر میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس کے آنگن میں بیٹھ کر انھیں ''چاند میں چڑیلیں'' بھی نظر آتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول بھی۔

میں تو اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ کہ اپنے لئے تو ہر کوئی کام کرتا ہے، دوسروں کے لئے کام کرنے والے لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ رضیہ اسماعیل بھی اپنی ذات کی بجائے دوسروں کے کام کرتی ہیں اور بلاشبہ ایک عظیم خاتون ہیں۔ برطانیہ میں جب بھی مؤرخ اُردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو رضیہ اسماعیل، جو اَب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہیں، کے کام سے چشم پوشی کی گئی تو وہ تاریخ ادھوری ہی رہے گی۔

یعقوب نظامی

(خاکہ)

گرینڈ مدر

رضیہ اسماعیل

انسانوں کی تو کئی قسمیں ہوسکتی ہیں مگر ہمارے خیال میں بزرگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ایک وہ بزرگ جو اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے وہ جو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔

ہماری نانی امّاں یعنی گرینڈ مدر کا تعلق بزرگوں کے اول الذکر قبیلے سے تھا۔ نانی امّاں کو اگر بزرگوں کے اس قبیلے کی چیف کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔نانی امّاں نے مدرسہ تو دور کی بات ہے زندگی میں کبھی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی مگر وہ زندگی کے فلسفے کو کتابیں چاٹنے والوں سے بہت بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ وہ زبردستی دوسروں کو اپنا فلسفہ حیات سمجھانے کے لیے مثبت اور منفی دونوں طریقے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتیں۔

ہم نانی کی اس ہٹلر جیسی عادت سے تنگ آ کر نانی کی بجائے انہیں گرینڈ مدر کہا کرتے تھے۔نانی کو اس لفظ سے بہت چڑ تھی۔ان کے خیال میں اس انگریزی نام سے ان کا اسلامی تشخص خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نانی خود ہمارے لیے زندگی بھر خطرے کی گھنٹی بنی رہیں۔

نانی کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے۔مگر جب ہمیں نانی سے اور نانی کو ہم سے آشنائی ہوئی تو وہ یقیناً زندگی کے گلشن سے اسی پھول نوچ چکی تھیں۔تمام گلشن کا قریب قریب صفایا کرنے کے باوجود نانی بہت تازہ دم تھیں۔نانی کے رعب، دبدبہ اور گرجدار آواز سے اچھوں اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا۔ایسے میں اگر ہماری نحیف ونزار ٹانگیں صرف کانپنے کا فریضہ سرانجام دیتی تھیں تو اس پر نہ ہمیں اس وقت حیرت تھی اور نہ ہی اب ہے۔

اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔ جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتیں۔مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ہی ان سے کھا سکتیں۔کانوں میں آلہ سماعت ہوتا جسے ہم جب جی چاہتا غائب کر دیتے۔ ہماری بچپن کی ان بے تکی خواہشات کے باوجود نانی کی تمام سمعی اور بصری قوتیں پوری طرح بیدار تھیں جس کی وجہ سے ہم بچپن میں کبھی بھی ٹھیک سے خواب خرگوش کے مزے نہ لے سکے۔

اپنی اکلوتی نانی کے اس قدر صحت مند ہونے کا شکوہ ہم اکثر اللہ میاں اور کبھی کبھی اپنی والدہ سے بھی کیا کرتے۔ جو صرف مسکرا کر رہ جاتیں۔نانی کی قابل رشک صحت کی بدولت ہم بچپن میں کبھی صحت مند نہ ہو سکے۔جس کی وجہ سے نانی ہم سے اور بھی نالاں رہتیں۔نانی شاید یہ نہیں جانتی تھیں کہ برگد کے اس تنومند درخت کی شاخوں میں سے روشنی کی کوئی کرن اس کے سائے میں اگنے والے نرم ونازک پودوں تک اگر پہنچ سکتی تو تب کوئی بات بنتی۔

ویسے اس عمر میں نانی کی قابلِ رشک صحت ان کے لیے تو عطیہ خداوندی تھی مگر نانی پر اللہ کے انعام واکرام کی یہ برکھا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔نانی کے بیمار پڑنے کی خواہش حسرت میں بدل جاتی اور اس انکل پچو سی خواہش کی پاداش میں الٹا ہم بستر پکڑ لیتے۔

ہمارے خیال میں نانی اور اللہ میاں کے درمیان مواصلاتی رابطہ بہت زبردست تھا۔یہ سیٹلائٹ کبھی بھی خراب نہ ہوتی۔اسی لیے تو نانی کی دعائیں تھوک کے حساب سے شرف قبولیت پاتیں جبکہ ہماری کوئی دعا قبول ہی نہ ہوتی۔

نانی نے اپنی صحت کی مکمل ذمہ داری تو اللہ میاں پہ چھوڑ رکھی تھی مگر ہماری ننھی منی سی صحت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لادے لادے پھرتیں۔ محلے میں سو طرح کی کھٹی میٹھی چیزیں بیچنے والے وارد ہوتے مگر کیا مجال کہ نانی انہیں کبھی گھر کی دہلیز پر رکنے دیں۔نانی کے خیال میں یہ تھرڈ ریٹ قسم کی چیزیں کھا کر ہم بچپن میں ہی انہیں داغ مفارقت دے سکتے تھے۔

نانی کی چیرہ دستیاں اگر یہیں تک رہتیں تو خیریت تھی مگر وہ تو ہماری پرائیویٹ لائف میں بھی دندناتی ہوئی آتیں اور ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دیتیں۔ کتنی بھی آہستگی سے باتیں کرتے، وہ ضرور سن لیتیں۔ہمیں پورا یقین تھا کہ یا تو نانی کے پاس جن تھے یا پھر وہ لپ ریڈنگ کی ماہر تھیں۔کبھی کبھی تو وہ چہرے کے مختلف زاویوں سے ہی اندازہ لگا لیتیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

ہم جہاز جیسے گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے، نانی ہمیں سرچ لائٹ سے ڈھونڈتی ہوئی حاضر ہو جاتیں۔نانی کی اس کھوجیوں والی عادت سے ہم بہت الرجک تھے۔کبھی کبھی تو وہ موقع واردات پہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر اپنی مرضی کی ایف۔آئی۔آر لکھواتیں اور کڑی سے کڑی سزا نہ صرف خود دیتیں بلکہ امّاں کو بھی ورغلاتیں۔

اس زمانے میں ہماری اولین خواہش یہی تھی کہ اے کاش ہماری نانی کے ہاتھوں میں اور کچھ نہیں تو ایک عدد لاٹھی ہی ہوتی۔جیسے ہی ان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہم خبردار ہو جاتے۔ان حالات میں نانی کے آنے کی پیشگی اطلاع ملنا ناممکنات میں سے تھا۔اسی لیے وہ چراغ کے جن کی طرح ہمارے چراغ کو رگڑنے کے بغیر ہی حاضر ہو جاتیں۔اور ہم الٰہ دین کو کوسنے دیتے رہ جاتے۔

نانی کے اسی مستقل مارشل لاء دور کے دوران ہم نے بچپن کو خیر باد کہہ کر جوانی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑا۔ یہ بھی ہمیں نانی سے ہی معلوم ہوا کہ ہم خیر سے جوان ہو گئے ہیں۔کلی سے پھول بن گئے ہیں۔نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ

خوشبو کو قید کر لیتیں۔ اس لیے انہوں نے ہمیں ہی قفس میں ڈالنے پر اکتفا کیا۔ اگر ہم جانتے کہ دورِ جوانی اس قدر دردناک ہوگا تو ہم ہمیشہ بچے ہی رہتے۔

نانی کی چوکیداری بے مثل تھی۔ کیا مجال کہ چڑیا بھی پر مار جائے۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے تھے۔ صدر دروازے پر ہمیشہ بڑا تالا منہ چڑاتا رہتا اور یہ دروازہ دن کے صرف خاص اوقات ہی میں کھلتا۔ گھر میں عام ٹریفک کے لیے صرف ڈیوڑھی کا راستہ بچتا تھا جہاں تخت پوش پر گاؤ تکیہ لگائے نانی اپنا پھن پھیلائے بیٹھی رہتیں۔ گلی میں سے گزرنے والوں پہ وہ خاص نظر رکھتیں۔ محلے میں تقریباً سبھی گھر عزیزوں، رشتہ داروں کے تھے۔ جہاں کوئی نیا چوکھٹا نظر آتا نانی فکر مند ہو جاتیں اور اگر نوارد کوئی نوجوان ہوتا تو نانی کی تشویش دوچند ہو جاتی۔

نوجوان لڑکیوں کو ڈیوڑھی میں بیٹھنے کی سخت ممانعت تھی۔ البتہ اگر کبھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو آواز دے کر بلاتیں اور پاس بٹھاتیں۔ نانی کا یہ متضاد قسم کا رویہ ہمیں بے حد کنفیوز رکھتا۔ مگر جیسے ہی ہم ڈیوڑھی میں قدم رکھتے نانی چق گرا دیتیں۔ ان کے خیال میں بچیوں کو نظر لگنے کا اندیشہ تھا۔ ہم نانی کی خوش فہمی کی داد دیئے بنا نہ رہتے۔ بھلا ان کی موجودگی میں نظر کی کیا مجال کہ ہمیں لگ جاتی۔ ہم نانی کی چوکیداری سے اتنے بیزار تھے کہ الٹا نظر کے گلے پڑ جاتے۔

ہماری سہیلیوں کے ساتھ نانی کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ ہمارے لیے نامحرم ہوں۔ سکول کے علاوہ سہیلیوں سے ملنا جلنا منع تھا۔ صرف مسکین قسم کی سہیلیوں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت تھی لیکن اس سے پہلے نانی ان کا پورا شجرہ ازبر کرتیں۔ پسند آتا تو راہداری دیتیں نہیں تو ڈیوڑھی سے ہی واپس کر دیتیں۔

تیز طرار قسم کی سہیلیاں نانی کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی لڑکیاں ایڈونچر کی تلاش میں ہوتی ہیں اور ان کی صحبت ہمارے لیے زہر قاتل تھی۔

جن سہیلیوں کے جوان بھائی ہوتے وہ بھی ہمارے ہاں آنے سے ڈس کوالیفائی ہو جاتیں۔ نانی کے خیال میں جوان بھائیوں والی سہیلیاں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

سہیلیوں کے ساتھ ساتھ نانی ٹیلی ویژن سے بھی سخت بیزار تھیں۔ اس زمانے میں ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے نانی صدر ایوب کے سخت خلاف تھیں کہ یہ شیطانی چرخہ ملک میں کیوں داخل ہونے دیا۔ جس کمرے میں ٹی وی تھا نانی وہاں قدم نہ رکھتیں۔ نانی اگر آج زندہ ہوتیں تو ٹی وی کی حالت زار دیکھ کر اپنی این جی اُو رجسٹر کرواتیں۔ احتجاجی جلوس منظم کرتیں اور اسے انسانی حقوق کا مسئلہ بنا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتیں۔

ہمارے خیال میں نانی اگر ٹی وی اور ہماری سہیلیوں کے معاملے میں ہاتھ نرم رکھتیں تو ان کے بارے میں ہماری رائے اتنے کنفیوژن کا شکار نہ ہوتی۔

لیکن ہماری باتوں سے آپ ہماری نانی کے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کریں۔ جہاں نانی میں تھوڑی بہت بشری کمزوریاں تھیں وہیں ان میں بے شمار خوبیاں بھی تھیں۔ ان کی سب سے اچھی خوبی تو یہ تھی کہ وہ کہانیاں بہت اچھی سناتیں۔ نانی کی خود ساختہ کہانیاں کسی فسانہ عجائب سے کم نہ تھیں۔ جب جی چاہتا کہانی کو نیا موڑ دے کر ایک نئی کہانی شروع کر دیتیں۔ کہانی کا انجام معلوم کرنے کے لیے ہم نانی کے رحم و کرم پر تھے۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ خوب فائدہ اٹھاتیں۔ جب کبھی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو ہم نانی سے ناراض ہو جاتے۔ ہنستے ہوئے کہتیں دیکھو چاند میں رہنے والی پریاں تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ اچھے بچے ناراض نہیں ہوتے۔ ہم جل کر جواب دیتے نانی چاند میں پریاں نہیں رہتیں بلکہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں جو ہماری سب باتوں کی رپورٹ تمہیں دیتی رہتی ہیں۔ ہم چاند کو دیکھنے سے بالکل انکار کر دیتے۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کا نانی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر چاند کی طرف اچھال دیتیں۔ گویا چڑیلوں کو بھگا رہی ہوں۔

نانی کے چند معمولات زندگی بھر قائم رہے۔ مثلاً کہانی سنانا، مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، صدقہ خیرات اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

مہمانوں کو دیکھ کر یوں خوش ہوتیں جیسے بچے رنگ برنگے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ مہمانوں کی بے وقت آمد سے ہماری کہانی میں جو خلل واقع ہوتا وہ ہم سے برداشت نہ ہوتا۔ ہم شکایت کرتے تو ہنس کر کہتیں یہ ہمارے نہیں اللہ کے مہمان ہیں۔ یہ بات ہماری نوخیز عقل میں نہیں سماتی تھی اور ہم منہ بسور کر کہتے اگر اللہ کے مہمان ہیں تو اللہ کے پاس جائیں یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔

اللہ کے مہمانوں کا ناشتہ بڑا شاندار ہوتا۔ دیسی سویاں اور انڈوں کا حلوہ ان موقعوں پر بہت اہتمام سے تیار ہوتا۔ خالص دیسی گھی جو ہمیشہ اسٹور میں تالے میں پڑا رہتا اس دن قفس سے آزاد ہوتا۔ مہمانوں سے محبت کا نقطہ عروج دیسی گھی ہی ہوتا۔ اس زمانے میں ڈالڈہ گھی نیا نیا نکلا تھا۔ نانی اس کی سو سو برائیاں کرتیں۔ بناسپتی گھی کی برائیاں سن سن کر ہمیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے کھانے والے سب لولے لنگڑے ہو جائیں گے۔ ڈالڈے کا ڈبہ دیکھ کر نانی جھٹ گھونگھٹ نکال لیتیں جیسے کسی نامحرم کو دیکھ لیا ہو۔

صدقہ خیرات دل کھول کر کرتیں۔ فقیروں کا بہت بے چینی سے انتظار کرتیں۔ جیسے ہی کوئی فقیر گلی میں صدا لگاتا، کسی نہ کسی کو دوڑاتیں کہ اسے پکڑو۔ فقیر اگر تیز رفتار ہوتا اور گھر کے دروازے سے آگے نکل جاتا تو نانی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ خیرات دینے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب خبر لیتیں کہ بھیک مانگنے نکلے ہو یا اولمپک ریس میں حصہ لینے۔ فقیر ہو تو فقیر بن کر رہو۔ اللہ کے نام پر سوال کرتے ہو اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی چل پڑتے ہو۔ ہمیں اس سے شرمندہ کراؤ گے کہ اس کے نام پر کسی نے کچھ مانگا اور ہم دے نہ سکے۔

صحت مند فقیر کو دیکھ کر نانی کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ کہتیں ہٹا کٹا مشٹنڈا بھیک مانگتا ہے۔ کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتا۔ ایسی سرزنش کرتیں کہ وہ فقیر دوبارہ ہماری گلی کا رخ نہ کرتا بلکہ شہر کے دوسرے صحت مند فقیروں کو بھی خبردار کر دیتا کہ فلاں محلے میں مت جاؤ۔ وہاں احتساب ہوتا ہے۔ ذرا دبو قسم کے فقیر تو

''چہارسُو''

خاموشی سے چلے جاتے۔ مگر دل گردے والے نانی سے الجھ پڑتے اور کہتے اماں اگر کچھ دینا ہے تو دو ہماری صحت کو نظر کیوں لگاتی ہو۔ ایسے گستاخ فقیر کو نانی تھانے میں رپورٹ کرانے کی دھمکی دیتیں جس پر کبھی عمل نہ ہوا۔

نانی کے اس سکندرانہ سلوک کی وجہ سے صرف مریل قسم کے فقیر ہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے۔ ہر جمعرات کو اپنے بزرگوں کا ختم پڑھ کر بہت بے تابی سے فقیروں کا انتظار کرتیں۔ اگر فقیر لیٹ ہو جاتے تو انہیں باقاعدہ ڈانٹ پڑتی۔ سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتیں، پانی پلاتیں اور پھر یوں بھگا دیتیں جیسے وہ بغیر اجازت ڈیوڑھی میں گھس آئے ہوں۔

نانی کے برعکس نانا بہت کم گو تھے۔ نانی کی ساری سرگرمیوں سے لاتعلق اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے۔ نانی کو ان کی خاموشی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جان بوجھ کر وقفے وقفے سے اس پرسکون تالاب میں کنکریاں پھینکتی رہتیں۔ نئی نئی ترکیبیں سوچ کر نانا پر حملہ آور ہوتیں مگر نانا بھی ان کے حملوں سے بچنا خوب جانتے تھے۔

نانی کے مقابلے میں نانا بہت پڑھے لکھے تھے۔ اردو، عربی اور فارسی پر انہیں مکمل عبور تھا۔ ہیروں کے کاروبار میں دنیا گھوم چکے تھے۔ اس عمر میں زیادہ وقت موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔ ان کتابوں کو نانی زندگی بھر اپنی سوت ہی سمجھتی رہیں۔

نانی تو قبول صورت ہی تھیں مگر نانا اس عمر میں بھی یونانی دیوتا لگتے۔ اٹھی ہوئی راجپوتی ناک، کشادہ پیشانی، ذہین آنکھیں، سرخ و سپید رنگت۔ نانا اگر خوش شکل اور پڑھے لکھے تھے تو نانی کو اپنے اونچے نمبردار گھرانے کا بڑا مان تھا۔ بات بات پر بابل کے گھر کے ست رنگے کبوتروں کا ذکر کرتیں اور آبدیدہ ہو جاتیں۔

جب کبھی نانا چپ شاہ کا روزہ توڑتے اس دن بہت گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی۔ ایک ہی کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر لڑتے۔ بہت سے خاندانی حالات ہمیں ان معرکوں کے دوران ہی معلوم ہوئے۔ نانی لڑتے لڑتے تھک جاتیں تو پانی پی کر لیٹ جاتیں۔ ہم سمجھتے کہ سیز فائر ہو گیا مگر نانی تازہ دم ہو کر پھر گولہ باری شروع کر دیتیں۔ نانی کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ نانا نے آج تک اپنے دل کی گھنڈی نہیں کھولی تھی۔ ہم سمجھتے کہ گھنڈی کوئی چھوٹی موٹی کھڑکی ہوگی جو آج تک نہ کھل سکی۔ یہ دروازہ تو ہرگز نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اگر نانا کے دل کا دروازہ بند ہو جاتا تو نانی پر ان کے گھر کا دروازہ کیسے کھلتا۔

جس دن یہ گھمسان کا رن پڑتا، ہماری کہانی گول ہو جاتی۔ اس دن ہم نانی کے کہے بغیر ہی چاند میں پریاں تلاش کرنے لگ جاتے مگر ہمیں وہاں ہشاش بشاش چڑیلوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ جو ہماری کہانی گول ہونے کی خوشی میں جشن منا رہی ہوتیں۔

خالہ جو ساتھ والے گھر میں رہتی تھیں، اس معرکہ آرائی کے دوران یو۔ این۔ او بن کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتیں تو نانی کی گولہ باری کی زد میں آ جاتیں۔ نانی کو یو۔ این۔ او کی طرح خالہ کے کردار پر بھی شک رہتا۔ ان کے خیال میں وہ نانا کی طرفداری کرتی تھیں ایسے میں وہ خالہ کی ثالثی کو پوری حقارت سے ٹھکرا دیتیں اور انہیں اپنے ہاں آنے سے بھی منع کر دیتیں مگر شام ہوتے ہی خالہ کو آوازیں دینے لگے جاتیں اور نانا کی سائیڈ لینے پر انہیں برا بھلا بھی کہتی رہتیں۔ نانی کا واویلا سن کر نانا صرف مسکرا کر رہ جاتے۔

نانی ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے بیٹوں سے ملنے داتا کی نگری ضرور جاتیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ یہ سرکاری دورہ اکثر لڑائی کے فوراً بعد ہی پلان ہوتا۔ سفر کی تیاری بہت زور شور سے ہوتی۔ ایک دن پہلے ہی اسٹیشن جا کر قلی بک کروا کر آتیں۔ تانگہ استعمال کرنا فضول خرچی سمجھتیں۔ خوب اہتمام سے غسل ہوتا۔ کہتیں سفر پر انسان کو پاک صاف ہو کر جانا چاہیے۔ کیا پتہ یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ اٹھ اٹھ کر رات بھر گھڑی دیکھتی رہتیں کہ کہیں ''بابو ٹرین'' نہ نکل جائے۔ بابو ٹرین کے علاوہ کسی دوسری ٹرین کو زندگی بھر گھاس نہ ڈالی۔ صبح چار بجے ہی دیسی گھی کے پراٹھے تلے جاتے۔ گھی کی مہک سے سارا گھر جاگ اٹھتا۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے نانی کے پاس رسوئی میں آ بیٹھتے مگر کیا مجال جو پراٹھا ہمیں دے جاتیں۔ نانی کی بھی عجیب منطق تھی۔ کہتیں یہ سفر کا کھانا ہے۔ صرف مسافر کھا سکتے ہیں۔ دو گھنٹے کے سفر میں ساتھ لے جائے جانے والے پراٹھوں کی تعداد دیکھ کر لگتا کہ یہ ساری ٹرین کا ناشتہ ہے جیسے ہی گاڑی اسٹیشن چھوڑتی، پراٹھوں کی پوٹلی کھل جاتی۔ نہ صرف خود مزے لے لے کر کھاتیں بلکہ پاس بیٹھے ہوؤں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کھانے پر مجبور کرتیں۔ یہ سفرنامہ ہم اس لیے لکھ رہے ہیں کہ ہم نانی کے ایک سفر کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے نانی کی ہمراہی سے توبہ کر لی۔

نانی کی پسندیدہ ہابی خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے تلاش کرنا تھی۔ آپ ہی آپ جوڑ ملاتی رہتیں۔ نانی کے طے کیے ہوئے رشتے کو رد کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ لیکن دونوں فریقوں کی رضامندی کے باوجود بھی اگر بیل منڈھے نہ چڑھتی تو اللہ کی مرضی کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکیوں کی رضامندی معلوم کرنا شان کے خلاف سمجھتیں۔ جہاں کسی لڑکے لڑکی کو آپس میں بات کرتے دیکھا، ان کا تخیل لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اسے رضامندی ہی سمجھ لیتیں۔

البتہ خاندان سے باہر آنے والے رشتوں کو بیک جنبش قلم رد کر دیتیں ان کے خیال میں انسانی نسلیں اسی طرح زوال پذیر ہوئی ہیں۔ خالص خون کی اصطلاح بہت شد و مد سے استعمال کرتیں، جو کبھی ہمارے پلے نہ پڑی۔ غرضیکہ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خاندان کے سبھی لڑکے لڑکیوں کی ایک ہی دن میں اجتماعی شادی کروا کر نگرانی کی مشقت سے بچ جاتیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ نانی کھلی کتاب تھیں۔ اندر باہر سے ایک مگر نانی نے ہم سے زندگی بھر ایک بات چھپائے رکھی یا شاید بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس دن نانی کا انتقال ہوا یہ خبر ہم پر ایٹم بم بن کر گری کہ وہ ہماری نانی نہیں بلکہ پرنانی تھیں۔ یعنی گریٹ گرینڈ مدر۔ سچ پوچھئے تو ہمیں زندگی میں پہلی بار خاموش لیٹی ہوئی نانی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

براہِ راست

سمندر پار اردو زبان و ادب سے منسوب اپنی بقا کی جنگ لڑنے والوں میں **محترمہ رضیہ اسماعیل** کا نام سرِفہرست نہ سہی مگر تن من دھن سے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کرنے والوں میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔کون سی صنف ہے جس میں **محترمہ رضیہ اسماعیل** نے اپنے قلم کی جولانی دکھلا کر گفتگو کے نئے دَر وا نہ کیے ہوں اور گفتگو بھی ایسی جس نے ہمیشہ صحت مند روایات کو پروان چڑھانے میں نیا رنگ اور نکتہ آفرینی کو دعوت دی ہے۔

آج کی نشست میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ **محترمہ رضیہ اسماعیل** کے فنی اسلوب اور شخصی کمالات کو نئے ڈھنگ اور نئے طریقے سے پیش کر کے اردو ادب بالخصوص سمندر پار کے اہلِ قلم کو یہ پیغام دیا جائے:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

گلزار جاوید

☆ ؎ چلتے ہو تو لاہور کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے

مذکورہ بالا مصرعہ بچپن کے سنہری ایّام اور نوجوانی کی روپہلی رُتوں کے بیان کا طالب ہے؟

☆☆ اگر آپ کا اصرار ہے تو ضرور لاہور چلتے ہیں مگر بہار کے کھلتے ہوئے پھول، ہرے پات اور کم کم بادوباراں کی کیفیت کچھ لاہور تک ہی محدود نہیں ہے میرے لیے یہ بہاراں لاہور کے علاوہ اور کئی جگہوں سے منسوب ہیں۔

بچپن کے ایام ضرور سنہری تھے مگر اس میں ہجرتوں اور جدائیوں کے دکھ بھی شامل ہیں۔نوجوانی کی روپہلی رتوں کا تو پتہ نہیں کیونکہ زندگی میرے لیے تصور کی آنکھ کھولتے ہی ذہنی جذباتی اور روحانی طور پر ایک جہدِ مسلسل میں رہی۔ قدرت نے ایک حسّاس دل اور سوچنے والا ذہن عطا کر دیا تھا اس لیے آگہی کا آشوب بہت جلد ہی مجھ پر اتر آیا جس نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ناانصافیوں اور بدصورتیوں سے بہت کم عمری میں ہی آگاہی دے دی تھی۔اس لیے اضطراب اور بے چینی نوجوانی کا خاصہ رہے اور اب بھی ہیں۔۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت آباؤاجداد مشرقی پنجاب (جالندھر) سے ہجرت کر کے لاہور میں پناہ گزیں ہوئے۔کچھ قریبی عزیز قیام پاکستان سے قبل ہی لاہور، گوجرانوالہ اور وزیرآباد میں رہائش پذیر تھے اس لیے ان کے قریب ہی والدین نے پڑاؤ ڈالا۔

والد طب کے پیشے سے منسلک تھے کچھ عرصہ تو اولاً لاہور میں رہے پھر جب زمینوں کی الاٹمنٹ ہوئی تو قیام وزیرآباد (جہاں میری ننھیال تھی) اور قریبی قصبے ''بھروکی چیمہ'' میں اختیار کیا، میری پیدائش اسی قصبے میں ہوئی۔مجھ سے دو بڑی بہنیں ہیں (جو برطانیہ میں آباد ہیں) اور پانچ چھوٹے بھائی ہیں (ایک بھائی ناصر کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) بھائی اب برطانیہ، امریکہ، سعودیہ اور چین میں قیام پذیر ہیں۔والد کا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہو گیا۔اتنا طویل عرصہ انہیں گذرے ہوئے ہو چکا ہے کہ اب تو وہ ایک گماں کی طرح لگتے ہیں کہ آیا وہ حقیقت تھے یا خواب!!!(میری نظمیں ''سورج کی موت'' اور ''پناہ گاہ'' میری اس سوچ کی عکاس ہیں)۔والدہ بے حد ضعیف ہو چکی ہیں بس ان کی دیکھ بھال عبادت سمجھ کر کرتی ہوں۔جب دعائیں دیتے ہوئے کہتی ہیں تمہارے لیے تو ساتوں جنتیں ہیں۔تم جیسی بیٹیاں تو روزانہ پیدا ہوں۔تو میری آنکھوں میں آنسو اتر آتے ہیں بس یہی میری متاعِ حیات ہے۔

میرا تعلق ایک روایتی راجپوت گھرانے سے ہے جہاں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم معیوب سمجھی جاتی تھی۔بس گھر پر ہی اتنی تعلیم دے دی جاتی جو خط لکھنے اور پڑھنے کی حد تک تھی مگر میرے ذہن نے ان پابندیوں کو قبول نہ کیا۔لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ذہین تھی چھوٹی عمر میں ہی بڑے بڑے سوال کرنے شروع کر دیے۔ڈانٹ بھی پڑ جایا کرتی تھی (میرا افسانہ ''ہرنام داس'' اس کی عمدہ مثال ہے) اس افسانے میں میرا بچپن ہے۔وہ گھر ہے جس میں میں نے شعور کی آنکھ کھولی۔بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا، شرارتیں کرنا، ستارے گننا، پھول چُننا اور تتلیاں پکڑنا سیکھا۔

گو کہ میں پاکستان کے دیگر شہروں سکھر، لاہور، کراچی، اسلام آباد میں بھی بغرضِ تعلیم رہی مگر میرا حوالہ ہمیشہ میرا گاؤں ہی ہوتا ہے اس سے جو جذباتی اور روحانی تعلق قائم ہوا آج تک برقرار رہا (میری نظم ''گاؤں کی گلیاں'' ملاحظہ کریں) ذہن کی تختی پر جو اولین تصاویر ثبت ہوئیں ان کا اظہار تحریر میں بھی ہوتا رہتا ہے مثلاً دو ماہیے ملاحظہ کیجیے۔

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

یا پھر

کھیتوں میں کھلی سرسوں
اس ہرجائی نے
نہیں یاد کیا برسوں

گاؤں میں لڑکیوں کا ایک اسکول تھا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ہر چوتھے دن اس کی جگہ تبدیل ہوتی رہتی تھی یا پھر ٹیچر کی رہائش کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے سبب سکول بند رہتا تھا۔اس لیے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے والد نے

اپنی حویلی کی بالائی منزل میں سکول کو جگہ دی جبکہ ٹیچر ہمارے گھر پر ہی رہا کرتی تھی تو میری ابتدائی تعلیم اس ماحول میں ہوئی۔ خاندانی روایت کے برعکس والد اور والدہ دونوں تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھے والد تو ۱۹۶۳ء میں برطانیہ آ گئے اور ہم ننھیال اور دادھیال کے پاس رہے۔ پہلے دینی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی کیونکہ کوئی رشتہ دار بھی میرے تعلیم کے حق میں نہ تھا بس سب چاہتے تھے کہ آنکھ جھپکتے ہی میری شادی ہو جائے جبکہ میں نے سخت مخالفت کی۔ ہر امتحان امتیازی حیثیت اور سکالرشپ کیساتھ پاس کیا اس لیے کسی کو میری تعلیم کی مخالفت کرنے کا ٹھوس جواز نہ ملتا تھا۔ یوں میں نے روایت سے بغاوت کی اور اپنی فیملی کی پہلی ''گریجویٹ'' خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور آئندہ نسلوں میں بھی بچیوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی اب ماشاءاللہ خاندان کی ہر بچی یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرتی ہے۔ میری اپنی دونوں بیٹیاں چائلڈ اسپیشلسٹ اور ڈاکٹر ہیں۔

میں والد سے بہت قریب تھی۔ ابا کی ناک کا بال سمجھو۔ کہتے تھے یہ میری بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ بہنوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ سنا ہے جب میں پیدا ہوئی تو لوگ ہمارے گھر افسوس کرنے آتے تھے کہ تیسری بیٹی پیدا ہوگئی ہے (اس سے زیادہ عورت ذات کی تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے اس سلسلے میں میری نظم ''تیسری اولاد'' ملاحظہ کریں)

مگر میرے والد نے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ میں والد سے بہت قریب تھی۔ مجھے بہت چاہتے تھے میرے بعد پانچ بھائی پیدا ہوئے کہتے تھے یہ بڑی خوش قسمت ہے بھائیوں کا بازو پکڑ کر لائی ہے۔ میں والد کی بہت لاڈلی اور منہ چڑھی تھی (اس سلسلے میں میری بڑی بہن کا ایک مضمون ''درویشنی'' ملاحظہ کریں جو میرے بچپن کے حالات کی عکاسی کرتا ہے)۔ میرے والد ۱۹۶۳ء میں برطانیہ آ گئے تو یوں لگا جیسے ٹائم فریم فریز ہو کر رہ گیا ہو۔ ماہ و سال کی گردش رک گئی ہو۔ ایک دس سالہ بچی آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جلائے آج بھی گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر کھڑی اپنے باپ کی واپسی کی منتظر ہے کہ ایسے ہی لمحے میرا قلم اشکبار ہو گیا تھا۔

وہ سائبان کی مانند رہے میرے سر پر
اٹھا تو دھوپ کے نیزے اتر گئے تن میں

☆ یادوں کے جھروکوں سے اُن لمحات کو آواز دیجیے جب آپ کی انگلیوں نے تخلیقی قلم کا لمس پہلی بار محسوس کیا؟

☆☆ تخلیق کا لمس میرے ذہن کی انگلیوں نے غالباً شعور کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ کوئی تخلیقی چیز بچپن میں کب لکھی۔ البتہ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ نصاب سے باہر بھی جو کتاب ہاتھ لگ جاتی چاٹ لیتی تھی یہاں تک کہ ردی کاغذات بھی میری نظر سے خال ہی بچ کر نکلتے تھے۔

کتب بینی کا شوق اب بھی برقرار ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں بہت سی نادر کتب موجود ہیں۔ جب بھی پاکستان آتی ہوں ہزاروں روپے کتابوں پر خرچ کر دیتی ہوں۔ عورتیں عام طور پر زیور، کپڑے خریدتی ہیں جبکہ میں کتابوں کی دکانوں پر پھرتی رہتی ہوں۔

☆ افرادِ خانہ، دوست احباب بالخصوص والدین کا ردِعمل کس نوعیت کا تھا اور وجود میں آنے والی تخلیق کس صنف کے جامے میں ملفوف تھی؟

☆☆ ۱۹۷۱ء میں جب میں گورنمنٹ گرلز کالج اسلام آباد میں انٹر کی طالبہ تھی تو انٹر کالجیٹ مشاعرے کے لیے ایک طرحی مصرع پر پہلی غزل لکھی تھی جو بعد میں کالج میگزین میں شائع ہوئی۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

آ گئے پھر میری زنجیر ہلانے والے
کر کے مدہوش وہ چلمن کو گرانے والے
اجڑا اجڑا سا یہ میخانہ تو یوں لگتا ہے
سو گئے سب ہی مجھے آج پلانے والے
کھو گیا پیار میرا گم ہوئی منزل میری
آ بھی جاؤ کبھی تم مجھ رُلانے والے

بعد میں ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات میں (جہاں میں نے ایک سال پڑھا) افسانہ نویسی کے مقابلے میں اول انعام حاصل کیا۔ یوں نثری اور شعری تخلیقات کی آمد ایک جیسی توانائی کے ساتھ ہوئی۔ اس وقت تو اپنی تحاریر فیملی کے ساتھ بالکل بھی شیئر نہیں کیں۔

☆ ابتدا میں تخلیقات کی اشاعت کے لیے کس طرح کی مشکلات کا سامنا رہا؟

☆☆ تخلیقات کی اشاعت کی باری تو بہت دیر میں آئی بلکہ ۱۹۷۳ء میں برطانیہ آ گئی۔ جیسے ہی گریجویشن کیا نیا ملک، نئی جگہ، نئی تہذیب و ثقافت گویا ایک نیا جنم ہوا۔ بہت عرصہ کچھ نہیں لکھا بس مشاہدے میں گزارا یا انگریزی ادب پڑھتی رہی۔ ۱۹۹۲ء میں مجھے بہت زبردست ڈپریشن ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے اندر الفاظ مروج ہیں۔ ایسے میں مجھے قلم، کاغذ اور تخیل نے پناہ دی۔ غالباً ۱۹۹۴ء کے بعد باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا تھا۔

شروع میں میری زیادہ نثری تحریریں جنگ لندن کے ادبی صفحے کی زینت بنتی رہیں بعد میں کئی ادبی رسائل میں شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی رہیں جن میں پرواز (لندن) ترسیل (انڈیا) عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد) شاعر (بمبئی) الحمرا (لاہور) ساحل (لندن) قرطاس (یوکے) انشا (انڈیا) جدید ادب (جرمنی) کے علاوہ کئی اور انٹرنیٹ میگزین دیگر رسائل بھی شامل ہیں جو اب ٹھیک سے یاد نہیں آ رہے۔ تخلیقات کی اشاعت کے لیے کبھی کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ بس میں خود ہی ابلاغ کے معاملے میں ذرا لاپرواہ واقع ہوئی ہوں۔ اب کوشش کرتی ہوں کہ وقت نکال کر کچھ چیزیں رسائل و جرائد کو روانہ کر دیا کروں۔

☆ اس امر سے آپ کس حد تک اتفاق کرتی ہیں کہ آپ کی تخلیقات میں خاص طرح کی اُداسی گھر کیے ہوئے ہے؟

☆☆ میں اس امر سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ میری تخلیقات میں خاص طرح کی اداسی ڈیرے جمائے رہتی ہے۔ اس کا بہترین ادراک معروف فلمکار بشریٰ رحمٰن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''رضیہ اسماعیل کی ساری کی ساری شاعری خوبصورت ہے جس میں شدتِ احساس ہے ایک عجیب سا انتظار ہے۔ ایک گہری اداسی ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس طرح جیسے کوئی چیز دوپٹے کے پلو میں باندھ کر گرہ لگائی جائے تاکہ ہمیشہ یاد دلاتی رہے کہ تمہیں اداس رہنا ہے''

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

''رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں اداسی یوں چھائی رہتی ہے جسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں''

میرے خیال میں میری شاعری پر یہ بہترین کمپلیمنٹ ہے۔

☆ یہ نرم گرم تجربات کس نوعیت کے ہوتے ہیں اور آپ کو ان سے کیونکر سابقہ پڑا؟

☆☆ اس سوال کا درست جواب تو وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے اپنی تحریر میں میرے ''نرم گرم'' تجربات کا ذکر کیا ہے بلکہ وہ حوالوں کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ انہیں میری تحریر میں کہاں ''نرمی اور گرمی'' محسوس ہوئی۔ میرے خیال میں تو یہ زندگی کے تلخ، ترش تجربات ہی ہیں جن سے ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے اور ایک قلم کار بھی اپنی تحریر کی اساس انہی تجربات پر رکھتا ہے۔

☆ غزل کے لغوی معنیٰ ہی خوبصورت خواتین سے گفتگو ٹھہرا، پھر آپ کے ہاں رومانیت اور قلبی واردات تلاشنا کارِ بے فیض نہیں؟

☆☆ میرے خیال میں غزل کے معانی اب وسعت مانگتے ہیں یعنی ہر وقت عورت ہی معشوق کیوں ٹھہرتی ہے؟ وہ بھی تو کسی پر عاشق ہو سکتی ہے!!! اس صنعتی امتیاز کی اب کیا ضرورت ہے؟ ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ ادب کو تذکیرو تانیث کے خانوں میں مت بانٹو تو پھر غزل کو بھی نئے معانی درکار ہیں۔ ویسے پنجابی اور ہندی شاعری میں تو عاشق نے صیغۂ تانیث میں ہی بات کی ہے۔ گویا ان دونوں زبانوں میں زیادہ جدیدیت ہے اردو کے مقابلے میں!!!

اس موقعہ پر نیاز بدایونی کا شعر یاد آ رہا ہے۔

فکر اور فن کے تقدس کی علامت ہے غزل
ادب اے دوست یہ کوچہ میری تہذیب کا ہے

فکر و فن پہ کچھ مردوں کی ہی اجارہ داری تو نہیں۔ ادب کے کوچۂ تہذیب میں سب اپنی اپنی شناخت مانگتے ہیں۔

☆ یہ اُن دیکھے خواب کی اصطلاح بھی خوب ہے۔ جو چیز وجود میں آئی نہیں اُس کی بابت کوئی رائے حسرت یا ملال عجیب نہیں لگتا؟

☆☆ میرا ماننا ہے کہ اس عظیم تخلیق کار نے ہمارے اندر ''خواب'' ازل سے ہی رکھ دیئے ہیں مگر یہ خواب شعوری سطح پر کب ظہور پذیر ہوتے ہیں یا شعور ان کا ادراک کب کرتا ہے یہ دوسری بات ہے مگر لاشعور میں ان خوابوں کی قوسِ قزح ہمیشہ ہی رنگ بکھیرتی رہتی ہے۔ انسان جس سے بے خبر نہیں ہوتا مگر خوابوں کی فصل کے پنپنے کے لیے موافق حالات اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح دیگر فصلوں کے لیے موزوں آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ اس طرح جب موافق حالات نہ ملیں تو کچھ خواب ان دیکھے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے حسرت اور ملال ایک قدرتی بات ہے یعنی جیسے ایک عورت کا حمل ساقط ہو جائے اور وہ اپنے ان جنمے بچے کا چہرہ کبھی نہ دیکھ پائے!!! اسی طرح بہت سے خواب بھی ان دیکھے ہی رہ جاتے ہیں۔

☆ آپ کی زبان و بیاں، اسلوب اور تنوع کو دوسری خواتین سے مختلف کیونکر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ میری تحریر کے زبان و بیاں اور اسلوب کے بارے میں تو وہی بہتر جواب دے سکتے ہیں جنہیں ان میں دوسری خواتین سے کچھ الگ بات محسوس ہوتی ہے۔ میرا کام تو بس لکھنا اور لکھتے رہنا ہے۔ قاری یا ادب کے نقاد اسے کس زاویے سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں یہ ان کی صوابدید پر ہے۔ البتہ میری تحریروں میں تنوع کی بابت میں ضرور جواب دے سکتی ہوں کیونکہ یہ تنوع اصناف کے علاوہ موضوعاتی بھی ہے۔ میری شعری تحریروں میں تنوع یوں پایا جاتا ہے کہ میں نے صرف غزل کی جگالی نہیں کی بلکہ نظم (پابند + آزاد + نثری) کے ساتھ ساتھ ماہیے اور دوہے بھی لکھے ہیں اور بہت وسیع موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ جہاں تک نثر کا تعلق ہے اس میں طنز و مزاح پر میری ایک تخلیق ہے۔ پوپ کہانیاں ہیں، افسانے ہیں، افسانچے اور یادنگاری ہے اور اب ناول کی طرف پیش قدمی ہے۔ اس طرح تنوع تو ہو گیا ناں! بس میری طبیعت یکسانیت سے گھبرا جاتی ہے۔ الگ طرح کا کام ذہن کو تحریک دیتا ہے۔

☆ تاریک راتوں، آہوں، سسکیوں اور کرچی کرچی خوابوں کا حساب کس سے طلب کیا جا رہا ہے؟

☆☆ تاریک راتوں، آہوں، سسکیوں اور کرچی کرچی خوابوں کا حساب جن سے طلب کیا جا رہا ہے وہ خوب جانتے ہیں میں کہہ کر بات گنوانا نہیں چاہتی۔ کچھ جواب نامکمل ہی رہیں تو ٹھیک ہے! میرا یہ شعر میرے حالات کا بہترین عکاس ہے:

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

☆ بے خودی اور ہشیاری عطا کرنے والی بات بھی اُلجھن پیدا کر رہی ہے؟

☆☆ اس میں الجھن والی کیا بات ہے؟ دیوانگی اور فرزانگی کے درمیان بس ایک باریک سی لکیر ہی تو ہوتی ہے!!! تخلیق کار بے حد حسّاس ہوتے ہیں اس

حسّیت کے بارے میں لکھنا مشکل ہے جبکہ تخلیق کار اس سے خوب واقف ہیں کہ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے وہ بے خودی اور ہشیاری کے بین بین زندگی گزارتے ہیں یعنی:

دیوانہ بکارِ خویش ہشیار

☆ جو لوگ آپ کے ہاں نا آسودگی کا ذکر کرتے ہیں اُس سے صورت حال قدرے پیچیدہ ہوجاتی ہے۔ ہماری درخواست پر اسے آسان بنا دیجیے؟

☆☆ میرے ہاں لوگ اگر کسی قسم کی نا آسودگی کا ذکر کرتے ہیں تو ٹھیک ہی کرتے ہوں گے کیونکہ ایک حسّاس ذہن رکھنے والا انسان کبھی بھی کلّی طور پر آسودہ نہیں ہوسکتا مگر میری نا آسودگی کا تعلق ظاہری اسباب سے نہیں ہے یہ تو اندر کی کائنات ہے جو ہر لحہ تکمیل کی طرف گامزن رہتی ہے بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

تو جب اندر ایک مستقل دھما چوکڑی مچی رہے گی تو آسودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس اسی اضطراب، بے چینی اور نا آسودگی میں تخلیق کار ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں اور میں بھی اس سے مبرّا نہیں ہوں۔

☆ اندر سے باہر کی طرف اور سوچ سے دل کی طرف سفر میں رہنے سے مراد کیا ہے؟

☆☆ اس سوال کا جواب کچھ تو اس سے پہلے والے سوال کے جواب میں پنہاں ہے مگر یہ بات ادھوری۔ مزید وضاحت اس ضمن میں کچھ یوں ہے کہ بقول مناظر عاشق ہرگانوی ''رضیہ اسماعیل کی غزلیں پڑھ کر لگتا ہے کہ اندر سے باہر کی طرف اور سوچ سے دل کی طرف سفر میں ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سے خود دریافتی اور خود آگاہی کی نبرد آزمائی شروع ہوتی ہے۔ اسی کشفِ ذات کے احساس اور تخلیقی تنہائی کی ساعت سے اکائی کی شناخت بنتی ہے۔ تخلیقیت شناسی کے جوہر واضح ہوتے ہیں اور تخلیقی رویہ داخل سے پھوٹتا اور خارج میں ملتا ہوا نظر آتا ہے۔''

میرا ماننا ہے کہ ہر قلم کار کشفِ ذات کے ان مراحل سے گزرتا ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہتا ہے۔

☆ آپ اور آپ کے فن کو پروین شاکر کا پیرو کہنے والے کس کو زک پہنچا رہے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں تو اس میں زک پہنچنے یا پہنچانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ متاخرین نے ہمیشہ ہی متقدمین اور اپنے پیش روؤں کے کام سے استفادہ کیا ہے۔ کچھ سیکھا ہے ان کی ادبی روایتوں کو آگے بڑھایا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تخلیق کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

پروین شاکر پورے اردو ادب کی منفرد شاعرہ ہیں جس کے ذکر کے بغیر میرے خیال میں تاریخِ اردو ادب مکمل نہیں ہوسکتی۔ اب یہ تو پڑھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ میری شاعری پڑھ کر کیا رائے دیتے ہیں۔ اب کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں ''پروین شاعر کے ہاں گو کہ عورت اپنے خالص فطری اور تخلیقی وجود کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھلتی ہے۔۔۔ مگر پروین کی شاعری کا مسئلہ یہ رہا کہ پروین ایک مخصوص (Elite) کلاس کی عورت کی جذباتی کیفیات و نفسیات سے باہر نہ نکل سکی چنانچہ اس کی عورت معنوی سطح پر عالمگیر تصور نہیں بنتی۔۔۔ جبکہ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے قبیلے نے خلوصِ شعر و تخلیق کو بہت پیچھے کہیں گم کرنے کے بعد سطحی اور غیر فطری نعرہ بازی کی پیروی اختیار کر لی۔ چنانچہ خواتین کی اردو شاعری تا حال کسی فلسفیانہ نظام یا کم از کم عورت کے کسی عالمگیر تصور تک نہیں پہنچ سکی۔۔۔۔ رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور درد کے مماثل ہے۔ جو ہستی کے مماثل ہے اور عورت کا یہ عالمگیر تصور رضیہ کو تمام خواتین شعراء میں ممتاز بنا دیتا ہے۔۔۔ رضیہ کی شعریت اور فکر و معنویت دونوں انتہائی طاقتور ہیں اور اس کی شاعری کی صورت میں اردو ادب ایک نئی شعری تہذیب سے آشنا ہو رہا ہے۔'' (ڈاکٹر علی اکبر منصور۔ لاہور ۲۰۰۱ء)

☆ ہمارے لیے یہ بات باعث تعجب بلکہ حیرت کا سبب اُس وقت بنی جب ہم نے ایک سے زائد احباب کو یہ کہتے سنا کہ آپ نے کشور ناہید کے تصورات اور طرزِ فکر میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے؟

☆☆ آپ یہاں غالباً حمیدہ معین رضوی کی تحریر ''رضیہ اسماعیل کی شاعری میں فلسفۂ تانیثیت'' کا حوالہ دے رہے ہیں یہ ایک طویل مضمون ہے جس میں عہدِ حاضر میں نسائی تانیثی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی ضمن میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میری سوچ اور اپروچ ہر دو خواتین سے الگ ہے۔

اس تحریر میں حمیدہ معین رضوی لکھتی ہیں کہ ''ویسے ہم نے کشور ناہید سے بہت کچھ سیکھا ہے کیونکہ ادب ایک مشترکہ سرمایہ ہے اور رضیہ نے اس میں اضافہ بھی کیا ہے لیکن رضیہ نے زہریلے مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے بھی لہجہ تلخ نہیں ہونے دیا'' حمیدہ کو کشور ناہید کے ہاں پائی جانے والی تلخیوں کا مکمل ادراک ہے اس لیے ''اضافہ'' کا ذکر کرتے ہوئے ساتھ ہی دونوں قلمکاروں کے لب و لہجہ کا فرق واضح کر دیا ہے جو درست تجزیہ ہے۔ اسی طرح (شاہدہ احمد، لندن) لکھتی ہیں کہ ''رضیہ کی نظموں کی عورت کشور ناہید کی نظموں کی عورت سے مختلف نہیں ہے۔ دونوں ہی کے ہاں بنتِ حوا کے ساتھ صدیوں سے چلے آتے ناروا سلوک پہ احتجاج اور شناخت کا مطالبہ ہے۔ اپنی پہچان، عزت اور توقیر کی مانگ ہے لیکن کشور ناہید کی نظموں کے برعکس رضیہ اسماعیل کی نظمیں عورت کی ذات سے وابستہ گوناں گوں مسائل کی عکاس ہوتے ہوئے بھی دھیمے لہجے کے پیراہن میں لپٹی ہوئی ہیں جن میں عورت کی داخلی کیفیات کے علاوہ اس کے اندر سر اٹھانے والے سوالوں کی گونج بھی ہے''۔ اسی ضمن میں بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں کہ:

''رضیہ اسماعیل کی پوری شاعری میں کہیں منافرت نہیں ہے۔ کہیں

منافقت نہیں ہے۔ انہوں نے اس قسم کی باغیانہ شاعری نہیں کی۔ انہوں نے سورج، چاند، ستارے نہیں مانگے صرف اپنے وجود کی شناخت مانگی ہے۔ اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے جو ہر عورت مانگتی آئی ہے۔ جو اس کا حق ہے اور اس صدی کے مردوں کو وہ شعور ہے کہ اسے اس کا حق دے سکیں۔''

میرے خیال میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خواتین میں اپنی ذات اور اس سے جڑے مسائل کا تصور و ادراک بڑھ رہا ہے اور خواتین اپنی شعری اور نثری تحریروں میں ان کا بھرپور احاطہ کر رہی ہیں۔ بقول حمیدہ معین رضوی ''اب عورت کا نہ شاعری کرنا کوئی انہونی بات رہی ہے اور نہ ہی نسائی شاعری کرنا۔ اکیسویں صدی کی ہر ذہین اور خلاق عورت نسائی شاعری ہی کرے گی'' جو کہ درست بات ہے۔ اسی مضمون میں حمیدہ رضوی رقمطراز ہیں ''رضیہ کی شاعری کو پڑھ کر ایک ہشت پہل ہیرے کا تصور ابھرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہیرے کا ہر عکس ایک جیسا چمکتا ہے اور رضیہ کی شاعری کے ہر پہلو کے چمکنے کا انداز اور رنگ مختلف ہیں۔ یعنی اس شعر کی تصویر:

یاسِ حسرتِ رنج و غمِ درد اولمِ سوز و گداز
دل میں میرے آیئے آٹھوں کا میلہ دیکھئے

رضیہ کی شاعری ان آٹھ احساسات کا مرکب ہے۔ میرے خیال میں جو بات حمیدہ نے کہی اور جس نے آپ کے سوال کو جنم دیا اس کا جواب اور فرق واضح ہو گیا ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ:

"It does not matter what is said but what does matter is how it is said!!!"

☆ صنفِ کرخت کی شاعری پر کبھی مردانہ وجاہت یا احساسات کی طرز کا کوئی تبصرہ نظر سے نہیں گزرا۔ خواتین شاعرات پر نسوانی جذبات، نسوانی احساسات، نسوانی رویہ، نسوانی۔۔۔ کا ٹھپہ کیوں لگایا جاتا ہے؟

☆☆ یہ ''صنفِ کرخت'' کی اصطلاح بھی خوب ہے! بھئی جو چیز وافر مقدار و تعداد میں آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے یعنی ''چہارسو'' ہی ہو اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو سب کو صدیوں سے نظر آ رہی ہے مگر جو چیز کمیاب ہے، نایاب ہے، توجہ طلب ہے تذکرہ تو صرف اس کا کرنا بنتا ہے ناں۔ وگرنہ ''صنفِ کرخت'' مزید ''کرخت'' ہو جائے گی۔ اب اس سے زیادہ سختی کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ بقول آپ کے ''نسوانی جذبات، نسوانی احساسات، نسوانی رویہ، نسوانی۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ کے ٹھپے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ عورت کی طرف صدیوں پرانے رویے تبدیل ہونے میں لمبی صدیاں درکار ہیں۔ مدتوں عورت کو (اور اب بھی) علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے ہر میدان سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ شعری تخلیق، نقد و نظر، افسانہ، ناول، ڈرامہ، مصوری، مجسمہ سازی، طب، فلسفہ، سیاست یا معاشیات غرضیکہ ہر وہ شعبۂ زندگی جس کے ذریعے عورت کی زندگی میں تازہ ہوا کا کوئی روزن کھلنے کا امکان تھا۔ اس کے دروازے بند رہے۔ (شاہدہ احمد۔ لندن) اسی ضمن میں لکھتی ہیں:

''عورت کے فن پارے منہ بند تجوریوں کی طرح زبان بندی کے قفل میں رکھے رہے وہ اندر ہی اندر شعر تراشی، کہانیاں لکھتی، تصویریں بناتی رہی مگر آنچل میں بندھی گرہ کھولنے کی اجازت نہ ملنے کے انتظار میں نجانے کیا کچھ اس کے اندر ہی تلف ہو گیا، اجازت اس لیے نہ ملی کہ کہیں اس میں چھپے خزانے نظروں میں آ کر اس کی فکر کو اعتبار نہ دے دیں۔''

تو عرض ہے کہ جب عورتوں کی طرف ہمارے معاشرتی، سماجی، زمینی اور نفسیاتی رویے تبدیل مثبت ہو جائیں گے تو یہ ٹھپے لگنے بھی بند ہو جائیں گے۔

☆ شعرا کی اکثریت نثری شاعری کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے جبکہ آپ کے ہاں نثری نظموں کی بہتات ہے؟

☆☆ میں نے کسی شعوری کوشش کے تحت زیادہ نثری نظمیں نہیں لکھیں۔ بس خیال آ گیا اور اس کو بیان کرنے میں جس کینوس کی ضرورت محسوس ہوئی اسے استعمال کر لیا۔

اگر شاعروں کی اکثریت نثری نظم کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے تو اس سے نثری نظم کی صحت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ جسے جس اسلوب میں لکھنا ہے وہ لکھے گا۔ جب غزل میں ردیف و قافیہ کی پابندیاں توڑ کر آزاد نظم لکھی گئی تو اس وقت بھی بہت واویلا مچا تھا۔ ہر نئی تبدیلی وقت مانگتی ہے۔ نثری نظم کو وقت دینا چاہیے کون جانے کب کہاں اور کون اس میں بڑی بات کہہ جائے جو سارا شعری منظر نامہ تبدیل کر کے رکھ دے۔ ویسے (Prose Poetry) انگریزی ادب میں تو بہت عرصے سے ایک پختہ صنف کی شکل میں موجود ہے جس کے بارے میں ایلیٹ نے کہا کہ ''شاعری کی معراج نثری نظم ہے'' ویسے بھی بقول غالب:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

درد و کرب کی شدت کبھی کبھی لے اور نَے کا سہارا لیے بغیر ہی کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس بات کو اقبال نے اپنے انداز میں یوں کہا ہے کہ:

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

☆ دوہوں میں آپ کے تجربات اور دوہوں کی جولانی کو کس پس منظر میں ہائی لائٹ کیا جاتا ہے؟

☆☆ میرا کام تو لکھنا ہے پس منظر یا پیش منظر خود ہی بنتا چلا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری بحر میں نہیں لہر میں موتی ہے۔ اب یہ لہر کس بحر میں جا کر گرے گی اس کا پتہ تو خود لکھنے والے کو بھی ٹھیک سے نہیں ہوگا۔ بس دوہے کہنے پر طبیعت آئی تو لکھ لیے اور کیا!!!

☆ اگر کسی تخلیقار کو خاص نظریہ یا فکر سے منسوب کر دیا جائے تو اُس کے

امکانات کم نہیں ہو جاتے۔ جیسے آپ کے بارے کہا جاتا ہے کہ رضیہ اسماعیل تانیثیت کے فلسفہ کے مطابق لکھتی ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اگر تو یہ فکر یا نظریہ ایک نیچرل Phenomenon کے طور پر آپ کی تحریر میں آتا ہے تو اس میں امکانات کے کم ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی زندگی کے تجربات جب آپ کی تحریر کا حصہ بنتے ہیں تو نظریہ بھی خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ کسی شعوری کوشش سے کوئی خاص فکر یا زاویۂ نظر پر وموٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ کے تجربے کے برعکس ہے تو پھر بات آمد سے زیادہ آورد کا شکار ہو جائے گی جو طبیعت پر گراں گزرتی ہے یعنی بات وہ ہے جو دل سے نکلے اور دل پر جا کر لگے یہ نہ ہو کہ دماغ سے نکلے اور دوسرے کے دماغ میں ہی جا کر پھنس جائے۔ میرے ہاں ایسا نہیں ہے۔

جس فلسفۂ تانیثیت کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی مانگے تانگے کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ میری زندگی کا حصہ ہے میں صرف اس کا ذکر ہی نہیں کرتی بلکہ اس پر عمل بھی کرتی ہوں۔ بقول حمیدہ رضوی ''فلسفہ طرزِ فکر کا نام ہے اور رضیہ کی شاعری میں طرز فکر کا ایک مربوط نظریہ موجود ہے جو مغربی تصور سے مختلف ہے مگر عورت کے حقوق کا علمبردار۔ اس لیے وہ تانیثیت کے فلسفہ کے مطابق لکھ رہی ہیں''

اب یہ تانیثی فلسفہ میرے نزدیک کیا ہے؟ خالقِ کائنات نے ہر انسان کو (چاہے مرد ہو یا عورت) عزتِ نفس برقرار رکھنے کا برابر حق عطا کیا ہے۔ صرف دائرہ کار الگ الگ ہیں بلکہ عورت ماں بن کر بہت اونچے مقام و مرتبہ پر جا بیٹھتی ہے۔ عورت اور مرد کسی قسم کی مسابقت یا ایک دوسرے کی ذات کی نفی کرنے کے لیے نہیں بنائے گئے بلکہ ایک دوسرے کے کمپلیمنٹ کرنے یعنی تکمیل کے لیے بنائے گئے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے یہی میرا تانیثی فلسفہ ہے یعنی:

گل سبھ وچ آ گئی تے رَولا کیہہ اے
رام۔رحیم تے مولا کیہہ اے

☆ آپ کی اکثر کہانیوں بلخصوص پوپ کہانیوں کا انجام آدھا ادھورا کیوں ہوتا ہے؟

☆☆ کہانی زندگی سے جنم لیتی ہے اور زندگی بذات خود آدھی ادھوری ہے۔ تکمیل کی طرف گامزن۔ میرے نزدیک کہانی بھی قفس کی مانند ہے جو اپنی ہی راکھ سے بار بار جنم لیتا رہتا ہے اس طرح ہر کہانی کی راکھ سے ایک اور کہانی وجود میں آتی ہے اور یہ ناختم ہونے والا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا یہ بات جوگندر پال کے اس افسانچے سے اور واضح ہو جائے گی۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے۔ اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ ہاں اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چندر میں ہی منٹو۔۔۔ اور وہ بھی کوئی جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔ ہاں بابو میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کر لوں۔ مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔ نہیں ایسا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے اس لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

☆ آپ کی کہانی ''آدھی چادر'' کو منٹو کی شاہکار کہانیوں کے مماثل گردانا حقیقت سے بعید نہیں؟

☆☆ اب اگر پڑھنے والے کو اس میں منٹو کی شاہکار کہانیوں سے کہیں مماثلت نظر آتی ہے تو اس میں کیا مسئلہ ہے۔ قاری کا اپنا ذہن ہوتا ہے کیونکہ آدھی چادر تقسیم کے موضوع پر لکھی گئی ہے اور میرے خیال میں منٹو وہ واحد ادیب ہیں جنہوں نے تقسیم کے موضوع پر غالباً سب سے زیادہ لکھا ہے۔ اس لیے تبصرہ نگار نے میرے افسانے ''آدھی چادر'' بٹوارے کے ادب میں حصہ داری کا ذکر کیا ہے۔ گو کہ دیگر قلمکاروں نے بھی تقسیم کے موضوع پر طبع آزمائی کی جن میں احمد ندیم قاسمی کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خوشونت سنگھ وغیرہ وغیرہ۔ جس تحریر کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ بریڈفورڈ سے یعقوب نظامی صاحب کی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

''کہانی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تاریخی مکاری بھی نظر آتی ہے جس نے نہرو، گاندھی، پٹیل اور وی پی مینن کے دباؤ میں تقسیم ہند میں ہیرا پھیری کی اور پنجاب کے بہت سے علاقے بشمول گرداس پور جو پاکستان کی طرف آتے تھے انہیں جان بوجھ کر ہندوستان میں شامل کر کے پنجاب میں خون کے دریا بہا دیے جس کے نتیجے میں ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''ٹوبہ ٹیک'' جیسے لازوال افسانے تخلیق ہوئے۔ اب رضیہ کی کہانی ۔۔۔ ''آدھی چادر'' بھی ان لازوال افسانوں میں شامل ہو چکی ہے۔''

☆ ''کیہہ جاناں میں کون'' واقعی افتخار نسیم عرف اِفتی کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی اس کے بعد کیوں کالاحقہ لازمی ہو جاتا ہے؟

☆☆ بالکل اسی کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ کیوں کہ واقعے کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا کردار (افتی) آج بھی اپنی شناخت اور اسے تسلیم کیے جانے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کے اندر اٹھنے والے بہت سے سوالوں کے جواب ابھی تک اُسے نہیں مل پائے اور شاید کبھی بھی نہ مل سکیں۔ میرے خیال میں اس کا چہرہ بذاتِ خود ایک سوالیہ نشان تھا۔

☆ پوپ کہانی کی بابت ہم نے آپ کی تفصیلی رائے کتاب کے دیباچے میں پڑھی، آپ کی پوپ کہانیاں اور تراجم بھی مطالعے میں آئے۔ آپ ہمارے قارئین کو اس صنف کے بارے اپنی رائے اور اس جانب توجہ کے اسباب کے ساتھ اردو ادب میں اس صنف کے مستقبل کے حوالے سے بتلایئے؟

☆☆ ابھی تک پوپ کہانی کا نام ہی سامنے آیا ہے اور لکھنے والے اپنے اپنے انداز میں لکھ رہے ہیں مگر سچ مانئے تو مجھے ان سب کی تحریروں میں کوئی اچھوتی بات نظر نہیں آئی۔ وہی روایتی کہانی، کہیں طویل، کہیں مختصر دورانیہ، کبھی سنجیدہ تو کبھی چٹکلے کا انداز۔ ابھی تک تو اس کی صحیح تعریف بھی طے نہیں ہو سکی ہے نہ ہی کوئی فارمیٹ یا ہیئت کہ کونسی چیز اسے عام کہانی سے الگ کر کے ''پوپ کہانی'' بنا دیتی

ہے۔اس کے پیرامیٹرز طے ہو جائیں تو کام آگے بڑھ سکتا ہے۔ میں نے اپنے دیباچے میں تجویز پیش کی تھی کہ اگر پوپ کہانی کا تعلق موسیقی (مشرقی) سے جوڑ کر مشرقی انداز کی کہانی ڈویلپ کی جاسکے تو بڑی پیش رفت ہوسکتی ہے وگرنہ تو مجھے اس کا کوئی خاص مستقبل نظر نہیں آتا باقی جنہیں لکھنا ہے وہ اسے لکھتے جائیں گے۔

☆ آپ نے کنگ وینکلس کی پوپ کہانیوں کو ترجمے کے لیے کیوں منتخب کیا۔ نہ تو اُن کی کہانیاں زیادہ اثر انگیز ہیں اور نہ وہ امریکی ادب میں خاص مقام کے حامل ہیں؟

☆☆ اس لیے کہ میری انٹرنیٹ سرچ میں مجھے صرف کنگ وینکلس کی دس پوپ کہانیاں ہی ملیں۔ کسی اور کی ملتیں تو ان پر کام کر لیتی۔

☆ کنگ وینکلس نے اپنی کہانی ''مشین'' کے آخر میں یہ نوٹ تحریر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی کہ ''اس کہانی کی امریکی معاشرے سے کوئی مماثلت نہیں''، ہم اگر کنگ وینکلس کے روبرو ہوتے تو یہ ضرور دریافت کرتے کہ بندہ پرور اگر امریکی معاشرے سے نہیں تو پھر کس معاشرے سے ہے؟

☆☆ بیچارہ کنگ وینکلس ۔۔۔آخر لکھنے والے کو کتاب چھپوانا بھی ہوتی ہے۔اسے پورے قلم قبیلے کے علاوہ پبلشرز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔شاید ان کی ناراضگی کے ڈر سے کہ ایسی کھلی تنقید پر وہ معترض نہ ہوں بس سب اپنی اپنی ضرورتوں سے بندھے ہیں۔میرے خیال میں تو کنگ وینکلس نے اپنی گلوخلاصی کرانے کے خیال سے یہ فقرہ کہانی کے آخر میں ٹانگ دیا ہے وگرنہ تو کہانی جس ماحول اور معاشرت میں لکھی جارہی ہوتی ہے اس کی کہیں نہ کہیں مماثلت تو ضرور ہوتی ہے اس سے۔

☆ بطور شاعرہ، افسانہ نگار آپ معروف تخلیقار تصور کی جاتی ہیں۔ جو لوگ آپ کو محقق گردانتے پرزور دیتے ہیں اُس کا کوئی ٹھوس جواز ہے؟

☆☆ ہاں میرے خیال میں کافی ٹھوس جواز ہے۔ میرا پروفیشن سوشل ورک ہے جس میں میں نے کافی تحقیق خاص طور پر برطانیہ میں ایشیائی کمیونٹی کے مسائل کے حوالے سے کی ہے جس میں گھریلو تشدد، لڑکیوں میں جسمانی معذوری، عورتوں میں ڈپریشن اور خودکشی، منشیات، بچوں سے ناروا سلوک کے مسائل اور خاندان پر اثرات، زبردستی کی شادیاں اور بہت سے دیگر سماجی مسائل وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں نہ صرف کہانیاں لکھیں شاعری کی بلکہ مختصر دورانیے کے اسٹیج ڈرامے بھی لکھے۔ کانفرنس، سیمینار اور ورکشاپس بھی کیں۔ان مسائل پر آگاہی دینے کے لیے اپنی کمیونٹی میں پچھلے بیس برس سے اپنی تنظیم ''آگاہی'' کے توسط سے سرگرم عمل ہوں جس کے نتیجے میں مجھے ملینیم کمیشن کی تا حیات فیلوشپ اور ملکہ معظمہ برطانیہ کی طرف سے کوئین آنر (MBE) سے اسی سال نوازا گیا ہے مگر ادبی لحاظ سے میری تحقیق پوپ کہانی کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئی ہے۔

☆ عورت کے دُکھ کی تیسری ڈائی مینشن کی اصطلاح پہلی بار نظر سے گزری تو ہمارا اشتیاق دوچند ہوگیا۔ظاہر ہے قارئین بھی ضرور چونکے ہوں گے۔ کبھی کسی نے اس حوالے سے براہِ راست باخبر ہونے کی کوشش نہیں کی؟

☆☆ تیسری ڈائمنشن کی اصطلاح عورت کے دکھ کے حوالے سے نہیں بلکہ تیسری جنس کے حوالے سے استعمال ہوئی ہے۔ شاید آپ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔پس منظر یوں ہے کہ یہ اصطلاح پہلی بار میں نے اٹلی میں ایک سات روزہ سیمینار میں استعمال کی تھی جس میں نسائی شاعری اور تانیثی ادب موضوع بحث تھا۔اس ادبی سیشن کی صدارت شکاگو سے آئے ہوئے معروف شاعر اور نثر نگار افتخار نسیم (افتی) کررہے تھے سبھی خواتین وحضرات اپنی اپنی جنس کی بات کررہے تھے مگر افتخار نسیم خاموش تھا۔اس کے چہرے کے تاثرات میں بخوبی پڑھ سکتی تھی کیونکہ اس کا تعلق ہر دو جنسوں کے بجائے تیسری جنس سے تھا۔اس لیے میں نے کہا کہ ادب میں ہمیں اب عورتوں اور مردوں کے علاوہ تیسری ڈائمنشن کی بات بھی کرنی چاہیے جسے سن کر افتی کا چہرہ کِھل اٹھا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

☆ جب ہر آنکھ آپ کی آنکھ بن گئی تو آپ کے دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی حس بھی کئی گنا بڑھی ہوگی۔لازمی طور پر اُس کا نتیجہ دریافت کرنا ہمارا حق بنتا ہے؟

☆☆ آپ کا حوالہ میری نظموں کا مجموعہ ''سب آنکھیں میری آنکھیں'' ہیں جس کے دیباچے میں میں نے یہ بات کہی ہے بالکل آپ نے بجا فرمایا میرے دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کی حِس بھی کئی گنا بلاشبہ بڑھی اور کئی عجیب وغریب قسم کے روحانی واقعات ظہور پذیر ہوئے جنہیں اس وقت احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں مگر میری ایک نظم ''خواب گر'' ایسے ہی ایک واقعے کے بعد لکھی گئی تھی۔غازی علم دین شہیدؒ کی یاد میں لکھے گئے ماہیے بھی ایک ایسے ہی خاص واقعے سے منسوب ہیں مگر میں ایسے معاملات کی چرچا کرنا درست نہیں سمجھتی۔

☆ جو لوگ آپ کو باغیانہ ذہن کی مالک بتلاتے ہیں۔اُن کو آپ کی بغاوت کے کچھ شواہد بھی پیش کرنے چاہیے؟

☆☆ اس کا کچھ جواب تو میں آپ کے پہلے سوال میں ہی دے چکی ہوں۔ میں نے خاندان میں رائج بہت سی فرسودہ روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا مثلاً لڑکیوں کو تعلیم نہ دلوانے کی فرسودہ روایت، لڑکی کی پیدائش پر رنجیدہ ہو جانا، جب میری بڑی بھتیجی (Niece) کی پیدائش ہوئی تو میں اس وقت کراچی یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کی طالبہ تھی میں نے خاندان میں مٹھائی بانٹی تھی جس پر بڑی بوڑھیوں نے ناک منہ چڑھایا کہ ''بیٹیوں کی پیدائش پر مٹھائیاں بٹتے ہم نے تو نہیں دیکھی'' تو میں نے کہا کہ ''اب دیکھ لیں'' ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں کم عمری میں روایتی انداز سے طے کی جاتی تھیں مگر میں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے نہ صرف شادی اپنی پسند سے کی بلکہ کافی دیر سے کی۔ میری باغیانہ روش کو دیکھتے ہوئے خاندان کے سبھی لڑکے مجھ سے کنی کتراتے تھے۔منہ پھٹ نہیں

تھی مگر سچی بات بغیر لگی لپٹی بہ انگ دہل کہہ دیا کرتی تھی جو ہماری روایت کے بالکل برعکس بات تھی۔ ہمارے خاندان کے لڑکے اکثر یہ کہتے سنے گئے کہ ''چنیوٹ گڑھ کا یہ قلعہ کون فتح کرے گا؟'' جس پر مجھے بہت ہنسی آیا کرتی تھی۔

لڑکیوں کو راستوں میں تنگ کرنے والے آوارہ مزاج لڑکوں سے مجھے سخت چڑ تھی۔ دو مرتبہ تو میں نے ان کے منہ پر زبردست تھپڑ رسید کئے اور ایک مرتبہ تو میں تنگ آ کر پولیس اسٹیشن بھی چلی گئی اور تھانیدار کو ڈانٹ پلا دی کہ وہ ان آوارہ مزاج لڑکوں کے خلاف کارروائی کرے۔ اس وقت میں بی اے کی طالبہ تھی اس کے بعد ان لڑکوں نے کبھی ہمارے گروپ کا پیچھا نہیں کیا لیکن میں خود کو باغی نہیں سمجھتی کیونکہ کسی اچھی تبدیلی کے لیے کوشش کرنا بغاوت نہیں بلکہ عین عبادت ہے۔

☆ آفاق کے نئے امکانات و انکشافات، معنیٰ مفہوم اور ذائقے کو اسلامی اساطیر میں تلاش کرنے کی کوشش کا کریڈٹ دینے والے مبالغے یا لاعلمی کا شکار تو نہیں؟

☆☆ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ لاعلمی یا مبالغے کا شکار ہیں تو یہ سوال تو ان ہی سے کیا جانا چاہیے!!

☆ خدا سے مخاطب ہو کر علوئے خیال کی رنگ آمیزی میں پس پردہ کس بڑی شخصیت کو تلاشنا چاہیے؟

☆☆ خدا سے بڑی ہستی اور کونسی ہے جسے مملوئے خیال کی رنگ آمیزی میں تلاش کیا جا سکتا ہے؟ یہ خدا کے بنائے ہوئے عظیم شاہکار (انسان) یعنی اپنی ہی ذات سے خود آگاہی، خود دریافتی کی ادنیٰ سی کاوش ہے بس اور کیا۔۔۔

☆ وہ کون سی چیز ہے جس نے مغرب میں رہ کر بھی آپ کو اسلامی شعائر کا پابند رکھا؟

☆☆ گھر کی تربیت، اسلامی اقدار و شعار اور پھر خود اسلام کی اعلیٰ انسانی قدریں، سیرت النبیؐ، اسلامی اکابرین خاص طور پر حضرت عمرؓ کا طرزِ حکومت اور عدل و انصاف، عورت کا اعلیٰ مقام، بلاشبہ اسلام ایک بہترین طرز حیات کی تعلیم و تربیت دیتا ہے اور اس کی حقانیت کی میں تہہ دل سے قائل ہوں۔

☆ جب ہم اسلامی شعائر کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد روزہ، نماز، زکوۃ تک محدود ہوتا ہے۔ آپ ہمیں اپنے اسلامی تصور سے روشناس کرائیے؟

☆☆ میرے نزدیک اسلام صرف حقوق اللہ ہی نہیں بلکہ اصل اسلام تو حقوق العباد کا نام ہے۔ حقوق اللہ کی بجا آوری کا مقصود بھی خود میں عجز و انکساری، امانت، دیانت و سخاوت پیدا کرے۔ بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہی مقصود ہے۔ اس لیے دینِ اسلام کا لُب لباب اعلیٰ اخلاقی اور اعلیٰ انسانی قدریں ہی ہیں جن پر میں مکمل ایمان و ایقان رکھتی ہوں اور ہمیشہ ان کی بجا آوری کی کوشش بھی کرتی رہتی ہوں۔ باقی دلوں کے حال تو وہ ذات ہی جانتی ہے اور اجر و ثواب اسی کی طرف سے ہے۔

☆ جو لوگ آپ کے ہاں تبلیغی رنگ کی بات کرتے ہیں اُن سے آپ کس طرح مخاطب ہونا پسند کریں گی؟

☆☆ تحریر میں کبھی کبھار، کہیں کہیں تبلیغی رنگ کا آ جانا معیوب نہیں ہے ویسے میری کوشش ہوتی ہے کہ تخلیق کو تخلیق ہی رہنے دیا جائے تقریر نہ بنایا جائے۔ میں اس کے لیے کوئی شعوری کوشش نہیں کرتی جہاں کہنے کی کوئی بات آ گئی کہہ دیتی ہوں۔

☆ معرفت کا در کھولنے کی بات بھی قاری کے لیے تجسس پیدا کر رہی ہے؟

☆☆ اس سوال کا کچھ جواب تو میں آپ کے پہلے سوالوں کے جواب میں دے چکی ہوں پھر بھی آپ جاننا چاہتے ہیں تو عرض ہے کہ میری شعری کلیات ''خوشبو۔گلاب۔کانٹے'' کا انتساب کچھ یوں ہے ''ربِ جلیل کے نام جس نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کر کے قلم اور تخیل کی نعمت سے نوازا۔ جب آپ قلم کو ایک امانت اور رب العزت کا نور سمجھ کر اور تخیل کو اس کی نعمت جان کر لکھیں گے تو معرفت کے در خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کچھ مجھ پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ ہر جینوئن قلمکار کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا ہے۔

☆ اکثر خواتین ناکام ازدواجی زندگی کے ردِعمل میں سماجی خدمات کی جانب رجوع ہوتی ہیں آپ خوشگوار گھرداری کے باوجود اس طرف کیونکر مائل ہوئیں؟

☆☆ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ''ناکام ازدواجی زندگی'' کے بعد سب عورتیں مدر ٹریسا ہی بن جائیں۔۔۔ عربی زبان کی کہاوت ہے کہ ''زمین کو فیاض لوگوں کے جام سے حصہ ملتا ہے'' مرد ہو یا عورت بس جینے کی توفیق رب نے جس کو دی ہے اسے اپنا اپنا جام لنڈھانا ہے یہاں پر۔ اس چیز کو منفی انداز کی بجائے مثبت انداز میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو اس سوال سے منفی امتیاز کی بُو آتی ہے؟

میں پیدائشی سوشل ورکر ہوں۔ سوشل ورک میرا اوڑھنا بچھونا اور پروفیشن ہے اور رضا کارانہ طور پر کمیونٹی میں ضرورت مندوں کے ساتھ کام کرنا میرا Passion (جذبہ) ہے۔ زندگی کی ناآسودگیوں نے مجھے سوشل ورکر نہیں بنایا یا سماجی خدمت پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ زندگی کے گوناگوں تجربات نے میری سوچ کو تحریک ضرور دی ہے اور یہ تخیل اور تحریر کو ضرور Enrich کیا ہے جس کی جھلک آپ میری شعری اور نثری تحریروں میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

☆ آپ کے تخلیقی سفر کا ایک دور شادی سے قبل اور ایک شادی کے بعد کا ہے۔ آپ کس دور کو اولیت دیں گی وجوہات لازمی طور پر بیان کیجیے؟

☆☆ میں نے پہلے بھی کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ شادی سے قبل میں نے کچھ خاص نہیں لکھا کیونکہ گریجویشن کرتے ہی میں برطانیہ آ گئی تھی اور یہ دور بڑا پُرآشوب رہا۔ کلچر شاک تھا، افراط و تفریط تھی بس مشاہدہ کیا زیادہ تر اور مطالعہ کرتی رہی۔ گاہے بگاہے لکھ لیتی تھی مگر آدھا ادھورا۔ کبھی شاعری تو کبھی نثر لیکن اس عرصے کی لکھی ہوئی کوئی چیز میں نے ضائع نہیں کی تھی بعد میں اس پر کام کیا جو

شادی کے بعد ہی تھا۔

☆ آپ کو خواتین کی صلاحیتوں کو تسلیم نہ کیے جانے کا دُکھ ہے۔ کونسی خواتین یورپین، پاکستانی، ہندوستانی، عربی یا افریقی وغیرہ؟

☆☆ خواتین کے مسائل ہر جگہ ایک سے ہی ہیں مگر کہیں کم کہیں زیادہ۔ بس حوالے ذرا مختلف ہیں۔ مغرب کی عورت بھی کھلی طور پر آزاد نہیں ہے مگر اس کے راستے کی رکاوٹیں کچھ اور طرح کی ہیں۔ میری تحریروں میں روئے سخن مشرقی عورت کی طرف ہی ہے وہ چاہے پاکستان میں ہو ہندوستان میں یا انگلستان یا پھر امریکہ یا افریقہ۔ اکثریت گوناں گوں مسائل کا شکار ہے۔

☆ اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ مشرقی خواتین بالخصوص دیہات میں کانٹوں پر چلتی ہیں مگر تعلیم کی شرح بڑھنے اور سائنس وٹیکنالوجی کے دور میں مظلوم مردوں کی تعداد بھی معقول ہندسے کی تلاش میں ہے؟

☆☆ ''مظلوم مردوں کی تعداد کے معقول ہندسے کی تلاش میں ہونا دلچسپ بلکہ فکر انگیز بات ہے۔ میں آپ کی بات سے کافی حد تک اتفاق کرتی ہوں۔ دراصل ''Power Game'' ہے یعنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ یہاں برطانیہ میں مظلوم ایشیائی منگیتروں کی تنظیم ایک وقت وجود میں آئی تھی جن کے ساتھ یہاں لڑکیاں بہت ناروا سلوک کیا کرتی تھیں۔ آج کل ڈومیسٹک وائلنس کے حوالے سے بھی یہاں مظلوم شوہروں کی تنظیم (DV) شوہر بچاؤ وجود میں آچکی ہے مگر ابھی یہ تعداد کافی کم ہے (یہ صرف ایشیائی نہیں تمام نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے مرد حضرات ہیں) اس بات کا تجزیہ میں یوں پیش کروں گی کہ جب کسی گروہ میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے تو وہ کئی ادوار سے گزرتے ہیں۔ پہلے دور کو ہم سٹارمنگ Storming یعنی طوفانی دور کا نام دے سکتے ہیں۔ طوفانی دور کے بعد نارمل پراسس نارمل لائزیشن کا عمل یعنی Normalization شروع ہوتا ہے جس کے بعد پرفارمنس (Performing) کی باری آتی ہے۔ ہمارے ترقی یافتہ معاشرے Perood خاص طور پر برطانیہ میں بھی اپنی خواتین میں اپنے حقوق کا ادراک، تعلیم، شعور وآگہی اور یہاں کے قانونی نظام کی وجہ سے اس وقت ہم ''طوفانی دور'' سے گزر رہے ہیں اس لیے بہت شکست وریخت ہو رہی ہے چیزیں نارمل ہونے میں وقت لگے گا ابھی اس لیے تب تک ممکن ہے کہ ''مظلوم مردوں'' کی تعداد کافی بڑھ جائے۔

☆ معاشی ضرورت کے تحت جسم فروشی کو بہت سے ممالک میں قانونی قرار دینا تو سمجھ میں آتا ہے مگر عیاشی یا گمراہی کو قانونی چادر اوڑھا کر ہم جنس پرستی کی حمایت یا سرپرستی کرنا مہذب دنیا کی بدصورتی میں اضافہ نہیں کر رہا؟

☆☆ آپ یہاں ''ہم جنس پرستی'' کی بات اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کر رہے ہیں اور ان تعلیمات کے مطابق تو جسم فروشی بھی درست نہیں؟ مگر جن معاشروں میں (مغرب میں) ''ہم جنس پرستی'' کو قانونی قرار دے دیا گیا ہے وہاں ابھی یہ لوگ اقلیت میں ہی ہیں۔ اکثریت تو ابھی بھی مرد اور عورت کے روایتی تعلق کی ہی طرفداری کرتی ہے لیکن اقلیت کو برداشت کرتی ہے۔ چاہے اسے دل سے قبول کرے یا نہ کرے۔

مغرب کے معاشروں میں قدروں کے فرق کی وجہ سے ایسے تعلق کو قانونی چادر اوڑھا دی گئی ہے جو ظاہر ہے ہماری اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں۔ (اس سلسلے میں آپ میری پوپ کہانی ''تھرڈ ڈائمنشن'' ضرور پڑھیے وہ اس موضوع پر میرے خیالات کی صحیح عکاس ہے)

آخر میں اتنا عرض کرنا ہے کہ جنس میں تو دو نقطے ہیں مگر اک نقطے وچ گل مُکدی اے۔

انتھک محنتی قلم کار

چند سال ہوئے میرے ایک بزرگ جناب محمود ہاشمی نے رضیہ اسمٰعیل (یا اسماعیل) کو مجھ سے ٹیلی فون پر متعارف کرایا تھا۔ اس وقت اس خاتون نے برطانیہ میں اردو کی خواتین قلمکاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی تھی۔ اس ڈائرکٹری کے لئے موصوفہ نے محمود ہاشمی صاحب سے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن محمود ہاشمی صاحب نے مضمون لکھنے کا قرعہ میرے نام نکالا۔ جس کی میں نے تکمیل کی۔ جب یہ ڈائرکٹری مکمل ہوگئی تو موصوفہ نے اس کی تقریب اجرا (آج کی زبان میں تقریب رونمائی) میں بلا کر مجھے عزت بخشی تھی۔ اور اس طرح ان سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار برمنگھم کے ایک دورے میں محترمہ طلعت سلیم صاحبہ اور محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی۔ تب پتا چلا کہ یہ طبعی شاعر ہیں۔ اچھا کلام کہتی ہیں۔ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں۔ ویسے تو برطانیہ میں اردو کے شاعر بہت ہیں اور ان کی وجہ سے برطانیہ میں مشاعروں کا بازار بھی گرم ہے اور بقول ان کے اس وجہ سے برصغیر ہند سے باہر اردو کی ایک بڑی'' درگاہ'' جزائر برطانیہ میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے مجاوروں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو ''ساڈھے کلچر'' کے چھکڑے پر سوار مقامی کونسلوں کے تعاون سے متشاعروں کو شاعر بنا کر اس تکیہ کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پر رضیہ ان سے مختلف ہیں۔ شاید پہلی بار کسی نے، خواہ وہ صرف خواتین قلم کاروں کی ہی ہو، اردو کے قلم کاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی اور جزائر برطانیہ کے طول وعرض میں رہنے والی خواتین ومرد قلم کاروں کے لئے ایک دوسرے سے رابطے کی صورت مہیا کی۔

ڈاکٹر صفات علوی

آنرکلنگ

(پوپ کہانی)

رضیہ اسماعیل

مولوی امیر الدین کا پارہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ساتویں آسمان پر تھا۔ گرجتے برستے مولوی کا ہوائی فائر کرنے میں تو کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سیّدانی بھی بڑی دل گردے والی عورت تھی۔ زبان کی کافی تیز۔ کرنے پر آتی تو ذرا لحاظ نہ کرتی مگر جب مولوی امیر الدین فائر کھولتے تو سیّدانی سیز فائر کر دیتی۔ زندگی کی گاڑی بس یونہی چھک چھک کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ذرا زیادہ دیر رک جاتی اور جب تک سبز جھنڈی ہلتی نظر نہ آتی زمین و آسمان سانس روکے رکھتے۔

مگر آج تو حد ہی ہو گئی تھی مولوی امیر الدین کو رہ رہ کر غصے کے دورے پڑ رہے تھے۔ سب بچے اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے بس تیروں کی بوچھاڑ سہنے کے لیے سیّدانی میدان میں ڈٹی ہوئی تھی بات کچھ بھی نہ تھی بڑی بیٹی شرمین نے کالج میں داخلے کی ضد کر ڈالی تھی مولوی امیر الدین کو یوں لگا جیسے اس نے باپ دادا کی عزت پر کالک پوت دی ہو۔ بیٹی بھی دھن کی پکی تھی۔ ایک ہی رٹ تھی کہ ''آخر وہ کب تک گھر میں بیکار بیٹھی رہے گی۔ نہ آگے پڑھنے کی آزادی۔۔۔ نہ ہی کوئی ملازمت کرنے کا ماحول۔۔۔ ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے؟ انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی اس قدر دقیانوسی ماحول۔۔۔؟ شرمین اکثر بڑبڑاتی۔۔۔! مولوی امیر الدین بیوی اور بیٹیوں کو تو تہہ خانے میں چھپا کر رکھتا مگر محلے بھر کی نئی نئی جوان ہوتی ہوئی شوخ وشنگ لڑکیوں کو کن اکھیوں سے دیکھنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ مولوی کے اسی دوغلے پن سے اس کی بیٹی شرمین کو چڑ تھی کہ ''خود میاں فصیحت اور دوسروں کو نصیحت۔۔۔!'' مولوی کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ شرمین اور ریان جڑواں بہن بھائی تھے اس کے بعد نرمہ اور کامران۔۔۔ بچے ماں باپ کے درمیان ہونے والی سرحدی جھڑپوں میں ملوث نہ ہوتے وگرنہ ماں کی طرفداری کرنے کی پاداش میں ان کی شامت آ جاتی۔

سیّدانی محلے بھر کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا کر ثوابِ دارین حاصل کرتیں۔ بسم اللہ۔ آمین۔۔۔ عقیقے۔۔۔ میلاد۔۔۔ گیارہویں۔۔۔ نذر نیاز۔۔۔ نذرانے بس ایک شور سا مچا رہتا۔ چند ایک عورتیں ہمیشہ سیّدانی کے پاس دعا کروانے کی غرض سے موجود رہتیں۔ ہر جمعرات کو خاص دعا کا اہتمام کیا جاتا۔ درود وسلام کی محفل منعقد ہوتی۔ جو مولوی امیر الدین کے گھر لوٹ آنے سے پہلے ہی ختم کر دی جاتی۔

اگر کبھی عورتوں کو اٹھنے میں دیر ہو جاتی اور مولوی امیر الدین گھر لوٹ آتا تو اس کے قدموں کی چاپ سن کر سبھی عورتیں دوپٹے، چادریں دوبارہ سے درست کرنے لگے جاتیں۔ سیّدانی ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کو کہتی کہ ''مولوی امیر الدین راہداری سے گزر جائیں تو وہ پھر نکلیں۔'' گویا ایک ہنستا بستا گھر نہ ہوا بیگار کیمپ ہو گیا۔ جہاں ہر وقت کسی انہونی کا دھڑکا لگا رہتا۔

مولوی کی بڑی بیٹی شرمین زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ جی بھر کر جینا چاہتی تھی۔ ہنسنا۔ کھیلنا، کودنا چاہتی تھی مگر گھر کا ماحول یوں تھا جیسے شہرِ خموشاں۔ ایسے میں تنہائی سے گھبرا کر وہ کسی نہ کسی سہیلی کو گھر بلاتی کیونکہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی فرمین اللہ میاں کی گائے تھی۔ سکول ختم کرتے ہی گھر کی زیادہ تر ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی تھی۔ کیونکہ اس کے اندر ایک فطری رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا جو کہ شرمین میں قدرے کم تھا۔ اس کی نٹ کھٹ طبیعت اسے کبھی سنجیدہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتی۔ جبکہ فرمین بہت کم ہنستی اور بولتی۔۔۔ اس نے کبھی شکایت کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شرمین ہمیشہ مولوی کے لیے دردِ سر بنی رہتی۔ شکل وصورت اور رنگ روپ میں فرمین سے کافی دبتی تھی اس لیے وہ کئی حیلوں بہانوں سے نمایاں ہونے کی کوشش میں لگی رہتی۔ کبھی بھڑکیلا لباس تو کبھی تیز میک اپ بات بے بات قہقہے لگانا۔ جن کی آواز سے مولوی کو سخت چڑ تھی۔ مولوی کا بس نہیں چلتا تھا کہ بے فکری سے قہقہے لگاتی ہوئی شرمین کا گلا دبوچ لے کیونکہ مولوی کے خیال میں ''عورتوں کو زیادہ وقت گھر داری، عبادت، توبہ استغفار اور گریہ زاری میں گزارنا چاہیے کیونکہ اپنے ناشکرے پن کی وجہ سے جہنم میں زیادہ عورتیں ہی ہوں گی اور انہیں اس دنیا میں ہی اپنی بخشش کا سامان کرنا چاہیے۔''

مولوی امیر الدین کو فکر تھی کہ کسی طرح شرمین کے ہاتھ پیلے کر دے۔ کئی جاننے والوں سے رشتے کے بارے میں کہہ رکھا تھا مگر جب بھی کوئی رشتہ آتا شرمین کوئی نہ کوئی ڈرامہ رچا کر لوگوں کو گھر سے بھگا دیتی اور سیّدانی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس کی نادانیوں پر پردہ ڈال دیتی۔ دراصل شرمین کو شادی کے نام سے ہی نفرت تھی۔ ابا اور اماں کے بے جوڑ رشتے کی نوعیت دیکھ کر تو وہ شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی کیونکہ وہ ابا جیسے کسی اور شخص کے پلے پڑ کر گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس قدر بے رنگ زندگی سے شرمین سمجھوتہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک دن بڑے بھائی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس نے رنگین ٹی وی اور وی سی آر کرایے پر لے لیا۔ مولوی امیر الدین جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ غیر مانوس آوازیں کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لونگ روم میں ٹی وی اور وی سی آر دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو اٹھا۔ پہلے تو بیوی کی خوب خبر لی کہ وہ جہنمی عورت تھی جو اولاد کو غلط راہ پر لگا رہی تھی۔ سیّدانی کے ترکی بہ ترکی جواب کے نتیجے میں آج پہلی بار مولوی امیر الدین کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

''ہائے پاجی۔ مردود۔ ظالم۔ ارے لوگو دیکھو۔ بڑھاپے میں زندگی بھر کے صبر کا کیا صلہ مل رہا ہے۔ ارے میں تو سہاگن سے رانڈ بھلی۔ یہ خصم نہیں۔

سینے کا زخم ہے۔ ہائے کدھر جاؤں میرے مولا۔ ایسے دوزخی سے کب رہائی ملے گی۔'' آج سیّدانی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔۔۔ ''ٹھہر جا حرامزادی۔ حرافہ۔ ابھی مزہ چکھاتا ہوں تجھے۔۔۔'' ایک اور زناٹے دار تھپڑ سیّدانی کا دوسرا گال بھی گلال کر گیا۔ سیّدانی نے سینہ پیٹ پیٹ کر لال کر لیا۔ مولوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شرمین بھاگ کر بیڈ میں جا چھپی۔ بڑا سا لوہے کا راڈ اٹھا کر مولوی نے پوری قوت سے ٹی وی اور وی سی آر توڑنے شروع کر دیئے۔ جیسے اس کے اندر الہ دین کے چراغ کا جن گھس گیا ہو۔ ٹی وی اور وی سی آر پر زور آزمائی سے تھک جاتا تو بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ بیٹا بھی ایسا بسم اللہ کا تخم کہ اُف تک نہیں کی۔ وگرنہ کڑیل جوان تھا۔ باپ کا ہاتھ تو روک ہی سکتا تھا۔ مگر مولوی امیر الدین نے گھر میں اپنی کچھ ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ کوئی اس کے مقابل نہ آتا۔ سیّدانی اپنے گال سہلاتی ہوئی جھر جھر روئے جا رہی تھی۔ آج تو اس نے مولوی امیر الدین کو بے نقط سنا ڈالیں گویا اگلے پچھلے سب حساب برابر کر ڈالے۔ ''بے غیرت، رانڈ۔ تیری کبھی بخشش نہ ہوگی۔ تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکی جائے گی۔۔۔ ناشکری۔۔۔ بے حیا۔'' مولوی بکتا جھکتا گھر سے باہر چلا گیا۔

گھر میں درجہ حرارت ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن پھر ہنگامہ ہو گیا۔ مولوی کا خیال تھا کہ شرمین اور ریان دونوں کی اب شادی کر دینی چاہیے۔ ریان کے لیے تو اس نے رشتے کے بھائی کی بیٹی سے بغیر کسی سے مشورہ کیے پاکستان میں بات طے کر لی تھی۔ آج سیّدانی نے اسے فون پر بات کرتے سنا تو گھر پھر سے پانی پت کا میدان بن گیا۔ سیّدانی کا موقف تھا کہ ''بچے جب پاکستان میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تو تم کیوں بضد ہو؟'' ''دیکھتا ہوں کس میں میرے فیصلے کے خلاف جانے کی مجال ہے۔ یہ سب تیری ہی شہہ کا نتیجہ ہے۔ تو ہی ایک دوزخن ہے اس گھر میں اور سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لے کر جائے گی۔'' مولوی امیر الدین پھر شعلہ بیانی پر اتر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیّدانی کوئی جواب دیتی دروازے پر کسی نے کال بیل بجا دی اور سیز فائر ہو گیا۔ اب ہر دوسرے تیسرے روز شادی کے مسئلے کو لے کر جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ شادی کے ذکر سے جیسے مولوی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ گھر بھر پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس کایا پلٹ پر سب حیران سے تھے۔ مولوی اور سیّدانی میں بات چیت ابھی تک بند تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مولوی امیر الدین نے ایک دن اچانک اعلان کر دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا رہا تھا۔۔۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔۔۔ تقریباً دو ماہ پاکستان میں رہ کر مولوی امیر الدین واپس انگلینڈ آیا تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ خوشی چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ بات بات پہ باچھیں کھل جا رہی تھیں۔ سیّدانی اور بچوں نے اسے اس سے پہلے کبھی اتنا نرم خو، ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس پرسکون تالاب کی تہہ میں کیسے کیسے طوفان چھپے بیٹھے تھے۔ مگر پوچھنے کی جرأت کس میں تھی؟

چند روز بعد مولوی امیر الدین نے بیوی بچوں کو لونگ روم میں بلا کر ایک لرزہ خیز انکشاف کر دیا۔ ''ہم عزت دار خاندانی لوگ ہیں۔ باپ دادا کی قائم کی ہوئی روایات پر مرنے والے۔ زبان کا پاس رکھنے والے۔ غیرت مند لوگ اپنی منگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اس لیے خاندانی عزت اور ناموس کو بچانے کی خاطر میں نے ریان کی منگیتر سے پاکستان میں شادی کر لی ہے۔''

بچوں کے چہرے شرم سے زمین میں گڑ گئے۔۔۔ سیّدانی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی اور اس نے آہ و بکا شروع کر دی ''ہائے ہائے اٹھارہ سال کی معصوم بچی تیری ان بیٹیوں سے چھوٹی۔ یہ کیا ظلم کیا تو نے۔ ہائے ہائے وہ اپنا سر پیٹتی جا رہی تھی۔ کیسے لوگوں سے نظر ملاؤں گی۔ ان بیٹیوں کی ڈولیاں اس گھر سے کیسے اٹھیں گی۔ اے میرے مولا۔ مجھے اٹھا لے۔ اب کچھ اور دیکھنے کی حسرت نہیں ہے۔۔۔'' وہ انتہائی دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔ مگر مولوی امیر الدین سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شرمین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر سڑک پر جا کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ غیرت کے نام پر صرف جسموں کا قتل ہی آنر کلنگ نہیں بلکہ معصوم لڑکیوں کے ارمانوں، ان کے جذبوں، ان کی آرزوؤں، ان کی امنگوں اور خوابوں کا قتل بھی آنر کلنگ ہی ہے۔۔۔!

مگر ایسے قتل کی سزا۔۔۔؟

شاعرۂ خوش گفتار

چھوٹی بحروں میں رضیہ اسماعیل مے نہایت اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے اور بڑی خوب صورتی سے اپنی شخصیت کے امکانات کو ظاہر کیا ہے۔ بعض اشعار تو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں جسے ہم نشریت سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل سادہ الفاظ اور چھوٹی بحر میں پُر اثر شعر کہنا پُل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے بشرطیکہ شعر میں سادگی کے ساتھ ساتھ پُرکاری اور اثر انگیزی موجود ہو۔ رضیہ اسماعیل نے کچھ مکالماتی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی روایت گفتم، گفتا کے ساتھ فارسی شاعری میں قدیم ہے۔ علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں اک کے نمونے زیادہ ملتے ہیں مگر اُردو شاعری میں خال خال ہیں۔ عدیم ہاشمی نے اس روایت کو تازہ کیا اور رضیہ اسماعیل نے اس کے تتبع میں چند مکالماتی غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔

عثمان صدیقی

درویشنی

عصمت بانو
(برمنگھم)

راجی، راج اور رجّو، یہ سب رضیہ کے بچپن کے پیار کے نام ہیں مگر ہمارے بابا اسے پیار سے ''راج دُلاری'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ وہ بابا کی بہت ہی لاڈلی اور منہ چڑھی بیٹی تھی اور کسی کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، اپنی ہی مستی میں سرشار۔ بڑی سنجیدگی اور متانت سے نہایت انہماک کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ نہ وہ خود کسی کے راستے میں آتی اور نہ ہی کسی دوسرے کی بے جا مداخلت پسند کرتی تھی۔ صاف گوئی، لگی لپٹی رکھے بغیر ہی بات کہہ دیتی۔ اگرچہ بڑی ہو کر اس کی صاف گوئی، سادگی اور سچائی نے اسے نقصان بھی پہنچایا۔ خود غرضی، منافقت اور ریاکاری سے بنی ہوئی اس دنیا میں مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوگئی ہے کہ ابھی یہ دنیا اس جیسے سچے اور بے ریا لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یا پھر اسے بہت پہلے پیدا ہونا چاہیے تھا۔

ہم تین بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی مگر متانت اور بردباری میں وہ سب سے بڑی نظر آتی۔ رضیہ کے بعد پانچ بھائی پیدا ہوئے جس نے رضیہ کی ناز برداریاں اور بھی بڑھ گئیں کہ یہ بھائیوں کا بقول بابا ''بازو پکڑ کر لاتی ہے'' گویا بچپن سے ہی اسے ایک منفرد حیثیت حاصل تھی۔ اور بعد میں بھی زندگی کے ہر میدان میں اس نے اپنی یہ انفرادیت برقرار رکھی۔ بابا اسے ہمیشہ بیٹا کہہ کر بلاتے تھے اور اس نے بھی صحیح معنوں میں بابا کا بیٹا بن کر ہی دکھایا۔ رضیہ نے بچپن میں زیادہ تر لڑکوں والے کھیل ہی کھیلے۔ عام لڑکیوں جیسے شوق اس نے کبھی نہیں پالے۔ نہ مہندی، نہ چوڑیاں، نہ اپنے کپڑوں کے لیے ضد، نہ ہنڈکلیا، نہ گڑیوں کے شادی بیاہ، نہ کسی کی سُن گُن، نہ ادھر کی باتیں اُدھر، نہ بے جا شیخیاں، نہ شوخیاں، نہ شرارتیں۔ بڑی دیر تک تو اس کا مزاج ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ لڑکی کس مٹی کی بنی ہے اور کیا چیز ہے؟ کھیتوں کھلیانوں میں گھومنا، درختوں پہ چڑھنا، جانوروں سے پیار کرنا، کتابیں پڑھنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔ نہایت ذہین تھی۔ سب سبق ازبر، اساتذہ کی آنکھ کا تارا۔ ہر امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا مگر سادگی اور بے نیازی کا یہ عالم کہ کبھی اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ منافقت، ریاکاری اور سطحی باتوں سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ کسرِ نفسی بہت ہے۔ ایک عجیب سی درویشی اور مجذوبانہ پن ہے اس کے اندر۔ اسے اپنی تنہائی بہت عزیز ہے۔ ذہین اور بلند کردار اور سچے لوگوں کی دل سے قدر کرتی ہے۔ دل اور ہاتھ دونوں سے سخی ہے۔ دامے، درمے، سخنے ہر ضرورت مند کی مالی اور اخلاقی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی عزت کی قائل ہے۔ ہر شخص کی عزت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے اس کی عزت کریں۔ اس کے بے تکلف دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر ایک سے ''آپ'' سے ہی مخاطب ہوتی ہے۔ صرف بے تکلف دوستوں اور بہنوں کے ساتھ ''تم'' کا صیغہ استعمال کرتی ہے۔ نہایت حساس اور نرم دل ہے۔ لوگوں کے منفی رویوں پر بہت جلد رنجیدہ ہو جاتی ہے اس لیے لوگوں سے کم سے کم ملتی ہے تاکہ بعد میں کبیدہ خاطر نہ ہو۔ جہاں کہیں منافقت کی بو پاتی ہے تو کسی سے کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے راستہ ہی بدل لیتی ہے۔ میری یہ اصولوں والی بہن، ایک اچھی منتظمہ، بہترین خاتونِ خانہ، نہایت پیار کرنے والی ماں، پُرخلوص شریکِ زندگی، جان چھڑکنے والی بہن اور قابلِ فخر بیٹی ہے۔ اپنے لفظوں کی حرمت کی امین، وقت کی پابند۔ جس کے ساتھ کمٹمنٹ کرتی ہے اسے دل و جان سے نبھاتی ہے۔ حتّاس اس قدر کہ بچپن میں اس نے بلی پال رکھی تھی جو اچانک داغِ مفارقت دے گئی تو اس نے کئی روز تک اس کا سوگ منایا۔ باقاعدہ بلی کی قبر کھود کر اسے دفن کیا اور اس کے بعد آج تک کوئی پالتو جانور نہیں رکھا۔ شاید رضیہ کے دل میں بچپن میں بننے والی ننھی سی قبر نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

بابا جب ولایت آئے تو یہ کوئی دس گیارہ برس کی رہی ہوگی۔ جدائی کے اس غم کو رضیہ نے روح میں اتار لیا۔ جوانی میں بہت ڈسٹرب اور مضطرب رہی اور شاید آج بھی کھوئی ہوئی پاکیزہ محبت کی تلاش میں رہتی ہے۔ بابا سے چھوٹی سی عمر میں جدائی نے رضیہ کی ننھی سی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا جس کا اندازہ کسی کو ٹھیک سے اُس وقت نہ ہو سکا اور شاید خود رضیہ بھی صحیح طرح اپنے آپ کو نہ اُس وقت جان سکی۔ بس اپنے اندر ہی کنڈلی سی مار کر بیٹھ گئی۔ اس لیے رضیہ کو سمجھنا، اس کے قریب جانا اتنا آسان نہ تھا۔ بس اندر ہی اندر غموں کی پرورش کرتی رہی۔ شاید یہیں کہیں اس کے اندر کی غمزدہ لڑکی نے ہاتھ میں قلم پکڑ کر ہوا پر لکیریں کھینچنا شروع کر دی تھیں۔ مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ میری یہ گم سم سی رہنے والی بہن ایک دن اپنے خونِ دل سے کاغذ کا سینہ لہولہان کر کے رکھ دے گی۔ لکھنا رضیہ کی مجبوری ہے اس کا کتھارسس ہے، اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہ کرے تو شاید اس کے اندر کی گھٹن اسے ایک قدم نہ چلنے دے۔ کیوں کہ رضیہ ایک ساکت و جامد نہیں بلکہ ایک متحرک شخصیت کا نام ہے۔

میں نہ کوئی شاعرہ ہوں، نہ ادیبہ اور نہ نقاد۔ مگر ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ رضیہ کی تحریریں اس کے جذبے، احساس، تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں پل کر جوان ہوتی ہیں۔ اُس نے زندگی کو برتا ہے۔ سنی سنائی کہانیاں قلم زد نہیں کیں۔ غموں کی آگ نے اسے جلایا نہیں بلکہ مزید سنوارا اور نکھارا ہے۔ مگر افسوس صرف اس بات کا ہے کہ رضیہ نے بہت دیر سے لکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنی صلاحیت سے بہت کم لکھا ہے۔ اگر اسے موافق حالات ملے ہوتے تو اس کی پرواز کسی اور آسمان تلے ہوتی۔ رضیہ بنیادی طور پر اپنے ہی لیے

لکھتی ہے۔ نہ چھپنے چھپوانے کا اہتمام کرتی ہے اور نہ پی آر اور پروموشن کے لیے فکرمند ہوتی ہے۔ بس خاموشی سے اپنا کام کیے جاتی ہے۔ گویا ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔'' بس اپنے مالکِ حقیقی سے خاص رابطہ رکھتی ہے۔

انسانی خدمت کو سب سے بڑی عبادت گردانتی ہے۔ اپنے خالق و مالک سے قائم پاکیزہ تعلق کو وہ کسی قیمت پر آلودہ نہیں کرتی۔ روشن آنکھوں والی رضیہ کے اندر کی دنیا اس سے کہیں روشن ہے۔ یہ سب خدائے بزرگ و برتر کا انعام ہے۔ اس کا خاص کرم ہے میری بہن پر۔ جس کے لیے وہ خالقِ حقیقی کی بے حد شکر گزار ہے۔

رضیہ کو پلیٹ میں سجی سجائی زندگی نہیں ملی۔ اس کے لیے اس نے بہت محنت کی ہے۔ کتنی تاریک راتوں اور کتنی بے نور صبحوں سے آشنا ہو کر روشنیوں میں آئی ہے۔ اس کے سب محاذ زندہ ہیں۔ گویا اس نے زندگی نہیں گزاری چومکھی لڑائی لڑی ہے اور اب تک لڑ رہی ہے۔ اور یقیناً آخری فتح بھی حق اور سچائی ہی کی ہوگی۔ رضیہ ایک گوہر نایاب ہے اور مجھے رضیہ کی بہن ہونے پر فخر ہے۔ رضیہ کی ناقدری کرنے والے لوگوں نے رضیہ کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک نایاب انسان کی دوستی اور محبت سے محروم رہ گئے ہیں۔ رضیہ ایک شعر اکثر دہراتی رہتی ہے:

ہم فلک کے آدمی تھے، ساکنانِ قریۂ ماہتاب تھے
ہم ترے ہاتھوں میں کیسے آ گئے، ہم تو بڑے نایاب تھے

خواندنی اور جاذبِ نظر کہانیاں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نظم و نثر میں کہانیوں کے زیرِ نظر مجموعے ''کہانی بول پڑتی ہے'' سے پہلے بھی بہت کچھ تصنیف کر چکی ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی خصوصیات کے باعث خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ان کہانیوں کو ''پوپ سٹوریز'' کا نام دیا ہے اور پیش لفظ میں اس اصطلاح کے مفہوم پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ پوپ سٹوریز درحقیقت پوپ میوزک کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی اصطلاح ہے۔ دونوں میں قدر مشترک صرف مقبولیت ہے۔ مصنفہ امریکی پوپ سٹوری رائٹر کنگ وینکلس (King Wencles) سے متاثر ہوئی ہیں مگر یہ کہانیاں علامتی ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحبہ کی کہانیاں واقعات کو براہِ راست اور اکہرے انداز میں بیان کرتی ہیں جن کے کردار خصوصاً نسوانی کردار ایک خاص کشش کے حامل ہیں۔ یہ پڑھی لکھی، ذہین، متجسس، دلکش اور متنوع صلاحیتوں کی حامل لڑکیوں کی کہانیاں ہیں جو اکثر شادی کے بعد انگلینڈ میں سکونت پذیر ہو گئی ہیں مگر ابھی اپنی روایات، عقائد اور اندازِ بود و ماند میں بہت حد تک پاکستانی ہیں۔ وہ اپنے نئے ملک میں نسلی تفاوت اور ماحول کی اجنبیت سے دوچار ہیں مگر ان میں سے بعض رفتہ رفتہ اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جبکہ کچھ ایسی بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں اور مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مقیم متوسط طبقے کے پاکستانی تارکین وطن کے کئی مسائل مزاجی تضادات ان کہانیوں میں منعکس ہوئے ہیں اور ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں سے اکثر کے عنوانات انگریزی میں ہیں اور اسلوب میں بھی جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے لیکن یہ سب اس لیے بُرا معلوم نہیں ہوتا کہ جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کے لیے یہ بہت حد تک ضروری ہے تاہم ڈاکٹر صاحبہ جہاں خالص اردو میں لکھتی ہیں وہاں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رواں اور زبانِ اردو کے مزاج کے مطابق نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتی ہیں۔

مصنفہ کے نزدیک ''پوپ کہانیاں'' دلچسپی کے عنصر کی حامل ہونی چاہئیں اور یقیناً اس مجموعے کی ہر کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ سہولت کے ساتھ دس پندرہ منٹ میں آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ پاپولر لٹریچر کا بڑا مقصد یہی ہوتا ہے یہ قاری کو فلسفیانہ، مابعد الطبیعاتی اور گہرے نفسیاتی مسائل میں الجھانے کی بجائے وہی کچھ پیش کرتا ہے جو دلچسپی برقرار رکھے۔ اس قسم کے ادب کا قاری کبھی کبھی ''پاپولر'' کی حد کو عبور کر کے گھمبیر مسائل پیش کرنے والے ادب کی طرف پیش رفت کر جاتا ہے۔

بہرحال میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ان کہانیوں کو بہت دلچسپی توجہ طلب اور جاذب پایا ہے اور امید ہے کہ دیگر پڑھنے والے بھی انہیں خواندنی (Readable) اور جاذبِ نظر پائیں گے۔

خواجہ محمد ذکریا

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں

صفیہ صدیقی
(لندن)

اس مصرعے کی خالق رضیہ اسماعیل ایک باذوق اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں، نثر نگاری کا بھی شوق ہے۔ ان کی طنز و مزاح کے مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' جون ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ان کے بہت دلچسپ مضامین ہیں۔ شگفتہ عنوان ہی سے آپ کو مضمون کا اندازہ ہو جائے گا۔ مثلاً گرینڈ مدر، چھوٹی کی کرشمہ سازیاں، ہائے یہ گوریاں، ادبی جمود وغیرہ۔ گرینڈ مدر میں نانی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''اپنی اس قدر صحت مند نانی دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔ بچپن کی بہت سے خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔''

دوسرے مضمون میں جس کا عنوان ''آ گئی'' ہے، لکھتی ہیں:

''آ گئی دراصل اُردو زبان کے خوب صورت لفظ ''آ گہی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اُردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں اسے ''آ گہی'' کہتے ہیں مگر برطانیہ میں لوگ اسے ''آ گئی'' کہتے ہیں۔ دراصل بگاڑ ہمارے کلچر کا اتنا اہم جزو بن چکا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اب خالی نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اگر ''آ گہی'' کو بگاڑ کر ''آ گئی'' بنا دیا گیا ہے تو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کے یہ مضامین بظاہر تو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں مگر ان کو پڑھ کر جہاں ہنسی آتی ہے وہاں انسان کو کچھ کھو جانے کا احساس بھی ہوتا ہے اور علامہ اقبال کا یہ شعر سماعت سے ٹکرانے لگتا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ان کے دل چسپ جملے اور طنز کے تیر و نشتر ہماری اپنی کمزوریوں اور بصیرت و بصارت دونوں کے فقدان کا شدید احساس دلاتے ہیں۔ ''ادبی جمود'' کے عنوان والے مضمون میں اس کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اپنی ذات اور انا کے حصار میں مقید لوگ کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لیتے ہیں۔ ''سنا ہے ہمارے دانش ور جب کبھی رسمی یا غیر رسمی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو اُردو ادب پر طاری جمود کے بارے میں بہت پریشان بلکہ پروفیسر پریشان بن جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں پروفیسر صاحب بھی زندگی میں اپنے منفرد نام سے اتنے پریشان نہ ہوئے ہوں گے بلکہ جس نے نام ہی پریشان رکھ لیا تو پریشانی کو ان سے کیا سروکار؟ ایسے میں پریشانی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے آنگن میں خیمے گاڑ دیتی ہے۔''

اور مذاق ہی مذاق میں وہ پتے کی بات کہہ جاتی ہیں، ایسی حقیقت جس کا آپ سنجیدگی سے اظہار نہیں کر سکتے۔ اسی ادبی جمود میں.....

''اُردو ادب پر جاری جمود کو توڑنے کے لئے برطانیہ کے لئے برطانیہ کے ایشیائی ریڈیو اسٹیشن بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ شعر و شاعری کے پروگراموں میں لوگ اساتذہ تک کے کلام کو اپنا کلام کہہ کر سنا جاتے ہیں۔ پروگرام کرنے والوں کو پتا تک نہیں چلتا کہ کس کا کلام تھا بلکہ وہ شاید اچھے بھلے شاعر کے نام سے واقف تک نہیں ہوتے تو کلام کا کیا خاک پتا چلے گا۔ ایسے میں ہم ایسے کور ذوق پری شان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس فاش چوری کی اگر نشان دہی کی جائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ اچھا میرے خیال میں یہ شعر میرا ہے۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!''

رضیہ اسماعیل نے مزاح میں در پردہ بڑی بڑی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کی تمام تحریریں بظاہر مزاحیہ ہیں لیکن بین السطور آپ کو اپنے معاشرے کے ان رویوں کا بیان ملتا ہے جو ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ادیب خواہ وہ ایک سنجیدہ مضمون کے ذریعے ہو یا طنز و مزاح سے کمیونٹی کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس طرح اصلاح ممکن نہ ہو تو بھی وہ ایک باشعور انسان کی طرح زندگی کے غلط رویوں کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے۔ جب ہم طنز و مزاح کے ذریعے معاشرے پر تنقید کرنے والے مزاح نگاروں کے متعلق سوچتے ہیں تو ابنِ انشاء ان میں بہت نمایاں اور عوام میں مقبول نظر آتے ہیں۔

انوکھا کام کرنے کا عزم رکھنے والی رضیہ اسماعیل کی شاعری روایتی ہونے کے باوجود شکوہ و شکایت والی شاعری نہیں ہے۔ ان کے اشعار ایک زم اور حوصلے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ عورت ہونے پر کمزوری کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ کہتی ہیں:

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں
ستم کو، جور کو، سب نفرتوں کو
محبت سے نمٹنا چاہتی ہوں

رضیہ نے عورت کے ہر پہلو کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے اور ان کے اشعار سے معاشرے کے رویے پر ان کا دکھ ظاہر ہوتا ہے۔ نہ صرف اپنے ملک میں عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بلکہ اس دنیا کی ہر عورت کے دکھ کو انھوں نے محسوس کیا اور ان کے خیالات ان کی شاعری کا موضوع بنے۔ ان کی نظم ''خوش قسمت'' میں عورتوں کی ذات سے متعلق وہ سارے نام دیتی ہیں جو معاشرہ عورتوں کو بخشتا ہے۔

ہمارے کتنے ہی نام ہیں
مجبور عورتیں ،محصور عورتیں
لاچار عورتیں، ریا کار عورتیں
گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں
کم نظر عورتیں ، بدگماں عورتیں
بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں
.....
لیکن خود اعتمادی کا یہ عالم کہ
گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

ایک اور نظم ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' میں زباں بندی پر سارے شکوے شکایت کے بعد

اگر میں دل کی بات نہیں کہہ سکتی
تو مجھے بولنا کیوں سکھایا گیا
.....

میرے ذہن میں ایک خیال چٹکی لیتا ہے کہ درست ، یہ شعر رضیہ اسماعیل کا شاعرانہ تصور ہے مگر یقیناً ہر عورت کی زندگی میں ایک سے زیادہ ایسا موقع آیا ہوگا جب اس کے دل میں بھی یہی سوال آیا ہوگا۔کم از کم ایشیائی عورت کے لئے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے۔

ان کے شعری مجموعے ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کے تعارف میں عدیم ہاشمی صاحب تحریر کرتے ہیں:

''غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔''

نثر نگاری اور شاعری کے علاوہ رضیہ اسماعیل ایک سوشل ورکر بھی ہیں اور اپنی کمیونٹی کے لئے خصوصاً ایشیائی عورتوں کے لئے کام کر رہی ہیں۔انھوں نے ''آگہی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو ایک تحریک بن گئی ہے۔''آگہی'' کی اپنی ایک ویب سائٹ ہے جس پر ''یوتھ سیکشن'' اور ''اُردو سیکشن'' کے عنوان سے سیکشن قائم کیے گئے ہیں۔ یوتھ سیکشن کی ریورس ڈائریکٹری میں ایڈوائس اور سپورٹ، الکوحل اور ڈرگ ابیوز، برمنگھم سٹی کونسل، کیریئرز، معذوری، تعلیم، خواتین، نوجوانوں اور مفید رابطوں کے لئے پتے اور لنکس وغیرہ سب تفصیلات مہیا کی گئی ہیں ۔ نوجوان خواتین کے لئے ''آگہی ہیلپ لائن'' کا آغاز بھی ہوا ہے۔اُردو سیکشن میں برطانیہ کی خواتین رائٹرز کے نام، ان کی تصانیف کے نام اور شاعرات کے کلام کے مختصر نمونے بھی ویب سائٹ میں موجود ہیں ۔''آگہی'' کے زیرِ اہتمام سماجی تقریبات اور پوئٹری ورک شاپ وغیرہ منعقد ہوتی رہتی ہیں جس سے برمنگھم میں رہائش پذیر ہماری تیسری نسل کے نوجوان یقیناً مستفید ہوتے ہوں گے۔

کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔اور یہی بات ایک کامیاب عورت کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔مگر یہ بات مجھے لگتا ہے کہ کسی مغربی مرد یا عورت کی کہی ہوئی ہے۔ہمارے ہاں تو ہر کامیاب انسان کے پیچھے نہ صرف شوہر یا بیوی بلکہ بچے، ماں باپ اور سارا کنبہ ہوتا ہے۔سب اس کے کام میں دل چسپی لیتے ہیں اور حتی الامکان مدد کرتے ہیں ۔اگر دور ہیں تو دعاؤں میں شامل رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رضیہ اسماعیل کی ان سب کامیابیوں میں بھی ان کے خاندان کا بھی ہاتھ ہے اور خاندان کی مدد اور دعا حاصل ہونے سے خدا کا فضل بھی شاملِ حال ہوتا ہے۔رضیہ اسماعیل ریسرچ بھی کر رہی تھیں اور ان کو ڈاکٹریٹ کی سند بھی مل چکی ہے۔میری جانب سے بہت بہت مبارک باد.....

☆

شگفتہ بیان ادیبہ

شاعروں اور مشاعروں کی بالادستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اُپج ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جاسکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کیے جاسکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف کی جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔

محمود ہاشمی
(برمنگھم)

کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

عدیم ہاشمی

(●)

ایک زمانہ تھا، ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت تھے اور لکھنے والے ادبی رسالوں کی ضرورت۔لیکن ادبی رسالوں کی گروہ بندیوں، داغ دار کردار اور گھٹیا ادب کی وجہ سے اب ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت نہیں رہے۔اگرچہ لکھنے والے آج بھی ادبی رسالوں کی ضرورت ہیں۔اس لئے لکھنے والوں کے بغیر تو کوئی رسالہ بھی شائع نہیں ہوسکتا۔جب کہ اچھا شاعر اور اچھا شعر کسی رسالے یا جریدے کا محتاج نہیں ہوتا۔رسالوں کے اس گھٹیا ادب اور ادبی رسالوں کے داغ دار کردار اور گروہ بندیوں کی بدولت اب شاعر اور شاعرات یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ رسالے میں چھپنے کا تکلف کرنے کی بجائے سیدھی سیدھی اپنی کتاب ہی شائع کرا دی جائے۔ویسے بھی ادبی رسالوں کی نسبت ہمارے یہاں ادبی کتاب زیادہ پڑھی جاتی ہے اور رسالوں کی نسبت بکتی بھی اور چھپتی بھی زیادہ ہے۔اس میں مسئلہ صرف یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ رسالے میں چھپنے سے شاعر یا شاعرہ کا ادبی حلقوں میں جو تعارف ہو جاتا تھا وہ اب نہیں ہوتا۔اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ شاعری کی کون سی کتاب پڑھی جائے اور کون سی کتاب نہ پڑھی جائے، خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔کیا خبر کس کتاب کی پٹاری میں سے کیا نکل آئے۔

ویسے بھی ادب کے پھیلاؤ سے ملک اور بیرون ملک تخلیق ہونے والے ادب میں یہ مسئلہ اور بھی گنجلک کر دیا ہے۔اندرون ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو تو صرف دو طرح کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ایک شاعر کی حیثیت سے اور دوسرے شاعرہ کی حیثیت سے۔شاعر تو شاعر ہے لیکن خواتین کے معاملے میں اور بھی کئی مسائل سامنے آ جاتے ہیں، جو سب لوگوں کو معلوم ہیں۔بیرونِ ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو البتہ کئی دوسرے پہلوؤں سے بھی پرکھا جاتا ہے۔ایک تو یہ کہ انھیں صرف ان کے غیر ملکی تناظر میں دیکھا جائے۔جن میں اکثر شاعر اور شاعرات صرف اسی لئے Exist کرتے ہیں کہ وہ انگلستان یا امریکہ میں شاعری کر رہے ہیں۔پاکستان میں ہوتے تو شاید صرف کسی کریانے کی دکان پر نوکری کر رہے ہوتے۔لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے گرد و نواح میں محدود کر کے دیکھنا ان کی شاعری کے ساتھ یقیناً ناانصافی ہے۔ان میں انگلستان کے لوگوں میں ارشد لطیف، یاسمین حبیب، یشب تمنا، فیضان عارف اور باصر کاظمی کے نام یقینی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔اسی طرح رضیہ اسماعیل بھی یقیناً ایک ایسا ہی ادبی حوالہ ہے جسے غیر ملکی تناظر سے نکال کر باقاعدہ طور پر اُردو ادب کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔رضیہ اسماعیل ادبی افق پر ابھرنے والی ایک نئی شاعرہ ضرور ہے لیکن اس کی غزل اور بالخصوص نثر نظم کسی بھی پختہ ادب کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔رضیہ اسماعیل کی غزل اور نثری نظم کا معیار اُردو ادب کے معیار پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے۔رضیہ نے غزل اور نظم ایک جیسی توانائی اور یک جہتی تخلیقی قوت سے لکھی ہے۔غزل رومانی لہجے میں زندگی کے دکھ درد اور ہجر و وصال کے تمام مدارج سے گزر کر اور اِن دکھوں اور راحتوں کو انتہائی شدت سے محسوس کر کے لکھی گئی ہے۔غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔البتہ آزاد نظم سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا اسی صنفِ سخن سے اور اس وقت کی جب اس کی تخلیقی قوت صرف ایک طوفان کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کی کوئی تنظیمی صورت نہیں تھی۔رضیہ نے غالباً اس وقت اپنی تحریری راہیں متعین نہیں کی تھیں اور ہر لکھنے والے کی طرح ابتدا میں صرف لکھا اور لکھا۔تخلیقی بادل آتے رہے، چھاتے رہے اور برستے رہے۔یہ نہیں دیکھا کہ انھیں کن زمینوں پر برسنا ہے اور کتنا برسنا ہے۔اس کے باوجود نظمیں معیار اور فن کی سطح پر آج کی لکھی جانے والی نظموں کی سطح پر ہی لکھی گئی ہیں۔

حیرت کی بات صرف یہ ہے کہ رضیہ نے جو تین اصنافِ سخن اپنے اظہار کا ذریعہ بنائی ہیں، اپنے موضوعات کے اعتبار سے وہ تینوں اصناف قطعی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غزل انتہائی رومانی لہجے میں کہی گئی ہے اور اس کے موضوعات بھی زیادہ تر ہجر و وصال کی مختلف کیفیات کے مظہر ہیں۔جب کہ نثری نظم میں رضیہ اسماعیل نے خاص طور پر عورت کے عورت ہونے پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔عورت کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی شدت سے محسوس کیا ہے۔عورت کا ماں کا مقام اور اس پر احساسِ تفاخر، عورت کی جسمانی طور پر تخلیقی ہونے کے پہلو پر فخر کا احساس، اس کے مظلوم ہونے کا کرب، بیٹی اور بہن ہونے کا ادراک، عورت کی حیثیت سے Exploitation اور عورت کے اپنے مختلف کردار اور اس کے ساتھ معاشرے کے برتاؤ کے بہت سے پہلوؤں پر بڑی قوت سے سخن وری کی ہے۔عورت ہونے کی بدولت عورت کی بقا کے علاوہ عورت کے بانجھ ہونے سے لے کر تصویرِ کائنات میں رنگ ہونے تک کے بہت سے پیکروں کو ان گنت زاویوں سے دیکھا ہے۔جب کہ نظمِ آزاد میں رومانی موضوعات اور عورت کے عورت ہونے کے مضامین کا امتزاج ملتا ہے۔

غزل اور نظم دونوں اپنی کرافٹ اور موضوعات کی طرف شاعرہ کی اپروچ کے اعتبار سے بہت کامیاب تخلیقات ہیں۔

رضیہ اسماعیل صرف اس لئے شاعرہ نہیں ہے کہ وہ پاؤنڈز اور ڈالز خرچ کر کے شاعری خرید سکتی۔نہ صرف وہ اس لئے شاعرہ ہے کہ وہ ان خواتین میں سے ہے جو جب چاہیں، جس شاعر سے چاہیں، اس کی شاعری اپنے نسوانی ہتھکنڈوں سے ہتھیا کر اپنے نام لگا لیں۔نہ ان خواتین میں سے ہے جو کسی بڑے شاعر کی منہ بولی رشتہ دار بن کر شاعری میں وزن پیدا کر سکتی ہے بلکہ رضیہ اسماعیل اس لئے شاعرہ

ہے کہ وہ ایک اوریجنل (Original) اور جینوئن (Genuine) شاعرہ ہے۔اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے Barriers اگر کراس نہیں کر چکی تو انھیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو (سوائے افتخار نسیم کے) رضیہ اسماعیل سے باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام و مرتبہ پر فائز ہو سکتی ہے۔ میں رضیہ اسماعیل کو برمنگھم کے لکھنے والوں سے اس لئے بھی Compare نہیں کروں گا کہ اس میں بہت سے لکھنے والوں کے ادبی تختے الٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جن میں صرف پردہ نشینوں کے نام ہی نہیں آتے، کئی بے پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ جس طرح میں پاکستان میں شاعری کے حوالے سے آج کل فاخرہ بتول کے ساتھ کسی خاتون کا نام نہیں لے سکتا اسی طرح مجھے انگلستان میں بھی رضیہ اسماعیل اور یاسمین حبیب کے ساتھ کسی اور کا نام لینا اچھا نہیں لگتا، سوائے اقبال نوید کے۔

عین ممکن ہے انگلستان میں رہنے والے رضیہ اسماعیل کے بارے میں میری اس رائے پر حیرت کا اظہار کریں۔ میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں کہ جس سرعت کے ساتھ رضیہ اسماعیل نے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے مجھے بذاتِ خود وہاں کے احباب سے زیادہ حیرت ہے۔ رضیہ اسماعیل کے یہ Literary leaps and bounces حقیقی طور پر اتنے حیران کن ہیں کہ میں اپنے اس Unique تجربے کو لفظوں میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ پس یوں لگا کہ سوئچ آن کر دیا اور ایک سیکنڈ میں روشنی ہو گئی۔ اگر رضیہ اسماعیل کا یہ تخلیقی سفر میری وہاں موجودگی ہی میں طے نہ ہو پاتا تو میں کسی بھی شاعر یا شاعرہ کی اتنے حیرت ناک Fast progress پر کبھی یقین نہ کرتا۔ اور مجھے اس پر اس بنا پر بھی یقین کرنا پڑا کہ میں نے ایسا ہی ایک کرشمہ فاخرہ بتول کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ اور یاسمین حبیب کو بھی آدھے پونے گھنٹے میں ایک بے پناہ قسم کی غزل کہتے ہوئے دیکھنے کی قسمیہ گواہی دے سکتا ہوں۔ بلکہ رضیہ اسماعیل نے جو مکالماتی غزلیں کہی ہیں وہ میری اور فاخرہ بتول کی مکالماتی غزلوں کے بہت قریب دکھائی دیتی ہیں اور میرے مصرعوں پر گرہیں لگا کر جو غزل اس نے Complete کی ہے، مجھے وہ اپنی مکالماتی غزل سے بھی بہتر محسوس ہوئی ہے۔ اور اس نے بغیر کسی خوف اور کمپلیکس کے وہ مکالماتی غزلیں بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنے سے اس پر بہت سے الزامات آ جانے کا اندیشہ ہی نہیں ایک خطرہ بھی ہے لیکن جینوئن لوگوں کو ایسی باتوں کی نہ کبھی پروا ہوتی ہے اور نہ ہو گی۔ اسی لئے میں نے بھی اس کتاب کا دیباچہ لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

میں اس کتاب کو بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ، ادبی افق پر کسی غروب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ ایک طلوع ہوتے ہوئے سورج کی حیثیت سے پیش کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے ساتھ میرے جتنے بھی ادبی Sessions ہوئے ہیں، ان کے جواب میں اس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

شعر پھولوں کی طرح ضرور ہوتے ہیں لیکن شاعری کی پیچیدگیاں کانٹوں سے کم ہر گز نہیں ہوتیں۔

اور رضیہ اسماعیل کو حقیقتاً ان کانٹوں پر چلنا آ گیا ہے۔ میں اس کتاب پر رضیہ اسماعیل کو پہلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس کے میاں اسماعیل اعظم سے جو میرا بہت پیارا دوست ہے، توقع رکھتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تنقیدی تحریری کو باقاعدہ طور پر کتابی صورت میں ڈھالنے کا ارادہ کر لے۔ یہ تحریریں بھی نئی تنقید میں یقینی طور پر ایک ادبی اضافہ ہوں گی۔ اس ضمن میں وہ جتنی بار چاہے میرے ساتھ وزیر آباد کے ڈبے میں بیٹھ کر پورے اُردو تنقیدی لٹریچر کے بخیے ادھیڑ سکتا ہے۔ میں اس کے لئے وقت نکالنے کے لئے تیار ہوں اور رضیہ اسماعیل کو اجازت دے کہ وہ کچن سے نکل کر اپنی اگلی کتاب پر یکسوئی سے کام کرے۔ میں اس دیباچے کے انتہائی نجی اختتام پر قارئین کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں تا کہ وہ میری معذرت اور اس دیباچے دونوں کو قبول کر لیں۔

ایک نئی شعری تہذیب

○

ڈاکٹر علی اکبر منصور

رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور درد کے مماثل ہے، جو ہستی کے مماثل ہے۔ عورت کا یہ عالم گیر تصور اسے تمام خواتین شعرا میں ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان، اسلوب اور موضوعات س کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتے ہیں۔ گویا اکا ذاتی شعور اتنا پختہ ہے، ہمہ جہت اور مکمل ہے کہ اسے کسی خارجی نعرے کے سہارے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کی تمام شاعری میں جذبے، احساس اور معنویت کی غیر ممیّز فراوانی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک مکمل فکری (Thesis) موجود ہے لیکن یہ فکر، یہ فلسفہ چوں کہ رضیہ اسماعیل کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتا ہے اس لئے کہیں بھی کو ملتا اور احساس سے عاری نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں عورت کے ہر روپ کی واردات اور شدتِ احساس زندہ ہے۔ اس کی فکر سے جذبہ پھوٹتا ہے اور جذبے سے فکر و فلسفہ۔ اگر چہ رضیہ اسماعیل کے ہاں ہیئت (Structure) ابھی اپنی پختگی کو مکمل طور پر نہیں پہنچے لیکن یہی امر شاید اس کے اندر نئی ہیئتوں کی تخلیق کا بعث بن جائے۔ اس کے ہاں بعض بنیادی فلسفیانہ موضوعات اور سوالات اور پھر ان کے فکری جوابات ایک ساتھ ذاتی واردات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

عورت، خوشبو اور نماز

بشریٰ رحمٰن
(لاہور)

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تحریریں پڑھ کر ایک واضح تاثر بنتا ہے جسے میں کچھ یوں بیان کروں گی کہ جب لڑکی کی شادی ہو جائے، چاہے وہ کسی فقیر سے ہو، بادشاہ سے ہو، گلی محلے میں ہو یا کسی دور دراز شہر میں یا ملک میں ہو جائے ،مگر عورت کے دل سے میکہ کبھی نہیں نکلتا۔ میکہ اس کے اندر یوں بسا رہتا ہے جیسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں۔ میکے کا تصور اس کے دل کا طواف کرتا رہتا ہے۔ رضیہ کی شاعری میں دو تصورات بڑے واضح ہیں۔ یعنی ایک میکے کا تصور اور دوسرا پاکستانیت۔ اب جب کہ رضیہ اسماعیل برطانیہ میں رہتی ہیں تو پاکستان ان کا میکہ ہے۔ ان کی پوری شاعری اپنی زمین اور اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہے۔ جب وہ اپنی زمین اور مٹی سے جڑی ہوئی شاعری کرتی ہیں تو پھر انھیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی اپنی عورت نظر آتی ہے۔ اور وہ عورت کے جذبات و احساسات کو ایک عورت بن کر بیان کرتی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کو عورت ہونا اچھا لگتا ہے۔ انھوں نے اپنی نثر یا شاعری میں کہیں یہ نہیں کہا کہ کاش میں عورت نہ ہوتی۔ عورت ہونا ایک بہت خوب صورت بات ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے آپ کی دنیا میں عورت، خوشبو اور نماز پسند ہے۔ یہ بات اسی ترتیب سے کہی گئی ہے۔ اپنی کم علمی کے باوجود جب میں غور و خوض کرتی ہوں تو مجھے عورت کے سلسلے کی ساری وضاحتیں، خوشبو اور عبادت سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ عورت جہاں بیٹھتی ہے، اپنے وجود کی، اپنے کردار کی خوشبو لے کر بیٹھتی ہے۔ جس گھر کو آباد کرتی ہے، عبادت کے ساتھ آباد کرتی ہے اور وہ گھر عبادت گاہ بن جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عورت کا دکھ کیا ہے؟ ''میں عورت ہوں'' کے پیش لفظ میں رضیہ لکھتی ہیں: ''عورت کی جسمانی ضرورتیں پوری کر کے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ مگر نماز میں فرضوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل بھی ہوتے ہیں۔'' میں ان کے بہت گہرے فقرے کے جواب میں یہ کہوں گی کہ زیادہ تر لوگ تو فرض نمازیں ہی ادا نہیں کرتے تو سنت اور نوافل کی فکر کون کرے گا؟

ایک مرتبہ ایک غیر ملکی سفر میں کسی کانفرنس کی غرض سے جاتے ہوئے ایک مولانا صاحب سے عورتوں کے حقوق کی بات چل نکلی تو انھوں نے ایک خوب صورت بات کہی کہ آپ پاکستان یا دنیا بھر میں عورتوں کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے اندر جس عورت کو اس کے شوہر نے کبھی تھپڑ نہیں مارا اس عورت کے سارے حقوق ادا ہو گئے۔ یہ اتنا دردناک فقرہ تھا کہ جس پر میں نہ ہنس سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ رضیہ نے بھی بہت ہی خوبصورت باتیں، بہت ہی خوب صورت اشعار لکھے ہیں جن پر نہ ہنس سکتے ہیں اور نہ رو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہمیں اب اس مقام سے نکل کر اکیسویں صدی کی بات کرنا ہو گی۔ اگر دیکھا جائے تو عام طور پر ہمیں دو قسم کی عورتیں ملیں گی۔ ایک مجبور، محکوم اور پسی ہوئی عورت اور دوسری باغی عورت۔ مگر جس عورت کی بات رضیہ اسماعیل کر رہی ہیں وہ نہ مجبور ہے نہ مظلوم، نہ محکوم بلکہ وہ اصلی عورت ہے۔ وہ عورت کا اصلی چہرہ ہے جو اگر ماں ہو تو قدموں تلے جنت ہے، بیوی ہو تو شوہر کو سرتاج سمجھتی ہے۔ بہن ہو تو بھائی اس کا غرور ہے اور بیٹی کو دل کا سرور سمجھتی ہے۔ وہ ان چاروں حوالوں کو خوشی کے حوالے کہتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ عورت کے یہ چاروں حوالے اس کے حقوق کی بات کہاں تک کرتے ہیں؟ عورت کو درد کی دولت ملی ہے اور کچھ وافر ہی ملی ہے۔ اب اگر قدرت نے یہ دولت عورت کو عطا کر ہی دی ہے تو پھر قدرت سے کیا کہنا۔ اس کا انعام سمجھ کر اپنے پاس رکھ لینا چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کی ساری کی ساری شاعری خوب صورت ہے جس میں شدتِ احساس ہے۔ ایک عجیب سا انتظار ہے، ایک گہری اداسی ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس طرح جیسے کوئی چیز دوپٹے کے پلو سے باندھ کر گرہ لگائی جائے تا کہ ہمیشہ یاد دلاتی رہے کہ شمیں اداس بھی رہنا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں کہیں منافرت نہیں ہے، کہیں منافقت نہیں ہے، کہیں نفرت نہیں ہے۔ انھوں نے اس قسم کی باغیانہ شاعری نہیں کی۔ انھوں نے چاند، سورج اور ستارے نہیں مانگے۔ صرف اپنے وجود کی شناخت مانگی ہے۔ اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے جو ہر عورت مانگتی آئی ہے، جو اس کا حق ہے اور اس صدی کے مردوں کو وہ شعور ہے کہ اسے اس کا حق دے سکیں۔

دو حصوں میں بٹی ہوئی عورتوں کے قبیلے میں ہم لکھنے لکھانے والی عورتیں اس پس ماندہ عورت کی بات کرتی ہیں۔ اگر ہم اس عورت کی بات نہیں کریں گی تو پھر کون کرے گا؟ ایسی عورت کے حق کی بات بھی ہمیں ہی کرنی ہے جسے علی الصبح چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے اور رات کو لات مار کر سلایا جاتا ہے۔ ان کی بات بھی ہمیں دوسروں تک پہنچانی ہے۔ اس مرد کے اندر روشنی بھی ہمیں ہی جگانی ہے۔ جب ہم ایسی چیزیں لکھیں گی اور دوسروں تک پہنچیں گی تو معلوم ہو گا کہ عورت کیا مانگتی ہے۔ اس نے بے مہار آزادی تو نہیں مانگی۔ اگر اس نے محبت کی ہے اور فنا ہونے کی ڈگر پر چلی ہے تو کہہ رہی ہے کہ میں تو خود ہی فنا ہونے کے لئے بنی ہوں۔ تم کیوں فنا کرتے ہو؟ دراصل محبتوں میں بھی کچھ لین دین ہوتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں مردوں کی طرف سے کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ''یہ آگہی میری مجھے بے قرار رکھتی ہے''..... رضیہ اسماعیل کے پاس آگہی بھی ہے، خوب صورت تحریر بھی ہے، محبت ہے، شدتِ احساس ہے۔ ان کی شاعری میں جو سادگی، سچائی اور احساسِ آگہی ہے وہ سیدھا دل پر جا لگتا ہے۔ انھوں نے بہت سی خوب صورت نظمیں اور اشعار کہے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک

نظم تحریر کرتی ہوں:

تحریر
لکھو ، اتنا لکھو
یہ زندگی تحریر بن جائے
کسی کاغذ کے ٹکڑے پر
کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے!
لکھو ایسے کہ حرفوں سے
کسی ماہر مصوّر کی کوئی تصویر بن جائے!
ترے لفظوں میں وہ تاثیر ہو
جو پاؤں کی زنجیر بن جائے!
انڈیلو دل کا سارا درد
تم کاغذ کے ٹکڑوں پر
کوئی فقرہ قلم سے روٹھ کر کچھ اس طرح نکلے
کسی نادیدہ کل کی قیمتی جاگیر بن جائے!

ایک اور نظم ''تجھے دنیا میں رہنا ہے'' میں محبت جب شکوہ کرتی ہے کہ میں دنیا میں کیوں آئی تو جواب دیتی ہیں کہ:

کہا میں نے محبت تو بہت نازک
بہت پاکیزہ جذبہ ہے
یہ اتنی تلخیاں لے کر بہت سے دُکھ سمیٹے
کیسے اب خالق سے تو نظریں ملائے گی؟
ترا مذہب نہیں نفرت
زمانہ تجھ سے کتنا تلخ ہو جائے
تجھے نفرت کے گھر میں قید کر ڈالے
تمھاری نوچ کر آنکھیں
تمھیں برباد کر ڈالے
ترے تن پر، ترے من پر
ہزاروں زخم آ جائیں
تو چاہے کتنی گھائل ہو
تجھے دنیا میں رہنا ہے
سبھی کا درد سہنا ہے
یہی تقدیر ہے تیری
یہی حکمِ الٰہی ہے!

ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ

کس جبر سے جیتی مرے دیس کی عورت
تھوڑی سی سہی ، دادِ وفا کیوں نہیں دیتے

بس تھوڑی سی دادِ وفا، تھوڑی سی محبت کی طالب ہے۔ کیوں کہ خود عورت کے پاس وفا اور محبت کے ضمن میں دینے کو بہت کچھ ہے۔ وہ سخی ہے، دریا دل ہے مگر تھوڑی سی بات کہیں انکی ہوئی ہے۔ عورت کو محبت کرنے کو، سخاوت کرنے کو، اپنی روشنیاں بکھیرے دینے کو، اپنے آپ کو لٹا دینے کو، گھروں کو آباد کر دینے کو، رسوئی میں خوشبو پھیلا دینے کو۔ اس کا کام یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بس اسی سب کچھ کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ یہ سب اس نے اپنی مرضی، اپنی رضا سے حاصل کیا ہے، تسلیم کیا ہے، مگر ایک بات ضرور ہے کہ سارے ہنستے بستے گھر صرف عورت کے دم ہی سے آباد ہیں۔ جہاں عورت اکڑ گئی، گھر آباد نہیں ہوئے۔ جہاں عورت نے برضا و رغبت سر جھکایا ہے، سر گرایا ہے، انہی گھروں میں سرِ شام خوشبودار دھواں اٹھتا ہے۔ پکوان پکتے ہیں اور سارے مرد دوڑ دوڑ کر گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ سارے گھر اگر عورت کی وجہ سے آباد ہیں تو سارے شہر مردوں کی وجہ سے آباد ہیں۔ ان عورتوں نے مردوں کو تسلیم کر کے ثابت و سالم کھڑا کر دیا ہے ستونوں کی طرح۔ یہ عورت صبح دم اپنے گھر کا دروازہ کھول کر کہتی ہی کہ جاؤ اور سارے زمانے سے لڑو۔ میں سارا دن تمھارے بچوں کے ساتھ پگھلوں گی اور جب تم سرِ شام آؤ گے تو موتیوں کے ہار گوندھ کر تمھارا استقبال کروں گی۔ جس گھر میں شام کو شوہر نہیں آتا وہ گھر بڑا اداس ہوتا ہے۔ اس گھر کے در و دیوار روتے ہیں۔ اس گھر کے بچے چیختے ہیں۔ اس گھر کی عورت کے ماتھے پر کئی شکنیں ہوتی ہیں۔ یہ آمد و رفت کا عجیب سلسلہ ہے کہ عورت صبح دونوں ہاتھوں سے جسے دنیا کے حوالے کرتی ہے، شام کو وہ اپنے سلگتے سانسوں کے ساتھ اسے وصول کرنا چاہتا ہے۔ گھر کو سجاتی ہے، سنوارتی ہے، یہ گھر ہی اس کی کائنات ہے۔ اس کا سب کچھ ہے۔ جب گھر کے اندر گھر والا آ جاتا ہے تو یہی گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ مگر بہت سے گھر ایسے بھی ہیں جہاں مرد کہتے ہیں کہ نہ دوں تو تجھے روٹی نہ ملے۔ میں نہ دوں تو تجھے کپڑا نہ ملے اور چاہوں تو چوٹی سے پکڑ کر باہر نکال دوں۔ یہ ڈرامے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹے چھوٹے حادثے، رنجشیں بن جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دوستی جاتی رہتی ہے مگر یہ رنجشیں، یہ فقرے گھروں کا سکون لے جاتے ہیں۔ ہم ساری عورتیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے روشنی عطا کی ہے اور وارثوں کی تائید ملی ہے، علم و آگہی کی مشعل لے کر نکلی ہیں تا کہ دلوں کو دلوں سے جوڑ دیں۔ گھروں کو گھروں سے جوڑ دیں۔ رنجشیں بھول جائیں اور دکھ نہ دینے کا ارادہ کریں۔ کیوں کہ ایک دل ٹوٹتا ہے تو ایک گھر ٹوٹتا ہے، ایک گھر ٹوٹتا ہے تو ایک خاندان ٹوٹتا ہے۔ ایک خاندان ٹوٹتا ہے تو ایک محلّہ ٹوٹتا ہے۔ ایک محلّہ ٹوٹتا ہے تو ایک شہر ٹوٹتا ہے۔ اور ٹوٹنے کے یہ سلسلے بہت دور تک نکل جاتے ہیں۔ بات سوچنے کی ہے اور ہم سب کو مل کر سوچنا چاہیے کہ ہم آج تک ایک قوم کیوں نہیں بن سکے۔ میں کہتی ہوں کہ تم عورتوں کو گھروں کے اندر عزتِ نفس دے دو، محبت کی چادر اوڑھا دو، اسے عورت پن دے دو، اس کی عزت کراؤ، قوم ایک قوم بن جائے گی۔ جب عورت کو گھر کے اندر قبول نہیں کیا جاتا، اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا تو وہ اپنی شناخت کے لئے گھر سے دور ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں ٹریفک کے موضوع پر آئی جی پولیس سے بات ہورہی تھی تو میں نے کہا کہ عورتوں کو عزتِ نفس دے دیں، ہماری ٹریفک ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ حیرانی سے پوچھنے لگے کہ وہ کیسے ہوگا؟ میں نے کہا کہ گھروں میں چار، چھ، آٹھ یا دس بچے ہوتے ہیں۔ ہم بھی بہت بہن بھائی تھے۔ گھر کی ساری ٹریفک کا انتظام ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سکھاتی تھی کہ ٹریفک درست کیسے رکھنی ہے، کون کہاں بیٹھے گا، کھانا کس کو پہلے ملے گا، روٹی کون بنائے گا، برتن کون صاف کرے گا، باپ کے آگے کون چیز رکھے گا، سکول جانے سے پہلے کیا ہوگا، سکول سے آ کر کیا ہوگا تو یہ سب ٹریفک گھر میں پہلے ماں سکھاتی تھی۔ اب لوگ ماں کو بھول گئے ہیں، اسے تلاش نہیں کرتے، ماں کو نہیں ڈھونڈتے، اس کے قدموں تلے جنت بھی نہیں کھوجتے، اس کے پیچھے پیچھے نہیں دوڑتے۔ اب تو صرف رکشے کے پیچھے لکھا ہوا نظر آتا ہے..... ''ماں کی دعا، جنت کی ہوا'' اور ماں رکشے کے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ ابھی ہمیں ماؤں کی بہت ضرورت ہے۔ گداز دل ،محبت کرنے والی مائیں اور جب یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو رضیہ اسماعیل بھی ایسی اداس شاعری نہیں کرے گی۔ مثلاً

سُکھ کا دُکھ
میں دُکھ کے راستے پر
چلتے چلتے تھک گئی ہوں
مِرے پاؤں کے چھالے
ہر گھڑی فریاد کرتے ہیں
کسی دُکھ میں چھپے
چھوٹے سے سُکھ کو یاد کرتے ہیں
مِرے اندر کی وہ سہمی ہوئی عورت
مقیدِ جسم کے تاریک کمرے میں
پھٹی آنکھوں سے ہر لمحہ
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ
کھلنے کی صدا کی منتظر
اب تھک گئی ہے
تھک گئی ہے اب.....

چشمِ نم۔۔۔چشمِ حیراں

رضیہ اسماعیل جو ایک عورت ہے، ایک ماں ہے، سراپا درد ہے۔ ہر درد، ہر کرب اس کو ممتا نے بخشا ہے، جو تخلیق کار ہے اور تخلیق بنا کرب کے ناممکن ہے۔ درد نے اس کو چشمِ نم اور چشمِ حیراں عطا کی ہے۔ نمی کے اس جھلملاتے سمندر میں منظر اور پس منظر کبھی واضح ہو جاتے ہیں، کبھی دھندلا جاتے ہیں۔ تصویریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ آہو چشم رضیہ چشمِ حیراں کے سہارے جستجو کے زینے تیزی سے طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ تلاش منزل کی ہے یا اس سے بھی آگے کی یا منزل بے معنی ہے؟ جانے کیا ہے، جس نے اسے آمادۂ سفر کر رکھا ہے؟ وہ پا بجولاں دشت نوردی پر نکلی ہے۔ راستے میں بکھرے ہوئے کانٹے، کنکر، کرچیاں اس کو زخمی کر رہے ہیں۔ تاریک راہوں کے اندر کی روشن آنکھ متلاشی رضیہ کے ساتھ قطب ستارے کی طرح ہے۔ اس سفر میں اس کی چشمِ بینا نے کیا کیا نہ دیکھا۔ تلخیاں، دُکھ کے پھیلے ہوئے ساگر، یہاں تک کہ تلخ حقیقتوں کی کڑواہٹ اس کے اندر تک سرایت کر گئی۔ ظلمتوں نے اس کی باطن کی آنکھ کو روشن کر دیا اور سب کچھ اس کے اندر مٹ آیا۔ باطن روشن ہوا تو آنکھ میں وسعت آ گئی اور آخر رضیہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

ڈاکٹر شہناز مزمل

ایک حوصلہ مند شاعرہ

رضیہ اسماعیل کے ذہن پر بچپن کے تاثرات بہت گہرے ہیں۔ گاؤں کی کھلی فضا، لہلہاتے کھیت، بہتی ندیاں، تاروں بھری راتوں کی مسحور کن فضا میں بالخصوص تہجد کے وقت ان کے والد کے ''اللہ ہُو'' کے دل کش ورد نے رضیہ کو بہت متاثر کیا۔ کم سن لڑکی رضیہ کے ذہن میں اس کے اطراف ونواح کے ماحول سے جنم پانے والے سوالات نے اس میں غور وفکر کی عادت ڈال دی۔ لیکن ان کا جواب اسے بہت بعد میں ملا۔

رضیہ اسماعیل نے صنفِ شاعری میں غزل کے ساتھ نظم (آزاد، پابند اور نثری) کے علاوہ ماہیے اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی پہلی شعری کاوش تھی جس کے بعد ۲۰۰۱ء میں ان کی تین کتابیں نظموں کا مجموعہ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''، ماہیوں کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں میں'' اور نثری نظموں کا مجموعہ انگریزی تراجم کے ساتھ ''میں عورت ہوں'' شائع ہوا۔ رضیہ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے لکھے، اردو اور انگریزی میں مختصر دورانیے کے سٹیج ڈرامے لکھے۔ کالم نویسی اور رپورتاژ بھی کی۔ مگر طبیعت کی روانی انشاپردازی اور ہلکے پھلکے طنز ومزاح کی طرف مائل رہی۔ چناں چہ ۲۰۰۰ء میں ''چاند میں چڑیلیں'' کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا۔

سلطانہ مہر

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو

شبنم شکیل

(●)

پوری دنیا میں عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا گیا۔ کیوں کہ یہ معاشرہ مرد کا بنایا ہوا ہے۔ چناں چہ آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو خود مرد کے تشکیل کردہ فنونِ لطیفہ کے تمام شہکاروں میں عورت روح بن کر رہتی ہے لیکن عورت اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل پر خود کچھ تخلیق کرے، یہ عمل گویا ہجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوچ عورت کے لئے ایک ایسا پھل رہی ہے کہ جسے کھا کر اسے اپنی گھریلو جنت سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ شاعری میں بھی وہ موضوع تو بن سکتی ہے لیکن خود اس کا شاعری کرنا خواب و خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔ مگر تخلیق کا شعلہ کہاں تک چھپا رہ سکتا ہے۔ بہارستان، حکیم فصیح کا وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں ایک سو چوہتر (۱۷۴) شاعرات کا نمونہ کلام شامل ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب شاعرات مذکر کے صیغے میں بات کرتی ہیں۔ اس تمہید سے قطع نظر خوب صورت بات یہ ہے کہ پچھلی تقریباً چار دہائیوں سے شاعرات نے اس میدان میں آ کر ایسی دھومیں مچائی ہیں کہ اگلی پچھلی سب کسر نکل گئی ہے۔ گویا عورت کو زبان مل گئی ہے۔ پہلی دفعہ عورت کی شاعری میں اس کی شخصیت ایک واضح انداز میں ظاہر ہوئی۔ انتہائی ذہین اور منفرد سوچ رکھنے والی خواتین اپنی شاعری لے کر وارد ہوئیں اور اپنی ذات کے دھارے کے اندر بند نہیں رہیں بلکہ اجتماعی شعور کے حوالے سے بات کی۔ اس معاشرے کے منافقانہ رویے، دہرے معیار اور مجرمانہ مصلحت آمیزی پر کھل کر بات کی۔ ذاتی واردات نے عصری تقاضوں کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ اختیار کیا اور پھر اس پر لکھنے والی ایک عورت کو، جو کسی کے دکھ کو ایسے محسوس کرتی ہے، ایسے سمجھتی ہے کہ جیسے زمین اپنے اوپر بسنے والی تمام مخلوق کو جانتی ہے۔ رضیہ اسماعیل بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کی شکل میں ان کے شعری مجموعے میں بھی ذاتی واردات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی ناآسودگی، بے انصافی، محرومی اور مظلومیت ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ ان کے مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ہیں۔ ان کی غزلیات کا تذکرہ پہلے کرتی ہوں، وہ اس لئے کہ ان کی غزل سے بھی نظم کا تاثر ابھرتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اصلی میدان نظم ہے۔ جہاں تک ان کی غزل کا تعلق ہے، اس میں ایک ایسی تازگی ہے جو بہت کم نئے لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ شعر میں آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

تجھے پا کر بھی یہ دل ڈھونڈتا رہتا ہے تجھے
تو مرے پاس بھی یوں کھویا ہوا ہوتا ہے

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

اک لفظ بھی نظر نہیں آتا کتاب میں
یہ کیا لکھا ہوا ہے محبت کے باب میں

بظاہر ان اشعار کے پڑھنے کے بعد گماں گزرتا ہے کہ وہ ایک رومانی شاعرہ ہوگی۔ اس کے اشعار ایسے ہی ہوں گے کہ جس طرح جوانی میں دوسرے شاعروں کے ہوتے ہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال رضیہ کی غزل رومانیت سے جدیدیت کی طرف سفر کر رہی ہے اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔ اس کی نظم بھی اس خوبی سے مزین ہے۔ جو چیز اس کے شعری مجموعے میں پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رضیہ اسماعیل کی نظموں کے موضوعات اور اس کا ٹریٹمنٹ ہے۔ عورت کا دکھ محسوس کرنا تو کوئی غیر معمولی نہیں لیکن انھیں اپنے پڑھنے والوں کے لئے ایک تیسری جہت (ڈائمینشن) کی صورت میں پیش کرنا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کی نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے باطن کی عورت زندہ ہے اور کتنی زندہ ہے۔ یہ بھی احساس جاگتا ہے کہ باوجود تمام دکھوں اور محرومیوں کے، کہ جو قدرت نے اور کچھ اس معاشرے نے عورت کے لئے روا رکھے ہیں، رضیہ اسماعیل کی شاعری امید کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ یہ روشنی ایسی نہیں جو آنکھوں کو چکا چوند کر دے، یہ تو بہت ہی دھیمی، دل کو سکون بخشنے والی اور ذہن میں نئے خواب جگانے والی روشنی ہے۔ یہ اس کی نظموں میں آپ کو بین السطور نظر آتی ہے اور پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ اتنا کچھ برداشت کرنے کے باوجود بھی رضیہ اسماعیل نے اپنے آپ کو Dissilluend نہیں ہونے دیا۔ ورنہ ''تشنہ لب''، ''بن بیاہی''، ''شہر کے خواب''، ''ننگے پاؤں''، ''بانجھ''، ''نئی زمین'' اور ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' جیسی نظموں کو لکھنے کے بعد کسی بھی حساس انسان کا Dissilluend ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ لیکن اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ''میں زندہ رہوں گی'' جیسی نظم کہہ سکتی ہے۔ اس کی ایک نثری نظم ہے ''خوش قسمت'' ملاحظہ کیجئے۔

خوش قسمت
ہم خوش قسمت ہیں

''چہارسُو''

ہمارے کتنے ہی نام ہیں
مجبور عورتیں، محصور عورتیں
لاچار عورتیں، ریاکار عورتیں
گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں
کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں
بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں
ہم ناشکری
ہم مسلی ہوئی
دھتکاری ہوئی
بیسوا!

بے وفا، بے نشاں
بے حیا، بے اماں عورتیں
مگر
ہمارا ایک ہی نام
کائنات کے سب ناموں پر بھاری ہے
''ماں عورتیں''.....!

اسی ایک نظم سے آپ کو رضیہ کے سوچنے کے انداز اور زندگی کی طرف سے اس کا رویہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ بات کہنے کا سلیقہ بھی جانتی ہے۔

☆

مشرق کی بیٹی

رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں طنز و مزاح کا چسکا بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جو ملک سے باہر رہتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کی صورت میں انھوں نے ''چاند میں چڑیلیں'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔

وطن میں رہتے ہوئے زندگی کو محسوس کرنے اور برتنے کا سلیقہ اور انداز اور ہو سکتا ہے، جب کہ وطن سے دور اجنبی تہذیب میں اپنی روایات اور قدروں کے حوالے سے بات کرنے کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ وطن میں گلی، محلے اور ارد گرد کی چیزوں کا احساس کچھ اور ہے جب کہ وطن سے دور رہتے ہوئے اگر یہاں کی خوب صورتیاں یاد آتی ہیں تو منسی رویے بھی یادگار ہوتے ہیں۔ یہاں کے گندے جوہڑ، تنگ و تاریک گلیاں اور غلاظتیں بھی مثبت رویوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کے ماہیے پڑھتے ہوئے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب تک جتنی بھی پنجابی اور اُردو ماہیوں کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان سب میں عموماً ایک ہی رو میں، ایک ہی طرح کے ماہیے کہے گئے ہیں۔ مگر رضیہ اسماعیل نے ماہیے کی ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے اپنی کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔

ڈاکٹر حسن رضوی

ایک نظریاتی شاعرہ

رضیہ اسماعیل دنیائے شعر میں یک دم نمودار ہوئی ہیں اور اُردو شاعری کے سنجیدہ قاری کو حیران کر گئی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی اور انسانی معاشرتی پیچیدگیوں کا اتنا عمیق اور باریک مشاہدہ نظر آتا ہے اور پھر ایسے شاعرانہ انداز میں نظر آتا ہے کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کے موضوعات میں عورت کی محرومیاں اور عورت کے ساتھ ہونے والی تہذیبی ناانصافیاں نمایاں موضوع کے طور پر ملتی ہیں۔ عورت کی بے کسی اور بے بسی کا درد دنیا بھر کی نسوانی تحاریک کی طرح مرد سے نفرت کے اظہار کا باعث بننے کی بجائے زمانے اور فطرت سے انصاف کا طالب ہوتا ہے اور اپنے اندر رشتوں کی تفریق پر نوحہ کناں ہو کر شاعرانہ فرائض کی بجا آوری کا موجب ٹھہرتا ہے۔ رضیہ اسماعیل بجا طور پر نظم بلکہ جدید نظم کی شاعرہ ہیں اور اپنے اسلوب، موضوعات اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے بہت مختلف اور جدا نظر آتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی وہ روحانی اور متصوّفانہ موضوعات کی طرف بھی آئیں گی اور پھر ان کی شاعری کی آخری جہت (Final Dimention) کا مرحلہ اس کے بعد ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہماری شاعری کو بجا طور مالا مال (Enrich) پر کیا ہے۔

فرحت عباس شاہ

آدھی چار کے پورے رنگ

حیدر قریشی
(جرمنی)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل، نظم، ماہیا، دوہے، وغیرہ) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔ تنقیدی وتعارفی مضامین اور طنز ومزاح پر مشتمل تحریریں وہ ایک عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، پھر ان کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والا کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے''۔ یہ ساری شعری ونثری نگارشات میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آرہا ہوں۔ اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر شائع ہونے جارہا ہے۔ اس کی ان پیج فائل میرے سامنے ہے۔ میں اس مجموعہ کے سارے افسانے پڑھ چکا ہوں اور اب ان کے بارے اپنی رائے دے سکتا ہوں۔ پہلے میں ترتیب وار ہر افسانے کا ممکنہ اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا اور آخر میں سارے افسانوں پر اپنی مجموعی رائے بیان کردوں گا۔

''روشنی کا تعاقب'' صوفیانہ خیالات سے لبریز انسان کی خارجی خباثتوں اور داخلی خوبصورتیوں کی دلچسپ کہانی ہے۔ فرانز کافکا کی کہانی کی طرح رضیہ اسماعیل مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کے عمل سے ایسے گزرتی ہیں کہ خود دیکھنے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی مٹھی بھر زندگی قریب سے دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی زندگی جہاں بہت سارے کہے اور ان کہے سوال ہیں اور سوالوں کے اندر ہی کہیں ان کے جوابوں کی روشنی بھی ہے۔

''کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آجاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔'' (روشنی کا تعاقب)

''ہرنام داس''، تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے المیہ کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کہانی کار نے اپنے بچپن کی عمر کی سوچ کو جس طرح اظہار کی زبان دی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ ایسے ایسے معصومانہ سوال جن کے عقب میں زندگی کی مکاریوں کے کتنے راز چھپے ہوئے ہیں۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' (ہرنام داس)

ہرنام داس کے نام کے سحر میں کھوئی معصوم بچی پر جب اپنے والدین کے دکھوں کا راز کھلتا ہے تو تقسیم کے انسانی المیہ کی دوطرفہ المناکی مزید دکھی کرنے لگتی ہے۔

''یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہوگیا۔'' (ہرنام داس)

''سوری'' ویسے تو انگلینڈ میں زندگی گزارنے والوں کی ہلکی پھلکی سی روداد ہے لیکن اس کے پس منظر سے عراق پر امریکی وبرطانوی حملہ کا المیہ ابھرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں سلمان اور سوسن کو اپنا کالج کے زمانے کا جیک یاد آتا ہے۔ بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والا جیک فوج میں چلا گیا تھا اور اسے عراق جنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر پاگل ہو چکا تھا۔ ایک پرانے دوست کا طویل عرصہ کے بعد سامنے آنا اور وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔ لیکن کہانی کے مرکزی کردار کو احساس ہوتا ہے کہ عراق پر ہونے والے بے جا حملے میں شریک ہو کر جیک کا دیوانہ پن درحقیقت اس کا احساسِ گناہ ہے اور اس احساس کے حوالے سے وہ کہانی کے آخر میں کہتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔'' (سوری)

''چھنال'' پہلے دیپک کی ماں ساوتری کی زندگی کی اور پھر دیپک اور جیوتی کی زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں گھریلو زندگی اور ہندوستانی دیہاتوں کا پرانا سماج مثالی مشرقی ماحول کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

''مکئی کا دانہ'' پاکستانی دیہاتوں کے عمومی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ گاؤں کا نمبردار اپنی جاگیر کے زعم میں گاؤں میں محض اس لیے ہسپتال بننے نہیں دیتا کہ گاؤں کے کمی کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ اولادِ نرینہ سے محروم جاگیردار کے ہاں ایک مدت کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے، لیکن شومئی قسمت بڑی بہن اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے منہ میں مکئی کا دانہ ڈال دیتی ہے جو بچے کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔ گاؤں کے کمپوڈر سے بچہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آخر شہر سے اسی کمی کے بیٹے ڈاکٹر عباس کو بلایا جاتا ہے۔ وہ بچے کو اُلٹا کر کے کمر پر ہاتھ مارتا ہے تو مکئی کا دانہ باہر آجاتا ہے۔ لیکن بچہ تو کبھی کا مر چکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار کا وارث دم توڑ چکا تھا اور نمبردار کی رعونت خاک میں مل چکی تھی۔

لُک چھپ جانا
مکئی دادانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے.....لُک چھپ جانا.....

کے الفاظ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے کُکھ کر دیا تھا۔

ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی.....نہ زمانہ رہا.....اور

نہ ہی کائنات۔ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام ونشان کر دیا تھا۔''
(مکئی کا دانہ)

''دیوار گریہ'' ایک خوبصورت لڑکی کی دکھ بھری داستان۔خواتین کے جذبات کی عمومی کہانی۔تاہم اس میں عمومیت کے باوجود کچھ خاص محسوس ہوتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔''
(دیوار گریہ)

''چیچہ وطنی'' پرانے دیہاتی ماحول کی دلچسپ کہانی ہے۔بس ایک روداد سی تھی جسے رضیہ اسماعیل کے اندازِ بیان نے انہماک سے پڑھی جانے والی کہانی بنا دیا ہے۔

دو بیویوں کے شوہر محمد خان کی دوسری بیوی بن جانے والی فاطمہ جٹی سے پہلی ملاقات کا منظر دیکھئے۔

''اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ وسال بھی رک گئی.....لمحے سراسیمہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار گرتے گرتے بچا۔یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔نہ جانے وہ سحے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔''(چیچہ وطنی)

''کیہ جاناں میں کون'' بظاہر ایک فرد کے رقص اور قونیہ میں مولانا روم کے پیروکاروں کے مخصوص صوفیانہ رقص کی منظر کشی سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔لیکن صوفیانہ رمزوں کے کئی اسرار کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھلاتی ہوئی یہ کہانی ایک ایسے ادھورے انسان کی المناک کہانی ہے جسے قدرت نے بناتے ہوئے مکمل نہیں کیا، آدھا، ادھورا رہنے دیا۔نہ مرد بنا، نہ عورت۔کہانی صوفیانہ ماحول سے باہر آتی ہے تو ادب کی فضا چھا جاتی ہے۔اس ادھورے انسان کی دلچسپیوں کا سلسلہ رقص، موسیقی، ادب اور فن کے دوسرے سلسلوں سے بھی کسی نہ کسی طور ملتا جاتا ہے۔دراصل یہ خاکہ نما افسانہ ہے جو افتخار نسیم (افتی نسیم) کی زندگی کی کچھ روداد بیان کرتا ہے اور کچھ افسانہ نگار کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانہ نگار کو افتی سے گہری ہمدردی ہے، لیکن افتی اپنی اضطراری حرکات سے ہر بار افسانہ نگار کو خود سے متنفر کر دیتا ہے۔اس کے باوجود افسانہ نگار کی ہمدردی اس کے لیے کم نہیں ہوتی۔اس خاکہ نما کہانی کے اختتام کا یہ قدرے طویل اقتباس دیکھیں۔

''میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا: "It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا ''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟'' میں نے گویا جرح شروع کر دی۔اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہو سکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔'' میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!'' میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟'' اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا.....شاید اچھا ہی ہوا.....رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟'' میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے.....

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟''
کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔''(کیہ جاناں میں کون)

''باکا''غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کے دو دوستوں کی داستان ہے۔کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان انڈونیشیا کی آزادی سے پہلے وہاں جاپانی فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔جاپانی فوجی وہاں جاسوسی کے شبہے میں پکڑے گئے قیدیوں کے ساتھ جوسلوک کرتی ہے اس کا حال جان کر رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔بلکہ بعض واقعات پڑھ کرتو انسان سوچنے لگتا ہے کہ پھرتو امریکہ کے پاس ایٹم بم گرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔کلکتہ کے خوش حال گھرانے کا ڈاکٹر یونس جاپانیوں کے مظالم کا شکار ہوکر پاگل ہوجاتا ہے۔اس دوران پاکستان بن جاتا ہے اور ڈاکٹر یونس پاکستان کے کسی پاگل خانے تک پہنچادیا جاتا ہے۔وہیں اس کے دیرینہ دوست ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر علاج کے لیے اپنے گھر پر رکھ لیا۔کہانی پڑھنے سے پہلے کہانی کا عنوان''باکا''پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے کہانی کے کسی کردار کا نام مبارک ہوگا لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زبان میں پاگل کو باکا کہتے ہیں۔

''آدھی چادر''برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک نوحہ سا لکھا گیا ہے۔اس میں مشترکہ انسانی قدروں کا ذکر بھی ہے اور شدید سماجی تفاوت کا بیان بھی۔سماجی سطح پر باہم خیر اور بھلائی کے جذبات رکھنے کے باوجود سماجی تضادات کی کشمکش نے تقسیم کے موقعہ پر خونریزی کے المیہ کو جنم دیا۔ان ساری یادوں کو کہیں ادب کے حوالے سے،کہیں جذباتی رنگ میں،کہیں مذہبی شان کے ساتھ اور کہیں سادہ سے عام انسان کی طرح بیان کیا گیا ہے۔تاریخ کے کئی پہلو اس میں نظر انداز بھی ہوئے ہیں تاہم کہانی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے حال تک کو ایک نظر دیکھا گیا ہے اور اچھے مستقبل کی امید بھی کی گئی ہے۔

''تقفس''۔۔۔جیسے ''کیہ جاناں میں کون''خاکہ نما افسانہ ہے ویسے ہی''تقفس''رپورتاژ نما افسانہ ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔جب کوئی لکھنے والا پختہ کار ہوجاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں مختلف اصناف کی آمیزش ایک خاص فنکارانہ مہارت کے ساتھ آسکتی ہے۔رضیہ اسماعیل کی بعض تخلیقات میں ایسا دیکھا جاسکتا ہے۔''تقفس''میں پہلے تو انگلینڈ کے بعض ادبی اداروں اور تنظیموں کا بالواسطہ تعارف کرایا جاتا ہے۔پھر بعض ادبی کرداروں سے ملوایا جاتا ہے۔مختلف ادبی موضوعات پر بحث کے لیے اچٹتے اشارے دیئے جاتے ہیں۔پھر ایک ادبی ورکشاپ کا حال سنایا جاتا ہے۔یہ سب کچھ ایک رپورتاژ کی صورت میں بھی لکھا جاسکتا تھا لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے اندر کے افسانہ نگار سے کام لیتے ہوئے اسے ایک افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

ایک پبلک لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے رضیہ اسماعیل بتاتی ہیں۔

''برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز''(Writers without Borders)کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔''(تقفس)

ادبی گروپ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز''کا نام بڑا خوشنما ہے۔لیکن ابھی تک کی عملی سچی بات یہ ہے کہ تحریریں تو بارڈرز کو کراس کرسکتی ہیں لیکن رائٹرز کو بارڈرز کراس کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔خصوصاً انڈو پاک کے ادیبوں کو ویزے کی رکاوٹیں،دوسرے ملک میں مشکوک نظروں سے دیکھے جانے کی اذیتیں ایسی ہیں جو بارڈرز کی سخت اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہیں اور ادیب کی مجبوری کا بھی۔صرف انڈو پاک ہی میں نہیں اب تو مغربی دنیا میں آنے والوں کو بھی ویسی ہی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔اور لگ بھگ ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے۔سو رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز محض کہنے کی بات ہے۔

ادبی ورکشاپ میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور ایک ترک رائٹر تک ان الفاظ میں پہنچتی ہے۔

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں.....موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں.....بین کرتی ہوئی کہانیاں.....روٹھی ہوئی کہانیاں.....ہاری ہوئی کہانیاں.....مگر ہر لحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں.....کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!''اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔''(تقفس)

''تقفس''میں بنیادی طور پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ جیسے تقفس اپنی آگ میں جل کر راکھ ہوتا ہے اور پھر اسی راکھ سے اس کا نیا جنم ہوتا ہے ویسے ہی جس کہانی کار کی کہانی مکمل نہیں ہوتی وہ پھر اپنی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔اور یوں کہانی کہنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔اس حوالے سے رضیہ اسماعیل نے ورکشاپ کے شرکاء کی مختلف آراء دینے کے ساتھ جوگندر پال کے ایک افسانچے کا اقتباس بھی دیا ہے۔

''ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کررہی تھی۔''(تقفس)

اس کے بعد رضیہ اسماعیل نے جوگندر پال کے افسانچے کا ادھورا سا اقتباس دیا ہے۔اگر یہ پورا افسانچہ درج کردیا جاتا تو''تقفس''کا بار بار اپنی راکھ سے جنم لینے کا بھید زیادہ روشن ہوکر سامنے آجاتا۔یہاں جوگندر پال کا پورا افسانچہ درج کردیتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے،اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ہاں،اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں،میں ہی پریم چند،میں ہی منٹو۔۔۔اور وہ بھی کوئی،جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔

ہاں بابو،میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کرلوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔

نہیں،اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے،اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں،بابو۔''

مغربی دنیا میں مقیم اردو رائٹرز کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی ہیں۔ایک جھلک یہاں پیش کردیتا ہوں۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط و ضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔''
میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' (تقش)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس مجموعہ کی گیارہ کہانیوں کا یہ مختصر سا تعارف تھا۔ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔آپ ایک افسانہ پڑھنا شروع کریں تو اسے ختم کیے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہے۔ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول، پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص۔پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ و جاپان کا کوئی بیان، رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیہ ہی میں نہیں اس ماحول میں بھی پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔یہ مہارت طویل ریاضت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

بیشتر کہانیوں میں انسانی المیوں کے مختلف روپ سامنے آتے جاتے چلے جاتے ہیں۔مختلف کرداروں کی انفرادی نوعیت کے زندگی کے گہرے صدمات سے لے کر، تقسیم برصغیر کے وقت ہونے والا قتل و غارت، عراق میں ہونے والی ہولناک جنگ، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے بعض خوفناک واقعات۔یہ سب المیے جو اِن افسانوں میں بیان کیے گئے ہیں موثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔پھر ان سب کے مقابلہ میں انسانی اقدار کو اجاگر کرتے ہوئے صوفیانہ روایات سے عمدہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس دھرتی کے انسانوں کے لیے امید کی روشنی دکھائی گئی ہے۔سو براہِ راست کسی نوعیت کی پیغام رسانی نہ کرتے ہوئے بھی رضیہ اسماعیل کے افسانے آج کے گلوبل انسان کے مسائل کو ماضی کے مختلف علاقوں کے مسائل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔پھر وہ انہیں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں انسانی مستقبل کے انسان کے لیے پیار اور محبت کی وہ روشنی دکھاتے ہیں جو دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

ایک حساس اور دردمند روح

رضیہ اسماعیل شاعرہ بھی ہیں اور ادیبہ بھی۔نثر میں کمال کرتی ہیں۔ طنز و مزاح میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔اُردو ماہیے کو انگلستان میں رضیہ اسماعیل نے بہت تقویت پہنچائی ہے۔ وہ برطانیہ میں پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون ہیں۔ رضیہ اسماعیل خدا کے فضل اور اپنی محنتِ شاقہ سے اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہوگئی ہیں۔ان کے ادبی رجحان سے ہٹ کر ان میں روحانیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا فوق العموم مشاہدہ ہوتا ہے۔محسوس یوں ہوتا ہے کہ ان کو دلِ پُر درد، چشمِ بینا اور طبعِ نازک دے کر ہوقسم کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔آج کل کی انٹرنیٹ کی دنیا میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی ویب سائٹ (www.aagghee.co.uk) کو اتنی کارآمد اور معلومات سے لاد ہے کہ لامحالہ اس کو دن میں ایک دو بار کوئی استعمال کرتا ہے۔شاعری میں کشمکشِ زندگی کے کئی فلسفے بیان کرتی ہیں۔

قاضی عنایت الرحمٰن

صاحبِ طرز ادیبہ

اپنی طویل صحافتی زندگی میں آج تک میری نظروں سے ایسی کتاب کبھی نہیں گزری ہے جس میں دیباچہ نویس نے دیانت داری سے کم لیتے ہوئے متعلقہ کتاب کی خامیوں کی دہائی دی ہو۔بعض سکہ بند قسم کے دیباچہ نویس حضرات تو ایسی کتابوں پر بس داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔دوسری طرف اگر کسی ایسی چیز کو اچھا نہ کہا جائے تو یہ بھی بد دیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔میں کوئی نقد ہوں اور نہ ہی ادیب اور شاعر۔میری رائے سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔تاہم میری رائے میں رضیہ اسماعیل کا قلمی حدود اربعہ ہمارے ادبی ارتقاء کا ایک مستند شاہکار ہے۔اور خاص طور پر ان کے رنگ رنگ کے ماہیے، جن میں طنز و مزاح سے لے کر حمدیہ اور نعتیہ ماہیے شامل ہیں، ان سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔

سلطان محمود

رضیہ اسماعیل کی آدھی چادر

سلمیٰ اعوان
(لاہور)

رضیہ اسماعیل اتنی متنوّع صفات کی حامل شخصیت ہیں کہ رشک آتا ہے۔ شاعری کا میدان ہو۔اس میں جھنڈے گاڑے بیٹھی ہیں۔ پانچ شعری مجموعے اپنا آپ منوا کر مزید ایک نئے اضافے سے خوشبو، گلاب، کانٹے کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ مزید دو مجموعے ''خوشبو اُڑتی پھرے'' اور ''احساس کی خوشبو'' زیرِ طبع ہیں۔

میری اب تک کی اس خوبصورت شاعرہ سے شناسائی ادبی رسائل میں چھپنے والی اس کی غزلوں، نظموں اور یا پھر اس کی ''پوپ کہانی'' کے حوالے سے تھی۔ ادب کی اس صنف کے آغاز اور اس کے بانی پر اس کے تحقیقی مضمون نے جس انداز میں بحث ومباحثے کے دروازے کھولے اور جس سے رسائل میں ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہوا۔ سچی بات ہے مجھے یہ سلسلہ اچھا لگا تھا۔ یوں میں اس کے شعروں کی فکری گہرائی اور اس کے شعر گوئی میں تنوع کی مداح تو تھی ہی، مگر اس کی کلیات نے میرے اوپر بہت سی مزید پرتوں کو وا کیا۔ اس کے اندر کی سچائی اور بے باکی جس طرح اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ اس کے کلام کی نغمگی اس میں ٹھاٹھیں مارتی غنایت ایک طرف اگر اس کا حسن بڑھاتی ہے تو وہیں اس کے اندر کے دُکھ اس کے لفظوں کے راستوں سے باہر آتے ہیں، اور آپ کو افسردہ کرتے ہیں۔

تاہم مجھے اس کے جس پہلو پر کچھ کہنا اور لکھنا ہے وہ اس کی نئی افسانوں کی کتاب ''آدھی چادر'' سے ہے۔ مسودے کے مطالعہ سے احساس ہوا کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہی نہیں بلکہ اسے سلیقے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہے۔ ''آدھی چادر'' اِس مجموعے کی مرکزی کہانی جہاں وہ پاکستان کی کٹی پھٹی تقسیم پر نوحہ کناں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہم پاکستانیوں خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بھی اُن حقائق سے آگاہ نہیں جن پر اس کی کہانی نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ جابجا کرب اور دکھ کا اظہار بھی کرتی ہے۔

''ہرنام داس'' بھی تقسیم کے المیے میں گندھی کہانی ہے۔ ایک حساس بچی جو ہرنام داس کی بڑی سی حویلی کے دروازوں، کھڑکیوں، اُن کمروں میں دھرے برتنوں، فرنیچر، اُس گھر کی وسعت اور کشادگی سے باتیں کرتی ہے۔ جس کے اندر ایک اسرار پھیلا ہوا ہے جو احساسات کی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے کہانی کو بڑا منطقی انجام دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کا سفر ہے۔ اس ناسٹلجیا کے دُکھوں کا جس میں اس نے اپنا بچپن گزارا۔ جس کی تلخ یادیں اس کی یادداشتوں میں کسی خزانے کی طرح پڑی تھیں، جنہیں وہ اب ایک ایک کر کے کہانیوں کی بُنت میں بُن رہی ہے۔

''چیچاوطنی'' اُن کی ایسی ہی ایک اور اثر انگیز کہانی ہے۔ دو عورتوں کی محبت کا مرکز واحد مرد۔ دو عورتیں ایک خوبصورتی کی انتہاؤں پر اور دوسری قبولیت سے بھی نچلے درجے پر۔ کیا مقناطیسی چیز تھی جس نے مرد کو جکڑ لیا۔ کہانی میں بکھرا تجسّس آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے مگر کہانی کہنے کے انداز کی دل کشی آپ کو روکتی ہے۔ موت سے متاثر ماحول کی عکاسی ایک سوگوار موج کی طرح آپ کو اپنے ساتھ بہاتے ہوئے اس کے رنگوں کو آشکارہ کرتی ہے۔

ذرا دیکھیے۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔
نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔
نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔
نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔
گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔
ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔
آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔
چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سرزمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔
پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطمہ جٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

''دیوارِ گریہ'' بھی ایک خوبصورت دردانگیز کہانی ہے۔ معاشرے کی جہالت، مردانہ استحصال، عورت کے تحفظ کی جبلّی خواہش اور اس کے حصول میں پے در پے دھوکوں سے بغل گیری۔

رضیہ کی کہانیوں کی زبان سادہ، اسلوب خوبصورت، موضوعات میرے آپ کے معاشرے کے دُکھ، اس کی کجیاں، اس کے رویّے سبھی زیرِ تحریر آتے ہیں۔ وہ پراثر لکھنے پر قادر ہیں۔

''کیہ جاناں میں کون'' ایک اور بے حد اثر انگیز کہانی کہہ لیجیے یا ایک ملاقات، آپ کی مرضی۔ رضیہ نے کردار کو براہ راست اس کا حقیقی نام دینے سے پوری رازداری سے کام لیا اور صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں جیسی کیفیت پیدا کرنے کا انداز اپنایا ہے۔ مگر جاننے والے بھی تو جانتے ہیں۔ تاہم یہ ایک بھرپور تاثر چھوڑنے والی تحریر ہے۔ جو آپ کو ملول کرتی ہے۔ اُن دکھوں سے آشنا کرتی ہے جو خدا کی اِس تخلیق کو نصیب ہوتے ہیں۔

رضیہ کے لئے دعا گو ہوں۔ اُن کا یہ قلمی سفر جاری رہے۔ ایک وسیع دُنیا اُن کے حصار میں رہتی ہے۔ امید ہے کہ وہ مزید کہانیوں سے ہمیں ان کرداروں سے ملواتی رہیں گی جو اُنہیں لکھنے پر اُکساتے ہیں۔

''وصال کے موسم''

(محترمہ رضیہ اسماعیل کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا
کچھ غم تو ادھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا
راتوں کا اندھیرا ہے، تنہائی ہے اور میں ہوں
ایسے میں کوئی جگنو پہلو سے لگا ہوتا
گھر ڈھونڈنے نکلے تھے، ویرانے میں آ پہنچے
اے کا ش کہ رستوں میں ترا نام لکھا ہوتا
ہے جال اندھیروں کا، جاؤں تو کدھر جاؤں
رستے میں ترے گھر کے اک دیپ جلا ہوتا
تو اور کہیں پر ہے، میں اور کہیں پر ہوں
میں تجھ کو ملی ہوتی، تو مجھ کو ملا ہوتا

○

☆

کہاں گرفت میں اب ماہ و سال کے موسم
بکھرتے جاتے ہیں تیرے وصال کے موسم
ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم
ہر ایک پھول کلی کو بلا رہا ہے قریب
چمن میں آئے ہیں اب کے کمال کے موسم
میں ڈوبتی ہوں کناروں پہ اور کہتی ہوں
کبھی نہ دیکھے تھے ایسے زوال کے موسم
تو اپنی آنکھ میں تابِ بہار لا تو سہی
جہان بھر میں ہیں حسن و جمال کے موسم
کہ جیسے ذہن میں عہدِ خزاں اتر آیا
بہت ہی زرد ہوئے ہیں خیال کے موسم

○

☆

لفظوں کی جھنکار کو مرنے مت دینا
اندر کے فن کار کو مرنے مت دینا
کوثر اور تسنیم سے دھو لو ہونٹوں کو
ناطق ہو، گفتار کو مرنے مت دینا
پتی پتی چُن کر پھول بنا لینا
خوشبو کے سنسار کو مرنے مت دینا
منزل دُور بہت اور پاؤں زخمی ہیں
چلتے رہو، رفتار کو مرنے مت دینا
سجدوں اور دعاؤں کی سوغاتوں سے
تم اپنے بیمار کو مرنے مت دینا
مرنا پڑے سو بار اگر تو مر جاؤ
پر اپنے کردار کو مرنے مت دینا

○

○

کس طرف آنکھ اٹھاؤں ، میں کہاں تک دیکھوں
تو ہی آتا نظر مجھ کو جہاں تک دیکھوں
دور تک بکھرے ہوئے پھول ہیں اور پتّے ہیں
میں بہاروں کا سماں عہدِ خزاں تک دیکھوں
تجھ کو شعلے بھی نظر آئے نہ میرے دل کے
میں تو کھلتے ہوئے پھولوں کا دھواں تک دیکھوں
کتنے پہلو ہیں ترے ، کتنے ترے چہرے ہیں
تُو مجھے یہ تو بتا تجھ کو کہاں تک دیکھوں
جو نہ ممکن تھا وہ ممکن کی حدوں تک دکھا
میں ترا عکس تہِ آبِ رواں تک دیکھوں
تیرے دیدار کے آداب کی سوگند مجھے
تجھے دیکھوں بھی تو قدموں کے نشاں تک دیکھوں

(احمد ندیم قاسمی کی زمین میں)

☆

☆

اک پتّا ٹوٹ کے آیا ہے
پیغام خزاں کا لایا ہے
ہم مفلس تھے، ہم مفلس ہیں
تری یاد ہی اِک سرمایہ ہے
ہر پل کو دیکھ کے ڈرتی ہوں
ہر وقت سے دھوکا کھایا ہے
ہر سپنا آنکھ سے بہہ نکلا
یہ کیسا آنسو آیا ہے
دیوار بنا کر تو دیکھو
ہر دھوپ میں پنہاں سایا ہے
پھر بھول گئے ہم آندھی کو
پھر آس کا دیپ جلایا ہے

○

☆

رفاقتوں کے زمانے ہنساتے رہتے ہیں
جدائیوں کے زمانے رُلاتے رہتے ہیں
تمھاری آنکھ میں تِل دیکھ کر نہ جانے کیوں
عجیب وہم سے مجھ کو ڈراتے رہتے ہیں
تلاشِ خواب میں راتوں سے دوستی کر لی
اندھیرے رات کے پھر بھی ڈراتے رہتے ہیں
ہمیں کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے اشکوں کی
تمھاری یاد میں ساون مناتے رہتے ہیں
کسی کے ہاتھ کے لمس اب بھی چپکے چپکے سے
رفاقتوں کی کہانی سناتے رہتے ہیں
وہ شام ہے کہ سحر ، فرق ہی نہیں پڑتا
تمھاری یاد کی شمعیں جلاتے رہتے ہیں

○

○

وعدے محبتوں کے کچھ ایسے نبھائے ہیں
آنکھوں میں اشک آئے مگر مسکرائے ہیں
خوشبو ترے وصال کی پھیلی ہے چار سو
کن کن جگہوں پہ تو نے ٹھکانے بنائے ہیں
آنسو لہو میں ڈوب گئے تو خبر ہوئی
طوفان دل نے درد کے کیا کیا اٹھائے ہیں
تیری محبتوں کے نشے بھی عجیب ہیں
ہم ہوش میں تھے پھر بھی قدم لڑکھڑائے ہیں
پکے مکاں کی وحشتوں کو دیکھ دیکھ کر
اب ہم نے خواہشوں کے گھروندے بنائے ہیں
یہ زندگی کسی کی امانت ہے دوستو
گِن کے بتاؤ جتنے بھی لمحے گنوائے ہیں
شامِ غریباں تم نے تو دیکھی نہیں کبھی
بس اِس خیال سے ہی تمھیں دُکھ سنائے ہیں

☆

☆

میں اپنی کشتی دل کو ڈبو نہیں سکتی
سمندروں سے عداوت تو ہو نہیں سکتی
میں کیسے تجھ سے بچھڑ جاؤں، یہ بتا مجھ کو
جدا گلاب سے خوشبو تو ہو نہیں سکتی
نہ کوئی حال، نہ ماضی، نہ کوئی مستقبل
میں خود میں کوئی زمانہ سمو نہیں سکتی
تری جدائی کو دل میں اتار رکھا ہے
نشانی پیار کی ہرگز میں کھو نہیں سکتی
سفینہ پیار کا ساحل پہ اب لگے ہی لگے
کوئی بھی لہر اب اس کو ڈبو نہیں سکتی
جو فصل کانٹنا میرے نصیب میں ہی نہ ہو
میں ایسی فصل کے اب بیج بو نہیں سکتی

○

☆

سانپ سے رستے لہراتے ہیں
لوگ سفر پر کیوں جاتے ہیں
سات سمندر پار کیے ہیں
اشکوں سے کیوں گھبراتے ہیں
اس پر زور کہاں چلتا ہے
اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں
لمحے چند ملاقاتوں کے
کتنی یادیں دے جاتے ہیں
نیند کی پریاں روٹھ گئی ہیں
دن کو خواب نظر آتے ہیں
ہمیں خوشی گھائل کرتی ہے
لوگوں کو دُکھ تڑپاتے ہیں

○

○

''مرے خدایا ! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں''[1]!
یہ کیا سوالات سامنے ہیں ، میں کیسے ان کے جواب لکھوں
جوان چہرے لٹے لٹے سے ، نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اجڑی جوانیوں کو میں کیسے عہدِ شباب لکھوں
میں ظلم کو ظلم ہی لکھوں گی ، میں رات کو رات ہی لکھوں گی
میں ریت کو لہر کیسے کہہ دوں ، ندی کو کیسے سراب لکھوں
سمے کی مٹھی میں بند چٹھی سوال جس کے مجھے پتا ہیں
میں کس ورق پر ، میں کس قلم سے ، سوال لکھوں ، جواب لکھوں
وہ سامنے ہے تو کیسے کہہ دوں وہ میرے سامنے نہیں ہے
سراپا اس کا نظر میں ہے جب تو کیسے اس کو سراب لکھوں
جو دل کے مندر میں بُت رکھے تھے ، انہی میں تیری بھی مورتی تھی
یہ بُت گرے جب جو دل پہ گزری ، میں کیوں نہ اس پر کتاب لکھوں

[1]: عبیداللہ علیم کی نظم ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں'' کے پہلے مصرع کی زمین میں لکھی گئی ہے

☆

☆

خواب آنکھوں میں کچھ پرانے دو
مجھ کو گزرے ہوئے زمانے دو
اشک آنکھوں میں اب نہیں آتے
مجھ کو رونے کے کچھ بہانے دو
وہ تماشا بنا گیا مجھ کو
غم کا بازار اب لگانے دو
تیرے انساں نے کر دیا مایوس
مجھ کو اک بُت نیا بنانے دو
اب تو جینا بھی موت لگتا ہے
مجھ کو اپنی چتا سجانے دو

○

☆

ڈھونڈیں کیسے من کا میت
ملنا ، بچھڑنا پیار کی ریت
کوئل کی آواز میں پنہاں
درد کا ایک انوکھا گیت
عکس بھی تم ، آئینہ بھی
کون ہے دشمن ، کون ہے میت
برسوں بیتے اس کو دیکھے
کیسی نفرت ، کیسی پریت
پیار ہے ایک انوکھا قصہ
کس کی ہار اور کس کی جیت

○

روشنی کا تعاقب

رضیہ اسماعیل

''میں یہ سوچ کر اکثر اداس ہو جاتی ہوں کہ اگر مکانوں میں کھڑکیاں نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتا؟''

''دروازے تو خیر دروازے ہیں، ان کی افادیت تو سب ہی جانتے ہیں مگر کھڑکیاں..... کبھی ان کی افادیت پر بھی ہم نے سنجیدگی سے غور کیا ہے؟'' میں خود ہی سوال اور خود ہی جواب بن جاتی۔

اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے پٹ تھامے میں کافی دیر سے کھڑی تھی۔ پھر اچانک کچھ سوچ کر میں مسکرا اٹھی۔ مجھے لگا اس مسکراہٹ نے میرے اندر بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ ذہن کی کھڑکیاں، دل کی کھڑکیاں، روح کی کھڑکیاں.....

''کیا روح کی بھی کھڑکیاں ہوتی ہیں؟'' میرے اندر سے سوال گونجا۔

''ہاں، ہوتی ہیں مگر یہ اتنی آسانی سے نہیں کھلتیں۔'' اندر سے ہی جواب آیا۔

''مگر کیوں؟'' سوال میرے لبوں تک آتے آتے رہ گیا۔ مگر میرے اَن کہے سوال کے جواب میں ہی دل بول اٹھا۔

''یہ فنا قبل از فنا والا معاملہ ہے یعنی موت سے پہلے مر جانا، اپنی ذات کی مکمل نفی۔''

''مگر ذات کی نفی اتنی آسان نہیں ہوتی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، اگر کوئی دوسرا آپ کی ذات کی نفی کرے تو یہ تکلیف دہ عمل ہو سکتا ہے لیکن جب آپ خود ہی اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں تو یہ مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔'' دل نے جواب دیا۔

''یہ فہم وادراک کی کون سی منزل ہوتی ہے؟'' میں نے پھر سوال کر دیا۔

''جب آدمی کو یہ پتا چل جائے کہ وقت کی تختی پر اس کی اہمیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔'' اندر سے مدلّل جواب سن کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھول دیئے۔

باہر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی زندگی اپنی تمام تر خباثتوں کے ہمراہ ایک زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔

پڑوس میں رہنے والا دوہاجو رحیمو جو لاہا اپنی نئی نکور بیوی کو بلاوجہ ہی منہ بھر بھر کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ ذرا چوں چراں کرتی تو اُسے مارنے کو دوڑتا۔

رحیمو کی ننگی ننگی گالیاں سن کر گلی میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑے، دن رات کھوں کھوں کرتے، اللہ وسائے موچی نے حقے کی نَے پرے کر کے بلغم زدہ گلے سے رحیمو کو سمجھانا شروع کر دیا۔

''اوئے، رحیمو! اگر اس بے چاری پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اب دن رات گالیاں دینے سے اس کی جوانی کا منہ زور دریا تو اترنے سے رہا۔ پکی عمر میں سہرا باندھ کر گھوڑی پر بیٹھنا تو آسان ہے مگر گھوڑی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

رحیمو کے پاس اللہ وسائے موچی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور شاید اللہ وسایا اس سے کسی جواب کی توقع بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے دوبارہ زور شور سے حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔

کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے فرانز کافکا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''دنیا کتنی دل چسپ جگہ ہے؟ اس بات کا اندازہ کرنا ہو تو مٹھی بھر دنیا اپنی آنکھوں کے نزدیک لا کر غور سے دیکھو۔''

''میں بھی مٹھی بھر دنیا کو اپنی آنکھوں کے بہت نزدیک لا کر دیکھوں گی۔'' میں نے ایک عزم سے کہا۔

اگرچہ مجھے اس بات کا ادراک تھا کہ بے حد نزدیک سے مشاہدہ کرنے والی دنیا کی نزاکتیں سوچ کی اور بہت سی کھڑکیاں کھول دیں گی۔

مگر میں نے اس مشاہدے سے حاصل ہونے والی لذت کے خیال سے سرشار ہو کر کچھ اور انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

میرے علم میں یہ بات تو تھی کہ رحیمو کی پہلی بیوی رحمتے چند مہینے قبل اسے ایک لمبی رفاقت کے بعد دائمی جدائی کا داغ دے کر جا چکی تھی اور اب رحیمو کو بیوی کی یاد میں دن رات آنسو بہاتے دیکھ کر سب ہی پریشان ہو رہے تھے۔ رحیمو کو غم کی کھاٹ سے کسی طرح بھی اترتے نہ دیکھ کر اس کے بھائی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

''آخر بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے۔ زنانی کی موت پر اتنا لمبا سوگ مناتے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، تو کوئی بڈھا تو نہیں ہو گیا رحیمے! ہڈ پیر سلامت ہیں۔ اچھی کاٹھی ہے، مرد ذات کا کیا ہے، وہ تو ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے۔''

رحیمو کے بھائی سلطان نے اسے دوسری شادی کے لئے قائل کرنے کے لئے دلائل دینے شروع کر دیئے۔

سلطان کی بات سن کر رحیمو کچھ روز گومگو کا شکار رہا مگر پھر دوسری شادی کے خیال نے اس کے دل میں گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بغیر سوچے سمجھے ہی اس نے اپنے سے عمر میں کئی گنا چھوٹی لڑکی سے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ رحیمو کی اس ناسمجھی کا خمیازہ اب رحیمو کے ساتھ ساتھ سب محلے والے بھگت رہے تھے۔

یک لخت سوچ کی ایک ننھی سی کھڑکی میرے ذہن میں کھل گئی، ''بھلا رحیمو کو اس عمر میں نئی سیج سجانے کی کیا ضرورت تھی؟ رحمتے کے ساتھ اس کی ایک لمبی

''چہار سُو''

رفاقت کی سانجھ تھی۔ ازدواجی زندگی میں اگر چند سال بھی سکھ کے نصیب ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔ باقی ماندہ زندگی بھی انہی چند سالوں کے سہارے بُری بھلی گزر ہی جاتی ہے، مگر رحیمو نے تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے، اب موصلے تو پڑنے لازمی ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں رحمتے کی بجائے رحیمو کو مر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم اڑوس پڑوس والوں کی زندگیاں تو اجیرن نہ ہوتیں۔ رحمتے کا کیا تھا، صابر شاکر عورت تھی۔ اس بڑھاپے میں اُسے کہاں دوسرا خصم کرنے جانا تھا، یہ حق تو صرف مردوں کی رکھیل ہے۔'' ایک دن ماسی برکتے روز روز کی جوتم پیزار سے تنگ آ کر غصے سے پھٹ پڑی۔

رحیمو کا تماشا ذرا ختم ہوتا تو ماسٹر دل محمد ڈگڈگی بجانی شروع کر دیتا۔ دن رات بے چاری ماسٹرنی کو گھر کیاں دیتا رہتا۔ ماسٹرنی غریب گھر کی دبو قسم کی عورت تھی۔ ماسٹر کی زیادتیوں پر زبان کھولتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں تین کا پہاڑا پڑھ کر ماسٹر اس سے ہمیشہ کے لئے ہی نہ جان چھڑا لے۔

ماسٹر پرلے درجے کا کنجوس آدمی تھا۔ سکول جاتے ہوئے باورچی خانے کو تالا لگا کر جاتا، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر کی کمائی سے ماسٹرنی اپنے غریب رشتے داروں کو کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ اسی پر بس نہیں، ماسٹر گھر کے دروازے پر بھی بڑا سا تالا لگا دیتا تھا۔ ماسٹرنی سارا دن کھڑکی میں لٹکی گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ آنکھوں میں اترنے والی رم جھم کو اپنے میلے سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے کی ناکام کوشش اس کے دکھ کی مزید تشہیر کر دیتی۔

کھڑکی نے سرگوشی کی ''ماسٹرنی غریب گھر سے ضرور ہے مگر شریف عورت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات میں نہ جانے کیا کر گزرتی مگر ماسٹر کی ڈگڈگی ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' میں نے کھڑکی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر جیسے ہی نگاہ پلٹی، سارا منظر ریت کی طرح جھر جھر کر کے کہیں دور نکل گیا۔

میں نے ایک اور مٹھی بھر دنیا ذرا آنکھوں کے قریب لا کر دیکھنا چاہی تو گلی میں مجھے اوباش فیقا سر منہ سنوار کر ادھر ادھر تا جھانکی کرتا نظر آیا۔

اس تنگ سی گلی سے گزرنے والی نوجوان لڑکیوں پر گھٹیا قسم کے عاشقانہ فقرے اچھالنا اس کی عادت تھی۔ ایسے میں اگر کوئی جی دار قسم کی لڑکی پلٹ کر فیقے کو جواب دے دیتی تو فیقے کا حرامی پن سوا ہو جاتا۔ بڑی بے شرمی سے ایک آنکھ میچ کر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا، ''بسم اللہ، آ وَ بادشاہو، تہاڈی اڈِیک سی۔''

فیقے کی بات لڑکی کے تن بدن میں آگ لگا دیتی اور وہ جُز بُز ہو کر مزید کچھ کہے سنے بغیر جلدی جلدی گلی پار کرنے کی کوشش کرتی۔

''کچھ شرم کر فیقے! محلے کی دھی بہنوں کے ساتھ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کرتے۔'' ایک دن تیز طرّار ماسی برکتے نے فیقے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔

''اوئے ماسی، تھوک کے حساب سے مجھے یہ بہنیں نہیں چاہیے۔ مجھے کیا ان کا اچار ڈالنا ہے؟ الٹا ان بہنوں کی فوج کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دے گی۔ ناں بھئی، میں کسی کو بہن وہن نہیں بناتا۔ میں تو انھیں ملکہ بنا کر دل کے تخت پر بٹھاؤں گا۔'' وہ بڑے ڈھیٹ پن سے ماسی برکتے کی بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتا۔

''ذرا فٹے منہ تیرا، شکل چنگی نہ ہو تو بات تو چنگی کر لینی چاہیے۔'' ماسی برکتے کی پھٹکار سن کر فیقا اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگتا۔

کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔

اس مرتبہ روح کی کھڑکی پر پڑنے والی دستک کی آواز میرے بہت اندر تک اتر رہی تھی۔ اندر اور باہر کے شور نے مل کر جیسے راگ بھاگیہ شری چھیڑ دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی اندر سے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ایسے میں اپنی ذات کے خول سے اندر باہر ہوتی ہوئی چودھری فضل دین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ریشم میری نظروں کے حصار میں آ گئی۔

میرے گھر سے ملحق چودھری کی بڑی سی حویلی کے پکے صحن میں گم سُم لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھری فضل دین کے دل پر آرے چل رہے تھے۔

چودھری دبی دبی آواز میں بڑی فکر مندی سے چودھرائن سے کہہ رہا تھا، ''بڑی وکھری قسم کی لڑکی ہے ریشم۔ نہ بچوں جیسی شرارتیں ہیں، نہ فرمائشیں، نہ سکھیوں سہیلیوں سے تو تکار، نہ گڈی گڈے کا بیاہ، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ صلح نہ صفائی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، گواچی گواچی سی، پتا نہیں ہر وقت کیا ڈھونڈتی رہتی ہے؟''

چودھری کی بات سن کر پاس بیٹھی ہوئی چودھرائن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، ''میرے لاکھ پوچھنے پر بھی منہ نہیں کھولتی۔ بس پٹر پٹر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس پر کوئی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں آ گیا۔ پنڈ کے سائیں بابا کو نہ دکھا دیں۔ کوئی دم درود ہی کر دے گا۔ سنا ہے بڑی کرنی والا بابا ہے۔''

''ہوں'' چودھری کا بے حد مختصر سا جواب سن کر چودھرائن کچھ اور ہی فکر مند ہو گئی۔

چودھرائن کی ممتا کا سمندر زبردست ہلکورے لے لے کر امید و ناامیدی کے ساحلوں کو بھگو رہا تھا۔ چودھرائن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح وہ اپنی دکھوں کی سولی پر لٹکی ہوئی نازوں پلی اکلوتی اولاد کو مائیکل انجلو کے مجسمے Pieta کی طرح ہاتھوں میں احتیاط سے اٹھا کر ایسی لوری سنائے جسے سن کر وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

''چہار سُو''

''اٹھ میری سوہنی دھی، دن ڈھلنے کو ہے۔'' صحن میں ساری دوپہر تیز دھوپ میں سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھرائن نے بھرّائی ہوئی آواز میں ایسے کہا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

صبح سے چودھرائن اُسے کتنی بار تیز دھوپ میں لیٹنے سے منع کر چکی تھی مگر ریشم ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

''اٹھ ریشو میری جان۔ سیانے کہتے ہیں جب دو وقت مل رہے ہوں تو لیٹنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ نحوست پھیلتی ہے۔ اٹھ شاباش!'' چودھرائن نے جیسے ہی بیٹی کو ہاتھ پکڑ کر چارپائی سے اٹھانا چاہا وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''امّاں آپ سب مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ رب نے اگر میرے من کو سوچوں میں ڈال دیا ہے تو میں کیا کروں؟'' ریشم نے قدرے خفگی سے کہا۔

''ناں، دھی رانی! سوچتے تو ہم سب ہی ہیں مگر ہم نے تیری طرح جوگ نہیں لیا۔'' چودھرائن نے بیٹی کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''امّاں میری اور تیری سوچوں میں یہی تو فرق ہے۔ میرا دماغ سو سو سوال کرتا ہے اور تیرا دماغ سو سو جواب مانگتا ہے۔'' بیٹی کے تیز طرّار جملے پر چودھرائن لاجواب سی ہو گئی۔

ریشم کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح کی کھڑکی پر کسی نے بڑا سا تالا لگا دیا تھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سے کھل نہیں پا رہا تھا۔

ہر سو اندھیرا، گھور اندھیرا تھا۔ ایسے میں اسے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ جنگلوں بیابانوں میں نکل جائے جہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کی آوازیں اسے سنائی نہ دیں۔ جہاں نہ چودھری فضل دین کی فکر مندیاں اس کا پیچھا کریں اور نہ ہی چودھرائن کے سوال اسے سوئی کے ناکے میں سے گزرنے پر مجبور کریں۔ مگر کیسی مجبوری تھی وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی؟

پھر ایک دن مٹھی بھر زندگی ریشم کی آنکھوں کے بھی بہت قریب آ گئی۔

گاؤں کے باہر ایک کھلا میدان تھا جہاں گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے اکثر گائیں بھینسیں دن میں لیٹی اور بیٹھی ہوئی جگالی کرتی رہتی تھیں۔ بچے آنکھ مچولی کھیلتے، درختوں کی شاخوں سے جھولے جھولتے اور بہت اونچائی پر بنے پرندوں کے گھونسلوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتے۔ مگر جیسے ہی سورج ڈھلتا اور چراغ روشن ہوتے تو میدان بالکل سنسان ہو جاتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں وہ اس میدان میں کھڑی تھی.....

میدان کے اُس پار سرسبز کھیتوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی کئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نہر کی طرف نکل جاتی تھیں۔ یہ نہر جیسے جیسے گاؤں کے قریب آتی، اس کا پاٹ چوڑا ہوتا جاتا تھا۔

دن کے وقت ندی پر کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ گاؤں والے مویشیوں کو نہلاتے، پانی پلاتے، عورتیں کپڑے دھوتیں، بچوں کو نہلاتیں اور خود بھی ادھ ننگی سی نہانے کے لئے پانی میں اتر جاتیں۔

ذرا فاصلے پر بنے ہوئے ندی کے پُل پر سے نوجوان لڑکے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور نہر کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں اگر کبھی تربوز تیرتے ہوئے آ جاتے تو وہ انھیں پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑتے۔ سخت گرمی کے موسم میں گویا یہاں ایک دنیا آباد رہتی تھی مگر اس وقت یہاں مکمل خاموشی تھی۔

شام کے گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں کھلے میدان کو پار کر کے آہستہ آہستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی ہوئی پگڈنڈی سے گزر کر وہ نہر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کنارے پر اسے ایک چمکیلی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وہ نہر کے قریب ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ روشنی اُس سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ روشنی کی طرف بڑھتی رہی۔

نہر کے کنارے پر جا کر وہ بے حد مایوس ہو گئی، کیوں کہ وہی روشنی اب نہر کے دوسرے کنارے پر چمک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ نہر میں چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے تک چلی جائے مگر نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس بے بسی کی کیفیت میں وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ نہر کے کنارے کھڑی ہو کر اُس پار چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھتی رہی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی سلفے کی لاٹ تھی جو اس ویرانے میں چمک رہی تھی۔ چاروں طرف آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ کیسی تھی یہ روشنی جو باہیں کھولیں اسے اپنی طرف بلا رہی تھی؟

روشنی کے مجنونانہ تعاقب میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کے علاوہ کوئی ذی روح نہ تھا۔ گھر واپس جانے کے خیال سے وہ جیسے ہی پلٹی، اپنے پیچھے کھڑے ایک سائے کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

اندھیرے میں اُسے ٹھیک سے کوئی چہرہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سایہ اس سے مخاطب ہوا، گاؤں کے سائیں بابا کی آواز پہچان کر اس کی جان میں جان آ گئی۔

''روشنی کا پیچھا کر رہی تھی پتر؟'' بابا نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہاں بابا'' وہ جلدی سے بولی۔

''روشنی کا پیچھا کرو گی تو یہ تم سے اور دور ہو جائے گی۔'' بابا نے کہا۔

''وہ کیوں بابا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ ہم لوگ اپنے اندر کی روشنی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور روشنی کو ہماری یہ بے گانگی بالکل پسند نہیں ہے۔ اس لئے جب باہر نظر آنے والی روشنی کا تعاقب کرو تو وہ ہم سے اجنبیوں کی طرح دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔'' بابا نے

بڑے صوفیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''بابا! کیا روشنی ہمارے اندر موجود ہے؟'' اس نے تجسس سے سوال کیا۔

''ہاں پتر، یہ روشنی ازل سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ دل تو سوہنے رب کا گھر ہے، اس کے نور سے روشن ہے مگر بدقسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' خَلَقَ اللهُ الْخَلْق فی ظُلُمٰتٍ ثُمَّ القرا عَلَيْهِ نُوْراً.....''

یعنی کہ اللہ رب العزت نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا کیا مگر اس پر اپنے نور کا پرتو ڈال کر اسے روشن کر دیا۔

وہ بہت غور سے بابا کی باتیں سن رہی تھی۔

''ہم دنیا دار کمینے اپنی ناعاقبت اندیشی سے نور کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر بجھے ہوئے دیوے لے کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ اپنی بدنصیبیوں اور اپنی بدبختیوں کے شکوے شکایتیں کرتے ہیں۔'' بابا نے قدرے جلال سے اونچی آواز میں کہا۔

''بابا نور کے چراغ کیسے بجھ جاتے ہیں؟ پُتر بندہ ستر ہزار پرتوں سے بنا ہے اپنے رب کے حکم سے جب وہ عالمِ ارواح سے عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں آتا ہے تو اُس کے اوپر ایک پرت غالب آ جاتا ہے جس میں جلد بازی، سرکشی، بغاوت، حکم عدولی، ناشکری، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہی وہ دنیا کی زندگی ہے جسے قرآن نے اسفل السافلین کہا ہے۔''

سائیں بابا اپنی روانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''کیا یہ روشنی میرے اندر بھی موجود ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں پُتر! یہ روشنی تو سب کے اندر موجود ہوتی ہے۔ تمھارے اندر بھی ہے۔'' بابا نے نرمی سے جواب دیا۔

''تو کیا یہ رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کے اندر بھی ہے؟''

اس نے اپنی بے یقینی کو یقین کا چولا پہنانے کے لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ہاں، پُتر! یہ تو سوہنے رب کا نور ہے جو ہر دل کے اندر موجود ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر دل کی طاق پر نور کا ایک چراغ رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس چراغ کو اپنے عمل سے روشن رکھیں یا اپنی بداعمالیوں سے اسے بجھا دیں۔''

بابا کی باتیں سن کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''پُتر! زیادہ مت سوچو، بس اپنے اندر جھانکو، بجھا ہوا چراغ نگاہوں کی تپش سے خود بخود جل اٹھے گا۔ ہر طرف چانن ہی چانن ہو جائے گا۔ روشنی کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے اندر کی روشنی کو تلاش کرو۔ اسے پہچانو، اس سے دوستی کرو، اس سے ہاتھ ملاؤ، یہ تمھاری اپنی روشنی ہے۔ اس سچے رب کا نور ہے جو ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہر وقت ہمارے قریب رہتا ہے'' اتنا کہہ کر سائیں بابا۔

'' الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے مرشد من وچ لائی ہُو
اندر بوٹی مُشک مچایا جاں پھلن تے آئی ہُو''

کہتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اللہ ہُو کی دھمک جیسے ہی ریشم کے دل پر پڑی تو اُسے یوں لگا جیسے اس کی روح کی بند کھڑکی کھل گئی ہو، سب اندھیرے چھٹ گئے ہوں۔

ہر سو نور کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔ اسے اپنے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ کیوں کہ اب اندر سے کوئی سوال کر رہا تھا:

تمھارے ہاتھ میں سورج بھی ہے، چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں؟

لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، وہاں نہ سائیں بابا تھا، نہ نہر کا کنارہ، نہ کھیت، نہ کھلیان تھے۔

بس طمانیت کا ایک بھرپور احساس تھا جو اس کے چاروں طرف اللہ ہو کی دھمال ڈال رہا تھا۔

میں نے بھی اسے مطمئن پا کر مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔

آگہی کی روحِ رواں

رضیہ اسماعیل کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے لہجے نے فکر آور اسلوبِ اظہار اور جدید حسیت کے وہ چراغ جلائے ہیں کہ ان کا پورا کلام اُس سے منور ہے۔ ان کی نظم اور غزل کا ایک ایک حرف گواہی دے رہا ہے کہ وہ تخلیقِ فن کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا ہے۔ ان کا کلام دلوں پر اثر کرتا ہے۔ وہ منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں اور ادبی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ شاعری میں وہ نئی نسل کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ انتہائی رنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ حزن وملال اور رنج میں ڈوبی ہوئی شاعری نوجوانوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے گزر چکی ہیں۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر آنے کے باوجود وہ اپنی روایات، رسم ورواج اور بے وطنی کا کرب شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے ان کا دل پیار کی تپش ہے۔ اسے یخ بستہ ہوائیں سرد نہیں کر سکیں۔ عورتوں کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں کیوں کہ وہ خود ایک مشرقی عورت اور ماں ہیں۔

پاکیزہ بیگ

''اِک خواب سہانا ہے''

(محترمہ رضیہ اسماعیل کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

فاری شا
(راولپنڈی)

وطن عزیز کی یاد میں

کہیں پھول برستے ہیں
بچے غریبوں کے
روٹی کو ترستے ہیں

ندیا میں باڑ آئی
کوئی نہیں سنتا
میں سب کو پکار آئی

تعبیر ہے، سپنا ہے
ایسے نہ لُوٹو تم
یہ ملک تو اپنا ہے

میں قوم کا لیڈر ہوں
شیر نظر آؤں
اندر سے گیدڑ ہوں

غصے میں نہ آیا کرو
ڈھول سپاہیا تم
رشوت نہ کھایا کرو

سانگھڑ ہے نہ سکھر ہے
موج اُڑاتے ہیں
پی آر کا چکر ہے

ٹیکسوں کی چوری ہے
کرتے ہو ہڑتالیں
کیا سینہ زوری ہے

ہمیں فول بناتے ہو
انگلش اُردو الگ
اسکول بناتے ہو

روٹی ہے نہ پانی ہے
نوکری ملتی نہیں
اب ڈگری جلانی ہے

پیسہ ہے خدا اپنا
پیسے کے کارن ہی
ہوا صوبہ جدا اپنا

دریا کی موجیں ہیں
ڈر کیا دشمن کا
سرحد پر فوجیں ہیں

جنت کا نظارہ ہے
لے کے رہیں گے ہم
کشمیر ہمارا ہے

گندم کے دانے ہیں
پیسے والوں کے
کملے بھی سیانے ہیں

پالیٹکس میں آئیں گے
خالی جیبیں ہیں
بڑا مال بنائیں گے

مہنگائی نے مارا ہے
پانی ہی پی کر
اب کرنا گزارا ہے

بندر ہے، مداری ہے
روٹی کے چکر میں
دن رات خواری ہے

ننگے پاؤں چلتے ہیں
جرم غریبی کا
تیزاب میں جلتے ہیں

ندی نالے سوکھے ہیں
کیسی وحشت ہے
یہاں بچے بھوکے ہیں

میری چنری میں فیتے ہیں
پانی نہیں ملتا
اب آنسو پیتے ہیں

دانتوں کا منجن ہے
ایسے دھواں چھوڑے
یہ بس ہے کہ انجن ہے

چنگیز ہلاکو ہے
مجھ کو ڈرلا گے
ڈاکٹر ہے کہ ڈاکو ہے

ہم لکشمی جائیں گے
ہائی کولیسٹرول ہے
اور ٹکا ٹک کھائیں گے

کتنا من موجی ہے
اس کو سیلوٹ کروں
میرا ماہیا فوجی ہے

کیمپس کی بہاریں ہیں
نہر کنارہ ہے
جوڑوں کی قطاریں ہیں

مہندی کی رات آئی
فلم کا منظر ہے
بالی وُڈ سے برات آئی

ہائی وے تو پیارا ہے
کوچیں ڈائیو کی
غیروں کا سہارا ہے

راکھل کر ہنس ماہیا
ایئر کنڈیشنڈ ہے
ڈائیو کی بس ماہیا

ہائی وے کا زمانہ ہے
مہنگی فلائٹ ہے
بائی روڈ ہی جانا ہے

نوشہرہ ہے، بکھر ہے
جاتے ہیں امریکا
سب ایڈ کا چکر ہے

ہائی وے تو بہانہ تھا
کرنی کرپشن تھی
اور مال بنانا تھا

شادی ہے امیروں کی
پیچھے پڑ گئی ہے
اک فوج فقیروں کی

اک خواب سہانا ہے
لُوٹیں گے جی بھر کے
سرے محل بنانا ہے

پھولے نہ سماتے ہو
اُردو میں انگلش کے
پیوند لگاتے ہو

راوی کا کنارہ ہے
شاپنگ فوٹریس میں
پیسوں کا سہارا ہے

ہم انگلش پڑھتے ہیں
رہ کر مشرق میں
مغرب پر مرتے ہیں

میکڈونلڈ جاتے ہیں
روٹی نہیں ملتی
ہم برگر کھاتے ہیں

بیوٹی پارلر جاتے ہیں
خود کو نہ جانے کیوں
ہم فول بناتے ہیں

یہ کیسی شادی ہے
خالی بوتل تو
خانہ بربادی ہے

عورت کی کہانی

بڑا ظلم کماتے ہو
عورت ماں بھی ہے
کیوں اُس کو رُلاتے ہو

عورت کو ستاؤ گے
جنم جلی ہے جو
کیا اس کو جلاؤ گے

کہیں چیت ہے، پھاگن ہے
جس کو پیا چاہے
بس وہ ہی سہاگن ہے

ہر سمت اُجالا ہے
میرے مقدر کا
اب تو ہی حوالہ ہے

بادل ہیں، گھٹائیں ہیں
میرا اثاثہ تو
ساجن کی وفائیں ہیں

اس جگ کا نور ہے ماں
ربّ کے بعد یہاں
دوجے ربّ کا ظہور ہے ماں

جنگل میں پرندے ہیں
ڈھانپ لو سر اپنا
ہر طرف درندے ہیں

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے

ہاتھوں کی لکیریں ہیں
جو گیا! دیکھ ذرا
کیسی تحریریں ہیں

بادل ہے، بجلی ہے
پیار سے پکڑ وذرا
بڑی نازک تتلی ہے

میری ہیرے کی انگوٹھی
تیری نشانی ہے
لگتی ہے مگر جھوٹی

کمھار کا آوا ہے
پکتا رہتا ہے
میرے دل میں جو لاوا ہے

عورت کو دغا دو گے
بیوی بنا کر تم
چولھے میں جلا دو گے

یہ دیئے کی باتی ہے
قدر کرو اس کی
دکھ سکھ کی ساتھی ہے

دلھن شرماتی ہے
رات مرادوں کی
برسوں میں آتی ہے

تم ہاتھ اٹھا رکھنا
لوٹ ہی آئے گا
دروازہ کھلا رکھنا

مر مر کر جیتے ہیں
زہر جدائی کا
ہم روز ہی پیتے ہیں

عورت کی کہانی ہے
غور سے سننا تم
گو بات پرانی ہے

عورت کو ستاتے ہو
اک پل پیار کرو
اک پل میں رُلاتے ہو

سوہنی، نہ ہیر ہوئی
تیری محبت میں
تیرے گھر میں اسیر ہوئی

آنچل کو سنبھالا ہے
عورت کے دم سے
دنیا میں اُجالا ہے

چھوٹا سا گھر ہوگا
اپنی دعاؤں میں
کب جانے اثر ہوگا

مندر ہے، پجاری ہے
شان ہے مردوں کی
ناری تو بچاری ہے

دو چڑیاں آئی ہیں
کہتی ہیں مالی سے
ہم دونوں پرائی ہیں

کیا ریت بنائی ہے
جس کو جنم دیا
وہی بیٹی پرائی ہے

پھولوں کی ڈالی ہے
مہندی لگے جس کو
وہی قسمت والی ہے

ہر طرف بلائیں تھیں
بچ کر نکل گئے
سب ماں کی دعائیں تھیں

ہائے کتنی گرمی ہے
چھاؤں ممتا کی
پھولوں سی نرمی ہے

سہرے کی لڑیاں ہیں
ماں صدقے واری
انمول یہ گھڑیاں ہیں

کہیں بجلی کڑکی ہے
آس لگا بیٹھی
نادان یہ لڑکی ہے

کسی جھیل میں بجرہ ہے
راہ تکوں بیٹھی
بالوں میں گجرا ہے

پنجاب رنگ

میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

گھی دیسی کھانوں میں
پل کے جوان ہوئی
ماہیے کی تانوں میں

بڑی چاندی راتیں تھیں
چھاؤں تھی تاروں کی
سکھیوں سے باتیں تھیں

کیا رُوپ نکالا تھا
تازہ مکھن تھا
لسّی کا پیالا تھا

دودودھ کی دھاریں ہیں
سکھیاں بچھڑ گئیں
کونجیں ہیں نہ ڈاریں ہیں

زنجیر ہے پاؤں میں
دنیا دیکھ چکی
چل واپس گاؤں میں

اک نہر کنارہ ہے
گاؤں کا ہر ذرّہ
مجھے جان سے پیارا ہے

مٹّی میرے گاؤں کی
اس کو سلام کروں
نہیں دھول یہ پاؤں کی

کھیتوں میں کھلی سرسوں
اس ہرجائی نے
نہیں یاد کیا برسوں

اک لڑکی دوانی ہے
یاد اک بچپن کی
انمول نشانی ہے

ہم باغوں میں جاتے تھے
چھپ کر مالی سے
امرود چراتے تھے

فصلوں کی کٹائی ہے
ساگ پراٹھے ہیں
کہیں دودھ ملائی ہے

بیلوں کی جوڑی ہے
اس نے شرارت سے
میرے گاگر توڑی ہے

کہیں چاندنی چٹکی ہے
دنیا کہتی ہے
''گُڑی'' رستہ بھٹکی ہے

گندم کی بالی ہے
آدھے گھر والی
بڑے نخرے والی ہے

کسی بات پہ بھڑکی ہوں
سمجھا ہے کیا تو نے
میں گاؤں کی لڑکی ہوں

بڑی لمبی جدائیاں ہیں
پانچ میرے بھائی
اور دو ماں جائیاں ہیں

ولایتی ماہیے

یوکے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں

یہ کیسی ولایت ہے
کالوں کو جب دیکھو
گوروں سے شکایت ہے

یہ ایسی ولایت ہے
جس میں گوروں کو
کالوں سے شکایت ہے

انگلینڈ کے کیا کہنے
میموں نے گرمی میں
کپڑے ہی نہیں پہنے

بیڈ روم میں جاتے ہیں
نیند نہیں آتی
اب گولیاں کھاتے ہیں

کڑوے ہیں سُکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

گاڑی کا سٹیئرنگ ہے
محکمہ ویلفیئر کا
یہاں کتنا کیئرنگ ہے

بڑا مہنگا لیدر ہے
دل میرا گھبرائے
یہ کیسا ویدر ہے

سرخ دروازہ

کنگ وینکلس

ترجمہ: رضیہ اسماعیل

''سرخ دروازے سے ہشیار رہیں''

''Beware the Red Door''

ایڈم اپنے غبار آلود ذہن سے نشہ آور دوائیوں کے اثرات کو جھٹکنے کی کوشش میں پوری طرح مصروف تھا مگر اس کے ذہن میں یہ آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

وہ سیاہ دیواروں والی نیم روشن راہداریوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں نو ملی میٹر کا ایک آٹو میٹک پستول تھا۔ یہ ہتھیار اسے کس نے فراہم کیا تھا اور وہ یہاں سے کیسے بچ کر نکل سکے گا؟ ''سرخ دروازے سے ہوشیار رہیں'' اس آواز کی بازگشت ایڈم کے ارتعاش زدہ ذہن میں مسلسل گونج رہی تھی اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی تھی۔

ایڈم گرانٹ ایک سابقہ امریکی فوجی تھا جسے سیکرٹ گورنمنٹ انٹیلی جنس ٹریننگ پروگرام کا حصہ بننے پر آمادہ کیا گیا تھا۔

اس ٹریننگ پروگرام میں شمولیت کے بعد ایڈم کو محسوس ہوا کہ ٹریننگ پروگرام چلانے والے اہلکاروں کو یقین ہے کہ ایڈم کے پاس کچھ بہت اہم خفیہ معلومات تھیں جو اس نے افغانستان میں لڑائی کے دوران حاصل کی تھیں۔

ٹریننگ یونٹ کے کرتا دھرتا نے ایڈم سے اس سلسلے میں کئی سوالات بھی کیے تھے۔ تاہم یہ صرف سوالات نہیں تھے بلکہ ایک باقاعدہ تفتیش تھی جو کہ کنٹرول آفیسر ہنڈرسن اپنی تفتیش کے دوران بار بار یہ فقرہ دہراتا رہا کہ ''تم ہمیں ضرور بتاؤ گے'' اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر آنکھیں چندھیا دینے والی تیز روشنیاں ڈال دی جاتیں۔

ایڈم نے اس سے پوچھا کہ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر مجھے کچھ معلوم ہے بھی تو۔۔۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

نشے کے اثرات، غبار آلود ذہن، نہ ختم ہونے والی تیز روشنیاں اور مسلسل بے خوابی، کبھی تو اسے لگتا جیسے ہنڈرسن کی آواز کہیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ پھر وہ یہ خیال ذہن سے یکسر جھٹک دیتا۔ کیونکہ سرخ دروازے کے بارے میں جو آواز اس نے سنی تھی وہ ہنڈرسن کی آواز سے ذرا سی بھی مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ اچھی اور بری آواز کے فرق کو وہ واضح طور پر جانتا تھا۔ اچھی آواز جانی پہچانی سی، قابل بھروسہ حوصلہ بڑھانے والی اور اپنے اندر نرم گرم تمازت رکھتی تھی لیکن وہ ذہن میں مسلسل گونجنے والی آواز کے ماخذ کو پہچاننے میں ناکام تھا۔ عمارت کی بھول بھلیاں سیکرٹ یونٹ کی ٹریننگ کا ایک اہم حصہ تھیں کیونکہ ٹریننگ یونٹ کے اہلکار چاہتے تھے کہ ایڈم اپنی حرکات و سکنات سے خود اپنی حقیقت آشکارا کر دے۔

مسٹر ہنڈرسن نے اسے خبردار کیا کہ آگے دروازوں کی ایک قطار آ رہی ہے جو اسے مختلف آپشنز دے گی۔ تفتیشی افسر کا خیال تھا کہ وہ جو بھی راستہ منتخب کرے گا اور جس طرح کا عمل روا رکھے گا اس سے ان پر اس کی حقیقت کھل جائے گی۔

ایڈم کو لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی سازش میں ملوث کیا جا رہا ہو۔ ''آخر اس پستول کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کا درد اور بھاری پن یکدم کافور ہو گیا اور وہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایک دم چوکنا ہو گیا۔

ذرا آگے بائیں ہاتھ پر سیاہ دیوار میں ایک نمایاں سفید دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ایڈم دروازے کے باہر کھڑا ہو کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ جس پر ایگزٹ یعنی ''باہر نکلنے کا راستہ'' لکھا ہوا تھا۔ ''کیا اسے دروازہ کھولنا چاہیے؟ ان سرخ اور سفید رنگوں کا کیا مطلب ہے'' اسی شش و پنج میں مبتلا ایڈم نے دروازے کے ہینڈل کو چھوا مگر دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے بجائے وہ سیدھا آگے کی طرف بڑھ گیا۔ ''کیا وہ یاد رکھ پائے گا اگر اسے سفید دروازے تک پلٹ کر آنا ضروری ہوا تو کیا وہ واپس آ سکے گا؟'' اس نے سوچا اسی اثنا میں سفید دروازہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور وہ ایک بار پھر وہاں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔

آگے نظر آنے والا دروازہ سبز رنگ کا تھا۔ یہ سبز رنگ کیوں؟ وہ گہری سوچ میں تھا کہ مخصوص رنگوں کے استعمال کا یقیناً کوئی مطلب ہے اور یہ کسی نہ کسی خاص بات کی غمازی کرتے ہیں ایڈم نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا سوچو ایڈم۔۔۔ سوچو کیونکہ اسے یہ احساس تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ "Choices" وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے صحیح دروازے کا انتخاب کر لیا تو وہ وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ غلط انتخاب کی صورت میں ایک ٹریجڈی اس کی منتظر تھی۔

وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک ہی دائرے میں لگاتار چکر لگا رہا ہے۔ اگلا دروازہ۔ پھر ایک اور دروازہ۔ سفید اور سبز دروازے جنہیں وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکا جس سے اسے احساس ہوا کہ وہ کسی دائرے میں چکر نہیں لگا رہا تھا بلکہ مسلسل آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''سرخ۔۔۔ سفید۔۔۔ سبز!'' وہ دہراتا جا رہا تھا۔ ''سبز رنگ سے گھاس۔ فطرت اور مٹی یا زمین کا مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے اگر سبز رنگ زمین کی نمائندگی کرتا ہے تو پھر سرخ رنگ کو آگ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔'' ایڈم ان تمام رنگوں کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش میں اپنے ذہن پر بار بار زور دے رہا تھا۔ کچھ

سمجھ نہ پا کر اس نے خود کو سرزنش کی کہ ''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔یہ سب بکواس ہے۔ بس ابھی سوچتے رہو۔۔۔سوچتے رہو۔۔۔'' اس نے پھر سے بھول بھلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔ سیاہ اور تاریک راہداری میں سخت گرمی تھی۔ شدید حبس میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ پسینے کے قطرے مسلسل اس کے چہرے سے نیچے گر رہے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوئٹر اور جینز پہن رکھے تھے اور آٹو میٹک پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی مگر عدم تحفظ کا احساس بہت واضح تھا۔

ہوا کی کثافت سے وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ جگہ زیرِ زمین ہے اور کافی گہرائی میں ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ جگہ ٹریننگ یونٹ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے بالکل نیچے تھی۔ جہاں وہ ٹریننگ کے لیے پہلے دن آیا تھا۔ ''کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔ چند ہفتے یا چند دن'' اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ''جب اس نے پہلی مرتبہ ٹریننگ یونٹ میں رپورٹ کیا تھا تو اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے ہوئی تھی مگر ہنڈرسن تو محض ایک سراب تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ مسٹر ہنڈرسن کو پہلے بھی مل چکا تھا۔ شاید یہ بھی کسی اہم راز کا ہی حصہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے افغانستان میں ہوئی تھی۔ کہاں۔۔۔ کہاں۔۔۔!''

ایڈم کا مسئلہ ابھی تک جوں کا توں تھا۔ اسے ابھی تک سرخ دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس کے بارے میں اسے نیم غودگی کی حالت میں ایک آواز نے مطلع کیا تھا۔ ''سرخ دروازے سے ہشیار رہنا۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ ''سرخ دروازہ ملنے پر اس کا ردِعمل کیا ہوگا اور شاید یہی چیز اس کی زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگی!''

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ''آگ اور مٹی چار علامتوں میں سے دو علامتیں ہیں جبکہ ہوا اور پانی دیگر علامتیں ہیں۔ اس نے سوچا کہ سفید دروازہ یقیناً ہوا ہوگا۔ تو کیا وہ اس دروازے سے بچ کر نکل سکتا تھا!''

''آگ، ہوا، پانی، مٹی'' وہ سوچتا رہا کہ رنگوں کی طرح چاروں عنصری علامات کا بھی یقیناً کوئی مطلب ہے اور ان بھول بھلیوں کا خلق یقینی طور پر قدیم میتھالوجی سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ ایڈم نے اس سبجیکٹ کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ اس لیے اس کے ذہن نے اس کی یادداشت کے بند دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی۔ تاہم انسانی علم کی بنیاد اور تہذیب کے اسرار اس کے لیے کلی طور پر ناقابلِ فہم تو نہیں تھے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ اس دوران مسلسل بھاگتا رہا اس امید پر کہ اسے دوسرے دروازے بھی نظر آ جائیں تو وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکے کیونکہ وہ پوری تیاری کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ ''سفید رنگ کی اگر ہوا سے مماثلت ہے تو پھر یہ جھگڑے، تضاد اور کشمکش کی نشانی ہے۔ سبز رنگ زمین سے نسبت رکھتا ہے اور اس کی مماثلت۔۔۔؟ ان چار عناصر کی ترتیب اور کیا ہے'' اس کا ذہن الجھ سا رہا تھا۔ اس نے چاروں عناصر کی ترتیب کو تاش کے پتوں سے منسلک کر کے کچھ مزید سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں تاش کے پتوں کی ایک قدیم تاریخ ہے جس کا آغاز قسمت کا حال بتانے والے ٹاور کارڈز سے جا کر ملتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ''ٹاور کارڈز کی چار علامات کونسی ہیں۔ اگر سپیڈز کو تلوار سمجھ لیا جائے۔ لڑائی جھگڑے یا تضاد یا کشمکش کو ہوا (سفید رنگ) خیال کر لیا جائے۔ ڈائمنڈ والے کارڈز کو پینٹی کلز مان لیا جائے۔ زمین سبز رنگ کی ہے جو کسی شخص کی پریکٹیکل فطرت کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ڈالرز بزنس کاروبار وغیرہ وغیرہ۔''

تلوار تو پھر ملٹری یعنی فوج کا سمبل بھی ہے ان سب چیزوں پر غور و فکر کرتے کرتے اسے یہ سوچ کر قدرے مسرت کا احساس ہوا کہ اس نے سفید دروازہ نہیں کھولا وگرنہ وہ وہاں سے کب کا فرار ہو چکا تھا۔

تاش کے پتوں میں کلبز کا سمبل ٹاور میں وانڈز سے آیا ہے جو کہ خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جس میں تخیل سوچ بچار ذہنی استعداد اور ذہانت شامل ہیں یعنی اس لفظ کے بہت سے مطلب ہو سکتے ہیں۔

آگ کا نشان۔۔۔اسے علم تھا کہ یہ اس کا دشمن تھا۔ اور یہی سرخ دروازہ تھا جس سے اسے ہشیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چلتے چلتے اسے نیلے رنگ کا دروازہ دکھائی دیا۔ ایک ایسا رنگ جس کے بارے میں اس نے ابھی تک کچھ سوچ بچار ہی نہیں کی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑا جبکہ دائیں ہاتھ میں پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اور وہ اسے چلانے کے لیے بالکل مستعد تھا۔ اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا مگر فائر نہیں کیا کیونکہ اس کے ذہن میں نیلے رنگ کا مطلب یکدم واضح ہو گیا۔ ارے یہ تو پانی کی نشانی ہے جو کہ ٹارو کارڈز میں کپس، ہارٹس، آرٹسٹ، جذبات، محبت اور خوبصورتی کی علامت تھا۔

اس کے ساتھ وہ جیسے ہی اپنی سوچ کی گرفت سے آزاد ہوا ایڈم نے اپنے آپ کو ایک نہایت حسین و جمیل اور نازک اندام حسینہ کے بازوؤں میں پایا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اس قدر خوبصورت عورت شاید ہی دیکھی تھی۔ وہ اس کی چمکیلی زلفوں کی مسحور کن مہک سے مدہوش سا ہو رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے اس عورت کو قتل نہیں کر دیا تھا۔ وہ اس کے وجود کی نرماہٹ اور گداز سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔ اسے یوں مدہوش دیکھ کر عورت نے کہا کہ ''تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں ابھی ایک اور دروازہ تلاش کرنا ہے۔'' ایڈم نے عورت سے پوچھا ''کیا تم ایجنٹ ہو'' عورت نے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا ''ہم تمہارے مخالف نہیں ہیں بلکہ تمہارے حلیف ہیں۔''

''شاید یہ ان تمام لوگوں میں سے ایک ہے جو اس سے خفیہ راز جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' یہ سوچ کر ایڈم نے خود کو جلدی سے اس عورت سے الگ کیا۔ عورت تحکمانہ انداز میں بولی کہ ''سوچو۔ اپنے ذہن پر زور دو کہ تم کیا جانتے ہو اور تم کچھ تو جانتے ہو۔''

ایڈم نے جواب دیا ''ہاں میں جانتا ہوں سرخ دروازہ'' یہ کہہ کر وہ

راہداری کی طرف بھاگا۔جس سرخ دروازے کے بارے میں اسے خبردار کیا گیا تھا وہ اس کے سامنے آگ کے ایک گولے کی مانند چمک رہا تھا جو کبھی سرخ تو کبھی نارنجی رنگ میں تبدیل ہو جاتا۔اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا تو اسے ایسا لگا کہ جو آواز اس نے سنی تھی وہ یونٹ کے اندر سے نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ اس کے اپنے ذہن میں ابھری تھی۔اس نے سوچا اس کا ضمیر نہیں۔۔۔آواز باہر سے آئی تھی جو اسے بچانا چاہتی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت پر چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے۔اسے یاد آیا کہ ہنڈرسن افغانستان میں ظلم وتشدد روا رکھنے والے مرکز میں انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ بہت سی اموات، بُری طرح جھلسے ہوئے مردہ جسم، کئی دل خراش مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔اب تک وہ ان مناظر کو یاد کرنے سے احتراز کرتا رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا۔''کیا اس نے وہ سب کچھ دیکھا تھا یا اس کا وہم تھا کیا وہ وہاں پر موجود تھا۔ یا نہیں تھا۔مگر وہ تو اس علاقے میں موجود تھا۔ہاں اس نے سب دیکھا تھا۔۔۔!''

اب سرخ دروازہ۔۔۔اب وہ وقت آن پہنچا تھا جس کا وہ کافی دیر سے منتظر تھا۔ایک نہایت زیرک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔جس طرح کہ قرونِ وسطیٰ کے عہد میں ایک گنہگار اور مجرم کے درمیان فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہو۔

ایڈم نے زور سے دھکا دے کر جیسے ہی سرخ دروازہ کھولا۔ہنڈرسن وہاں پہلے سے موجود تھا۔ دونوں کے پستول سے بیک وقت گولیاں نکلیں۔ ہنڈرسن کی گولی ایڈم کے بازو کی کھال کو چیرتی ہوئی نکل گئی جبکہ ایڈم کا نشانہ بہتر تھا اور اس کے پستول کی گولی سیدھی ہنڈرسن کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو کر اس کے ماتھے پر ایک سرخ نشان چھوڑ گئی جس طرح ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر تلک لگاتی ہیں۔

''دشمن مر چکا تھا۔۔۔سرخ دروازہ تسخیر ہو چکا تھا۔''

عورت نے متجسس نگاہوں سے ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا تمہیں افغانستان میں ہونے والے ظلم وتشدد کے واقعے کا علم تھا۔''ایڈم نے اسے پیار سے بوسہ دیتے ہوئے جواب دیا''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن کیا ہوا تھا۔۔۔!''

حرمتِ قلم کی امین

رضیہ اسماعیل کی شاعری انسانی زندگی کے اُس نصف کے متعلق ہے جسے علامہ اقبال نے ''تصویرِ کائنات'' کا رنگ کہا ہے۔انھوں نے معاشرے میں عورت کے سماجی آشوب کا نہایت دردمندانہ نقشہ کھینچا ہے۔عورت کو عورت ہونے کا وقار بخشا ہے۔عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے احساس وتجربات اور مشاہدات کی مختلف سطحوں کو نہایت خوب صورتی سے چھوا ہے۔عورت کے احساسِ محرومی اور بے بسی کا حقیقی تجربہ اور مشاہدہ ان کی کتابوں ''میں عورت ہوں'' اور ''سن آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔رضیہ اسماعیل ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ماہرِ تعلیم، ادیبہ ،شاعرہ، مزاح نگار سماجی کارکن، حقوقِ نسواں کی علم بردار، حرمتِ قلم کی امین، دید سے دیدہ ور تک وہ کسی سے منافقت نہیں کرتیں۔ان کے پاس طنز کا نشتر بھی ہے۔ظرافت کا وٹامن بھی ہے۔ مزاح کا اینٹیسیپا بھی۔ جرأتِ اظہار، حریتِ فکر کو روبہ عمل لاتے ہوئے وہ کہہ رہی ہیں کہ زندگی کی اجتماعی جد و جہد میں عورت کا کردار تسلیم کیا جائے۔اس طرح معاشرہ وسعتِ نظر اور فکر وخیال کی ایسی ہمہ گیر صفت سے آشنا ہوگا جو قومی اور ملی فکر و وحدت کے لئے ناگزیر ہے۔اس لئے ہم سب کو رضیہ اسماعیل کی آواز سے آواز ملا کر کہنا ہوگا کہ آؤ ہم مل کے زمانے کو بتا دیں کہ وہ عورت جسے تم نے تصویر کہا، محض تصویر نہیں، منبعِ تنویر بھی ہے۔وہ فقط خواب نہیں، خواب کی تعبیر بھی ہے۔صرف توقیر نہیں، باعثِ توقیر بھی ہے۔

فرخ زہرا گیلانی

کانٹوں پہ چلتی رضیہ اسماعیل

رضیہ اسماعیل کی نثری نظمیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں عورت کے گرد گھوم رہی ہیں، جس میں عورت کی مظلومیت، بدلتے رشتے اور رشتوں کے بدلتے رویے خاص طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کو موضوع بنا کر خو تصویر کشی کی ہے وہ برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی ہمارے معاشرے کی عورت کی تصویر ہے۔بادلیر اور میلارے کا کہنا ہے کہ ''انسان کے تین رشتے ہیں اور وہ ہیں تنہائی، جنس اور مایوسی۔یہ ازلی ابدی رشتے ہیں۔'' اس بات کی روشنی میں بھی اگر ان کی نظموں کو دیکھا جائے تو وہ انہی تین رویوں کے گرد گھومتی نظر آئیں گی۔ رضیہ اسماعیل کی نظموں میں مایوسی بھی ہے جو معاشرے نے عورت کو دی ہے۔اس تناظر میں ان کی ایک نظم ''دردِ دل'' کے آخری مصرعے ہیں۔

کوئی جھونکا ہی ہوا کا
اسے لرزا دے گا
جس کی بنیاد ہی بے چینی ہو
بے یقینی کی ہراک خشت لگی ہو جس میں
ایسی بنیاد پہ کیا کوئی عمارت ٹھہرے

طارق شاہد

''نقشِ کہن''

نعتِ مصطفیٰ

رحمتوں نے بطحہ کو ہر طرف سے گھیرا ہے
ائے شہر جزاک اللہ کیا نصیب تیرا ہے

مشکبار دن تیرے خوش گوار راتیں ہیں
شام کیف افزا ہے دلنشیں سویرا ہے

ہیچ ہے تیری جنّت سامنے مدینے کے
تو مجھے بتا رضواں کیا خیال تیرا ہے

آس یہ لیئے دل میں میں کھڑا ہوں چوکھٹ پر
کاش آپ فرما دیں یہ غلام میرا ہے

زائروں کا جمگھٹ اور آپ کا حسیں روضہ
لگ رہا چندا کو چاندنی نے گھیرا ہے

آپ کے تصوّر سے قلب میرا روشن ہے
دور اب بہت مجھ سے کفر کا اندھیرا ہے

رہبرِ دو عالمؐ سے عشق ہے مجھے اکسیؔر
کیا میرا مقدّر ہے کیا نصیب میرا ہے

خوف کیا جہنّم کا ہو بھلا مجھے اکسیؔر
میرے دل میں آقا کی یاد کا بسیرا ہے

دین کے نگہباں ہیں میرے رہنما اکسیؔر
کیا ہوا اگر سارا دہر ہی لٹیرا ہے

محمد ہارون اکیسر
(مہاراشٹر، بھارت)

نذرِ امام عالی مقامؓ

کیا کر سکیں گے ہم کبھی مدحت حسین کی
پوچھے کوئی رسول سے عظمت حسین کی

تصدیقِ دینِ احمدِ مرسَل کے باب میں
کس درجہ معتبر ہے شہادت حسین کی

جانیں لُٹا رہے ہیں رہِ حق میں بے خطر،
دیکھو تو کربلا میں سخاوت حسین کی!

دُھل جائیں دل سے خوف کے نقشِ کہن سبھی!
ہو جائے اب تو چشمِ عنایت حسین کی!

عہدِ ستم میں آج پھر شدت سے دوستو!!
''محسوس ہو رہی ہے ضرورت حسین کی!!''

ہر فکرِ حرّیت کی جِلا ہے حسینیت،
ہر ایک حُر پہ اب ہے حکومت حسین کی!

ہو جس کے دل میں عشقِ رسولِ خدا انیسؔ!
لازم ہے اُس کے دل میں محبت حسین کی

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

نادیدہ فصیل

انِل ٹھکّر
(ہبلی، بھارت)

لمحہ بھر وہ رکا۔
ایک نظر راستے پر ڈالی۔
تیز گام سڑک کو دیکھ کر اس کی کپ کپی چھوٹ گئی۔ یہ کپ کپاہٹ جاڑے کے باعث نہیں تھی۔ حالانکہ فضا میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کی لرزش اس کے عمر کا تقاضا تھی۔ اس کی وجہ ذہن پر لدا خیالوں کا بوجھ تھا۔ دل میں لے رہی یادوں کی کروٹوں کی رنجش تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی تیز اور سڑک سے ہم قدم ہو کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ سڑک کو دیکھا۔ لمبا سانس چھوڑا۔ من کو سمیٹا اور یہ سوچتے ہوئے اپنے سست قدم تیز اور سڑک پر رکھے کہ یہ سڑک کئی مرتبہ اس قدموں سے گزری ہے!! کل تک یہ میرے قدموں سے قدم ملا نہیں سکتی تھی اور آج۔۔۔ ہلکی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اونچی محراب نما پھاٹک سے وہ یونیورسٹی کے احاطے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

اپنے دائیں جانب کے Play Ground سے چند ڈگ آگے بھرے نہیں کہ اسے یونیورسٹی کی عمارت نظر آئی۔ اس نے اپنے وجود میں ہیجان سا محسوس کیا۔ پتھر سے تعمیر کی ہوئی یہ عمارت آج بھی جوان نظر آئی۔ اس نے عمارت کی دوسری منزل کے ایک چھور سے دوسرے چھور تک دو مرتبہ نظروں سے سفر طے کیا۔ وہ مایوس ہوا۔ دوسری منزل پر اپنے چیمبر کی صحیح نشان دہی کرنے میں وہ ناکام رہا۔ دل میں آیا وہاں جا کر دیکھے کہ اس چیمبر میں کون پروفیسر تشریف فرما ہے! مگر پھر اس نے اس ارادے کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر کے آگے چوراہے پر پہنچا۔ دیکھا وہاں یونیورسٹی کے اولین وائس چانسلر کا Statue کہرے میں نہایا ہوا چمک رہا ہے۔ وہ بائیں طرف کے راستے پر چل پڑا۔ آگے چل کر وہ راستہ دائیں جانب مڑ کر بل کھاتا ہوا اونچائی کو چھونے کو گامزن تھا۔ اس کی چال سست ہو گئی۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد وہ اس بنگلے کے روبرو پہنچا جس کا دیدار کرنے کی کئی سو میلوں کی مسافرت کر کے یہاں آیا تھا۔ جس بیرے کو وہ پچاس سال پہلے چھوڑ گیا تھا، آج اس کے روبرو ایک گناہگار کی طرح کھڑا تھا۔ گارے اور مٹی کا مکان وہی تھا۔ ہاڑ مانس کا بنا اس کا جسم بھی وہی تھا مگر وقت نے ان دونوں کو خستہ کر دیا تھا۔ کبھی پھاٹک پر اس کے نام کی تختی لگی رہتی تھی آج کسی اور کی نمائندگی کر رہی تھی۔

آج پچاس سال بعد۔۔۔ دنیا بھر کی خاک چھان کر وہ اپنے اس آشیانے کے سامنے گناہگار بنا ٹھہرا تھا۔ جہاں اس کی زندگی کا حسین، خوش گوار رنگین دور گزرا تھا۔ جہاں ہمیشہ بہتے دریا کی طرح ہنسی مذاق، لطیفوں اور دل چسپ فقروں کی لہریں ہچکولے لیا کرتیں۔ ہنسی مذاق اس کی فطرت میں شامل تھا۔ سنجیدگی اسے چھو تک نہیں گئی تھی۔ بڑی سے بڑی بات قہقہوں میں اڑا دینا اس کی عادت تھی۔ فلسفہ اس کا موضوع تھا۔ یونیورسٹی کے دوسرے اساتذہ اور طلبہ اس کی اس شوخ طبیعت کے دلدادہ تھے مگر ایک دن اسی مذاق پسند اس کی فطرت نے اس کی زندگی میں طوفان برپا کر دیا۔ پلک جھپکتے ہی اس کے آشیانے کا تنکا تنکا بکھر کر رکھ دیا۔ آشیانے کی نیو ہلا دی۔ ہنسی مذاق کی جھیل خشک ہو گئی۔ قہقہے فضا میں تحلیل ہو گئے۔ ایک مذاق کی اتنی بڑی سزا!!! جس سزا کی وہ پچھلے پچاس سالوں سے بھگت رہا ہے۔ ایک مذاق سے وہ گناہگار کیسے بن گیا؟؟ اس کے مذاق نے اسے گناہگار قرار دیا۔ سحر کے عقیدے نے دونوں کے رشتوں کے درمیان علیحدگی کی لکیر کھینچ کر اسے معاشرے کی نظروں میں گناہگار ثابت کر دیا۔ ویسے سحر بھی اپنے فیصلے سے مجروح تھی۔ اس کا دل بھی چھلنی چھلنی ہو رہا تھا مگر اس کا عقیدہ اس کے لیے حکمِ الٰہی تھا۔۔۔

وہ پاس کی پُلیا پر ڈھیر ہو کر دم سادھے بیٹھ گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد طبیعت بحال ہوئی کہ اس کی نظر سامنے کے بنگلے کی کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی پر پردہ ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اسے یاد آیا۔۔۔ یہی کمرا اس کی خواب گاہ تھا۔ اس رات وہ تکیہ گود میں لیے، پلنگ پر بیٹھا کل کلاس میں پڑھانے کے موضوع پر سوچ رہا تھا۔ تبھی ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ کھڑکی کا پردہ کسی دوشیزہ کی چُنری کی طرح لہرا اٹھا۔ اس نے محسوس کیا، جیسے عمر خیام کی رُباعی رقص کر رہی ہے۔ اتفاقاً سحر نے اس وقت کافی کا کپ پلنگ کے پاس کی تپائی پر رکھا اور لوٹتے ہوئے بولی: آپ کافی پی لیں ٹھنڈی ہو جائے گی۔

اس نے جھٹ سے سحر کی کلائی تھامی اور اسے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ سحر نے شوہر کی نیت کو بھانپ لیا۔ بولی۔۔۔ میں نے کہا نا کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ آپ کافی پیجیے میں ابھی آئی۔

وہ تو تم آؤ گی ہی، ابھی تو ایک۔۔۔
ابھی نہیں۔۔۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔
ابھی کیوں نہیں؟
میں جانماز بچھا کر آئی ہوں۔ نماز۔۔۔
صبح سے چار مرتبہ تو نماز پڑھی ہے۔ بس ایک بوسہ لینے دو، پھر پانچویں بھی پڑھ لینا، کون روکتا ہے۔
وہ من مانی پر آمادہ ہوا۔
نہیں ابھی نہیں۔۔۔ Please
مگر کیوں نہیں؟
مجھے وضو تازہ کرنا پڑے گا۔۔۔ سحر نے کلائی چھڑا کر دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔۔۔ بعد عبادت کے جتنا چاہو حسرت پوری کر لینا۔
دیکھو، تم ابھی لینے نہیں دو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔

سحر نے اس کی گیدڑ بھبکی کو نظر انداز کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔
ہمت ہے تو دے کر دیکھو۔
وہ اچھل کر سحر کی طرف بڑھنے لگا۔
آگے مت بڑھنا، انجام اچھا نہ ہوگا۔۔۔سحر کھلکھلاتے ہوئے پلٹی اور الٹے قدم پیچھے کی جانب سرکتے ہوئے بولی۔
جی سکو کے میرے بنا؟
میں طلاق دیتا ہوں تمہیں۔۔۔اس نے بے ساختہ ڈرامائی انداز میں کہا۔
سحر دھک سے رہ گئی۔اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔وہ اپنے شوہر سے ایسی امید خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔سحر کے چہرے کی اڑی رنگت اور بدحواسی کا لطف اٹھاتے ہوئے بے نیازی سے ٹھہا کا لگایا۔۔۔
میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔
سحر کی دھڑکنیں مانو رک گئیں۔وہ تھراتے ہوئے چیخ اٹھی۔۔۔
تمہیں میری قسم آگے کچھ مت کہنا۔
بیوی کی بے بسی کا لطف اٹھاتے ہوئے اس نے پیار سے باہیں پھیلائیں، آگے بڑھتے ہوئے عاشقانہ انداز میں بولا۔
میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔
سحر پر منوں بجلی کڑکی، اس کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلا۔سحر کی یہ حالت دیکھ کر اس کے دل میں رحم اُمڈ آیا۔وہ بڑی چاہ سے اسے بانہوں میں لینے آگے بڑھا تو سحر پر اب کی مرتبہ بجلی ٹوٹی، جو پل بھر میں اس کی محبت اور رشتے کو جلا کر کوئلہ کر گئی۔اس کو اپنی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر اس کے باطن میں پوشیدہ عورت کڑکی۔۔۔خبردار، جو مجھے چھوا تو!
بیوی کی گرجتی کڑاکے دار آواز اور شعلہ بار آنکھیں دیکھ کر وہ لمحہ بھر تو سہم گیا۔پاؤں نے جیسے زمین پکڑ لی۔وہ سمجھ نہیں پایا، اچانک سحر کا موڈ کیوں بگڑ گیا۔اس نے اس کا موڈ بحال کرنا چاہا مگر سحر کی سرخ آنکھیں دیکھیں تو محسوس کیا یہ آنکھیں اسے جلا کر راکھ کر دیں گی۔تبھی سحر نے انگارے برساتی نظروں سے کہا:
اب تمہارا، میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔
چھوڑو یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔تم بیکار میں Serious ہو رہی ہو۔سحر کا غصہ طوفان پر آ گیا۔
تم نے صرف میری محبت اور رشتے کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ شریعت اور مذہب کو بھی مذاق بنانے کی حماقت کی ہے۔
Come on Now بیکار میں بات کا ناڑا پکڑ کر مت بیٹھو۔
تمہارے لیے شریعت اور مذہب بے کار کی بات ہو سکتی ہے میرے لیے نہیں۔
وہ پلٹ کر تیزی سے پلنگ پر آ کر بیٹھا اور بولا۔
چلو ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو میں اپنی غلطی مان لیتا ہوں۔جو ہوا مذاق میں شروع ہوا تھا نا؟ پھر یہاں اور کون ہے؟ ہم دونوں کے سوا؟ مذاق سمجھ کر بُھلا دو۔کسی نے سنا کہ میں نے طلاق دیا!!
سحر بھڑک اٹھی۔۔۔
ان دیواروں نے سُنا۔میں نے سنا۔میرے اللہ نے سُنا۔
اتنا کہہ کر اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔اسے جاتا ہوا دیکھ کر یہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔منت آمیز لہجہ میں بولا۔۔۔
سحر، Please ایک منٹ۔۔۔
وہ رکی۔
اس کا کوئی علاج نہیں؟
وہ اس کے جانب مڑی۔۔۔
ہے۔ایک علاج ہے۔
کیا؟
حلالہ۔
ناممکن۔۔۔اس کی آواز اکھڑ گئی۔
ہم دونوں کے درمیان ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے تم نے جسے حلالہ کے بغیر نہ میں عبور کر سکتی ہوں نہ اسے پھاند کر تم میرے ساتھ زندگی کر سکتے ہو۔
وہ کچھ کہے اس سے قبل سحر پلٹی۔خواب گاہ سے نکل کر دھماکے کے ساتھ دروزہ بند کیا اور تڑاک سے Aldrop لگا کر دروازہ بند کر دیا۔
اس رات کے سانحہ کے دوسرے روز وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملی اور اپنے رشتے کی بند مٹھی کھول کر اپنے لیے علیحدہ کوارٹر کی گزارش کر کے الگ ہو گئی۔راز کھُل گیا۔وہ اپنے ساتھیوں اور طلبہ کی نظروں سے گر گیا۔اس کا دم اس ماحول میں گھٹنے لگا۔اس نے کوشش کر کے اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا۔
آج پچاس سال بعد دھماکے کی وہی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اس نے اپنے خیالوں کے گرداب سے باہر آ کر دیکھا وہ بنگلہ تماشبین کی طرح ٹھہرا ہوا ہے۔اس نے آہ بھری۔سوچا۔۔۔تب تنکا تنکا جوڑ کر بنایا گھونسلہ پل بھر میں بکھر گیا! وہ تو میری محبوبہ تھی، ہم سفر تھی، رفیقۂ حیات تھی، پھر یہ سب۔۔۔؟ جس جواب کی جستجو مجھے آج بھی ہے وہ جواب مجھے کب اور کہاں ملے گا؟؟
وہ تو ہے نہیں، جس نے علیحدگی کا فیصلہ لیا۔اس کا فیصلہ غلط تھا یا میرا مذاق!!۔۔۔جانے کہاں ہوگی وہ؟ کس حال میں۔۔۔اس نے ایک لمبا سانس چھوڑا۔گھٹنوں پر زور دے کر اٹھا۔سامنے سے ایک شخص آتا ہوا نظر آیا۔اس کا لباس، جوتے، سر پر منکی کیپ یہ بتا رہے تھے کہ وہ صبح کی سیر کو نکلا ہے۔وہ قریب آیا اس نے دیکھا کچھ بھی تو نہیں بدلا! وہی گول مٹول جسم، وہی ہاتھی کے بچے سی جھولتی ہوئی چال، گلے میں تلسی کی مالا۔ہاں بال ضرور سفید ہو گئے تھے۔وہ روبرو

ہوا تو یہ چپ نہ رہ سکا۔۔۔

Good Morning Sharma Ji.

وہ شخص سلام جھلتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ بولا۔

جی۔۔۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں!

میں، اشفاق ملک۔

شرما جی کا تجسس کم نہیں ہوا۔

ڈاکٹر اشفاق ملک۔

شرما جی نے یادداشت پر زور دالا۔ ان کی پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں۔ ذہن کے ساتھ آنکھیں باریک ہو کر یاد تازہ کرنے کو شاں نظر آئیں۔ یک لخت ماتھے کی لکیریں ٹھیک ہو گئیں۔ آنکھیں حیرت اور خوشی سے چوڑی ہو کر مسکرا اُٹھیں۔

اوہ۔۔۔ اوہ ڈاکٹر ملک،

Head of Department of Philosophy

اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر اشفاق کا ہاتھ تھام لیا۔

Yes, Yes صحیح پہچانا۔

کہاں ہیں آج کل؟

امریکہ میں۔ برسوں بعد لوٹا ہوں۔ آپ ابھی تک Retire نہیں ہوئے؟

برسوں ہو گئے Retire ہوئے۔ میرا بیٹا پروفیسر ہے یہاں۔ اسی کے ساتھ رہتا ہوں۔

کچھ لمحے وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خاموش رہے۔ ملک سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

شرما جی، ان دنوں یہاں ایک میڈم ہوا کرتی تھیں، سحر یاد ہے آپ کو؟

ہاں، ہاں، بالکل وہ جن کو آپ نے Divorce دیا تھا۔

ملک کے دل کو ٹھیس پہنچی مگر کیا کرتے! نظر انداز کر کے کہا۔

ہاں وہی۔

وہ بھی Retire ہو گئیں۔

ملک کے چہرے پر ہلکا سا تبسم اُبھرا۔ بولے۔

یہ تو میں بھی سمجھ سکتا ہوں شرما جی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں Retire ہونے کے بعد وہ۔۔۔

وہ یہیں ہیں۔۔۔

ملک کا دل کھل اُٹھا۔ وہ کچھ کہیں اس سے قبل شرما جی بولے۔

آگے جا کر یہ راستہ بائیں جانب اسٹیشن کی طرف مڑتا ہے۔ اسی راستے پر ایک اِک منزلہ مکان ہے ''کہکشاں'' وہی ان کا گھر ہے۔

ملک نے شرما جی سے اجازت مانگی۔ وہ آگے بڑھے۔ کہرا چھٹ چکا تھا۔ نرم دھوپ پاؤں پسار رہی تھی۔ وہ اپنے ماضی کے سائے کے ساتھ نرم دھوپ کے ساتھ ہم قدم ہوئے۔ یادوں کا سایہ آگے آگے وہ اس کے پیچھے یہ سوچتے ہوئے بڑھتے رہے کہ یہ عورت بھی ایک عجیب شے ہے!! خالقِ کائنات نے عورت کو بنایا تو مرد کی ایک ہی پسلی سے مگر وہ مرد کی باقی پسلیوں سے بہت آگے نکل گئی۔ بنانے والے نے اس کی ایک پسلی سے کتنا بڑا کرشمہ کر دکھایا!!! اس پسلی سے کیسے کیسے بلند پایہ کردار تخلیق کر دئے۔ ایک ہی پسلی سے ماں بنائی، بیٹی اور بیوی کو تراشا۔ جسے دیکھکر مرد کی باقی پسلیاں دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ گئیں۔ سحر بھی اس کرشمے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے ورنہ لاوارث نوزائیدہ بچی جو ایک تانگہ چلانے والے کو علی الصبح اسٹیشن کا پھیرا لگا کر لوٹتے وقت کوڑے کے ڈھیر پر نظر آئی۔ وہ اسے گھر لے آیا۔ اولاد نہیں تھی۔ میاں بیوی نے اللہ کی نعمت مان کر پالنا طے کیا۔ شوہر نے بچی کے کان میں کلمہ پھونکا اور اسے اسلام کی گود میں دیا۔ نام سحر دیا۔ اسلام کی گود کا لمس پاتے ہی بچی نے شریعت کا دامن تھام لیا۔۔۔

شرما جی کے بتائے راستے پر چلتے ہوئے سڑک جہاں اسٹیشن کے جانب مڑی تو وہ اسی طرف ہو لیا۔ منزل قریب آتی دیکھ کر اس کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ جسم چست ہو گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد راستے کے سامنے کی طرف زمین کے چھوٹے سے خطہ پر ایک خوبصورت اک منزلہ مکان پر اس کی نظر پڑی۔ پھاٹک کے ستون پر سنگِ مرمر کی تختی پر ''کہکشاں'' کھُدا ہوا نظر آیا۔ اس نے مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے سڑک عبور کی۔ پہلی منزل پر نظر گئی تو دیکھا وہاں ہاتھ سے لکھا اشتہار دیوار پر چسپاں تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ To-let یک لخت اس نے منصوبہ بنا لیا وہ پھاٹک کے قریب گیا۔ پھاٹک کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا نہیں کہ احاطہ کے بائیں جانب سے نسوانی آواز آئی۔

Yes?

اس آواز کی سمت دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ وہی تھی۔ سحر طشتری میں بغیہ کے تازہ پھول لئے دودھیا ساڑھی میں ملبوس، حسن ویسا ہی مگر ترکش میں تیر ندارد تھے۔ کسی کہکشاں سی پھیکی روشنی کا شرارہ لئے، جِتا کے بالوں میں چاند کی کرنوں سا اِکا دکا بال آنے والے دنوں میں یہاں ان کی فوج اُترنے والی ہے اس کی منادی کرتے نظر آئے۔

اجنبی کو اپنی جانب گھورتا دیکھ تو اس نے سوال کیا۔

Yes, what do you want?

سوال سن کر اس کا حلق خشک ہو گیا مگر حوصلہ قائم رکھتے ہوئے کہا۔

جی، یہ To-Let کا بورڈ دیکھا تو آ گیا۔ مجھے کرائے کے گھر کی ضرورت ہے۔

فی الوقت کہاں رہتے ہیں؟

کل سے ہوٹل میں ہوں۔ پردیس سے آیا ہوں۔

ٹھیک ہے میں خادمہ کو چابی دے کر بھیجتی ہوں آپ گھر دیکھ لیں۔

اس میں دیکھنا کیا ہے چار دیواریں اور چھت کافی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔

اب سحر کو مجبوراً عجیب وغریب باتیں کرنے والے کو دیکھنا پڑا۔ سر کے بڑھے ہوئے سفید بالوں پر گولف کیپ، سفید داڑھی، موٹے شیشے کا چشمہ، ٹی شرٹ اور نیلے رنگ کی جینز پینٹ۔ وہ کچھ سوچے اس سے قبل اس نے کہا۔

آپ کرایہ بتا دیجیے میں سامان لے آتا ہوں۔

کرایہ مہینہ ایک ہزار۔۔۔

ٹھیک ہے، میں سامان لے آتا ہوں۔

وہ پلٹتے ہوئے رکا، پوچھا۔۔۔ یہاں کہیں تانگہ ملے گا؟

آگے نکڑ پر مل جائے گا۔

Thank You کہتے ہوئے وہ چل دیا۔ سحر اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اسے یاد آیا تو اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی کہ اس نے کرائے دار کا نام تک نہیں پوچھا۔ اس نے بوڑھی خادمہ کو چابی دے کر اوپر کا گھر صاف کرنے کو کہا۔

شام کے سائے ڈھلنے سے پہلے سامان سے لدا تانگہ کہکشاں کے سامنے آ کر رکا۔ وہ اپنا سوٹ کیس اور بریف کیس لے کر اُترا۔ دوسرا سامان جو اس نے بازار سے خریدا تھا گادی، چادر، تکیہ، برتن اور سٹوو وہ سامان تانگے والے نے لا کر سیڑھیوں کے پاس رکھا۔ آہٹ سن کر سحر نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اس نے خادمہ کو چابی دی اور سامان اوپر لے جانے میں اس کی مدد کرنے کی ہدایت کی۔ سامان پہنچانے کے بعد خادمہ جانے کو تھی اُس نے اسے روکا۔ ایک لفافہ اس کو دیتے ہوئے کہا۔

خالہ، یہ مالکن کو دینا۔ اس میں بارہ مہینوں کا کرایہ پیشگی ہے تاکہ انہیں ہر مہینہ مانگنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے بیس روپے نکال کر خالہ کے ہاتھ پر رکھے۔

یہ آپ کے لیے۔

نہیں جی، نہیں۔۔۔ خالہ نے کہا۔

رہنے دیجیے۔ آپ نے میرے کام میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اس کے اسرار کرنے پر خالہ نے پیسے رکھ لیے۔ دن گزرتے گئے۔ کسی نہ کسی ضرورت کی بنا پر خالہ کا اوپری منزل پر آنا جانا لگا رہا۔ سحر جب بھی کرائے دار کو خالہ سے بات کرتے سُنتی تو اسے رہ رہ کر گمان ہوتا کہ یہ آواز جانی پہچانی سی ہے! وہ کیا اندازہ لگاتی!! اسے آج تک کرائے دار کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ وہ خالہ سے نہ کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کا نام پوچھ کر اسے بتائے۔ اتفاقاً ایک روز سحر کا وکیل مکان کے ٹیکس کے سلسلہ میں ایک کیس میونسپالٹی کے خلاف کورٹ میں تھا اس سلسلہ میں آیا اسے خیال آیا اس نے سوچا یہ موقع اچھا ہے کرائے دار کا نام جاننے کا۔ اس نے وکیل سے کہا ایک Rent Agrement تیار کرائے پھر کرائے دار کے دستخط لے۔

شام کو وکیل Agrement لے کر اوپری منزل پر پہنچا۔ اجنبی کو دیکھ کر ملک نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وکیل نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ایگریمنٹ پیپرز اس کے حوالے کیے۔ اس نے اپنا نام لکھا اور دستخط کر دیے۔ وکیل کو حیرت ہوئی اس نے پوچھا۔۔۔ آپ نے اسے پڑھا نہیں؟

پڑھنا کیا ہے۔۔۔ ان کا مکان ہے کہیں گی تب خالی کر دوں گا۔

سحر نے ایگریمنٹ میں نام پڑھا تو سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا شک گہرا گیا۔ اس نے اپنا نام اشفاق۔ ایم لکھا تھا۔ سحر نے اس کے دستخط کی تحریر دیکھی تو اس کا شک پختہ ہو گیا۔ رات کو کروٹیں بدلتے ہوئے وہ سوچتی رہی۔ اس شخص کو یہاں رہنے دیا جائے یا نہیں؟ اس کا ذہن اور دل آمنے سامنے آ گئے۔ دل نے کہا تمہیں شک ہے، شک حقیقت پر ضروری تو نہیں۔ ذہن کہہ اٹھا۔۔۔ اگر یہ وہی ہے تو یہاں آیا ہی کیوں؟ دل طرفداری پر آمادہ ہوا۔ ہوسکتا ہے اس نے تمہیں پہچانا نہ ہو۔ اس نے کبھی تم سے کوئی بات کرنے کی نہ کوشش ہی کی۔ وقت ضرورت خالہ سے دو بول بول لیتا ہے، ورنہ اپنے گھر میں کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ Transister پر انگریزی خبریں سنتا ہے۔ کبھی باہر چکر لگا آتا ہے۔ ذہن نے اپنی بات رکھتے ہوئے زور لگایا۔۔۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں وہ اشفاق ملک ہے یا نہیں؟ دل ناراض ہو کر بولا۔۔۔ مگر کیوں؟ وہ تمہارا کرایہ دار ہے بس۔ تم اپنے ایمان پر قائم رہو۔ وہ کوئی بھی ہو، تمہیں اس سے کیا؟ اس طرح ذہن اور دل میں کش مکش ہفتوں جاری رہی۔

ایک شام ملک باہر جانے کے لیے زینہ اُتر رہا تھا۔ اس نے دیکھا نیچے سحر کسی آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ سحر نے اسے آتا دیکھا تو اندر چلی گئی وہ نیچے اترے تب تک خالہ باہر آئی۔ اس نے ملک سے پوچھا۔

صاحب، آپ باہر جا رہے ہیں؟

ہاں۔ بازار جا رہا ہوں۔ کچھ منگوانا ہے؟

خالہ خاموش رہی۔ تبھی پردے کے پیچھے سے سحر کی آواز آئی۔

دو تین دنوں سے نیچے کے باتھ روم کی چھت میں سیلن پیدا ہو گئی ہے۔ پانی ٹپکنے کو ہے۔ انجینئر نے آدمی بھیجا ہے اس کا کہنا ہے اس کے لیے آپ کے باتھ روم کا فرش درست کرنا ہوگا۔

اچھی بات ہے۔ میں چابی دے جاتا ہوں مجھے لوٹنے میں وقت تو لگ ہی جائے گا۔ اُمید ہے تب تک آپ کا کام ہو جائے گا۔

ملک کے جاتے ہی وہ کاریگر اور خالہ کے ساتھ اوپر کی منزل پر دیکھنے آئی کہ مسئلہ کیا ہے۔ کاریگر نے معائنہ کر کے کہا۔۔۔ میڈم ٹائلز کے جوڑ کھل گئے ہیں۔ میں وائٹ سیمنٹ بھر دیتا ہوں ٹھیک ہو جائے گا۔

کاریگر نے کام شروع کیا۔ خالہ نگرانی کرتی رہی۔ سحر بیٹھک میں آئی۔ بیٹھک کو خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کھڑکی کے پردے صاف

ستھرے اور جاذبِ نظر تھے۔ کھڑکی کے قریب میز، کرسی، میز پر ایک کنارے تین موٹی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں لکھنے کے سفید کاغذ، پاس میں قلم نظر آیا۔ دیوار کو لگ کر Book Shelf جو کتابوں سے لدا ہوا تھا وہ Book Shelf کے پاس گئی۔ دیکھا کتابیں قرینہ سے رکھی گئی تھیں۔ تبھی اس کی نظر ایک موٹی کتاب پر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔

Philosophy and Religion اس کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ اس نے اشتیاق سے کتاب کھینچ نکالی۔ اس نے کتاب کے Cover کو دیکھا۔ عنوان پڑھ کر نظر نیچے گئی تو اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ وہاں لکھا تھا By Dr. Ashfaq Malik۔ یک لخت اسے ایسی خوشی محسوس ہوئی جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ اس نے دیکھا کتاب کیلیفورنیا یونیورسٹی سے شائع کی گئی تھی۔ کچھ لمحوں میں ہی جیسے اس نے ڈاکٹر ملک کا برسوں کا سفر نامہ پڑھ لیا۔ اس نے کتاب کھولی صفحہ اول پر تین سطروں میں انتساب لکھا ہوا تھا۔

Dedicated to Saher who inspired me to write this book.

اس کا پورا وجود لرز گیا۔ وہ سمجھ نہیں پائی یہ زلزلہ کی تھرتھراہٹ تھی یا روح کے تاروں کے کانپنے کی جھنکار تھی! وہ پسینے سے تر ہوگئی۔ سانس تیز چلنے لگا۔ گھٹنوں کی قوت کند ہوگئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر بعد جب خیالوں کے بیابان سے باہر آئی تو اس نے ایک نظر حسرت سے کتاب کو دیکھا اس کے دل میں ٹھیس اٹھی۔ کاش یہ کتاب میں پڑھ سکتی۔ اس نے قلم لے کر ہتھیلی پر کچھ لکھا۔ پھر پلو سے کتاب کو پونچھا اور Book Shelf میں جہاں سے کتاب لی تھی وہیں رکھ دی اور کتاب پڑھنے کی کسک سمیٹے نیچے آئی۔

سحر جس کسک کو لے کر ملک کے گھر سے لوٹی وہ کسک رفتہ رفتہ گہراتی گئی۔ جس سے اس کے نہاں خانہ دل میں ملک کی محبت جو نیم بے ہوشی کے عالم میں پنہاں تھی وہ ہولے ہولے بیدار ہونے لگی۔ اب اس کے لیے ملک صرف کرائے دار نہ رہ کر جذباتی قربت کا وسیلہ بننے لگا تھا۔ آئے دن اس کے پسند کا پکوان بنا کر خالہ کو یہ کہہ کر اوپر دے آنے کو کہتی۔۔۔ اکیلے ہیں، جانے کیا روکھا سوکھا کھاتے ہوں گے۔

ملک بھی سحر کے خشک رویہ میں آئی تبدیلی سے خوش تھا مگر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ سحر نے بھی دونوں کے درمیان کی دوری کو بنائے رکھا۔ برسوں پہلے ملک کی کھڑکی کی گئی فصیل سے کان لگا کر دونوں ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔ اس فصیل کو عبور کرنے یا پھلانگنے کی جرأت کسی نے نہیں کی۔ صرف خاموشی سے قربت کی حرارت کے سہارے جیتے رہے۔

ایک روز سحر باورچی خانہ میں بھنا ہوا گوشت اور جوار کی نرم روٹیاں سینک رہی تھی۔ ملک کو یہ دونوں چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ بڑے چاؤ سے لطف اٹھاتا تھا۔ وہ اپنا کام پورا کر کے ہاتھ دھو رہی تھی تبھی اس کے پیٹ کے نیچے کے حصے میں ران کے قریب شدید درد اُٹھا۔ ویسے تو وہ درد پچھلے کچھ مہینوں سے ہلکا ہلکا اٹھتا رہتا تھا جسے وہ نظر انداز کرتے آ رہی تھی۔ آج اس کی شدت کچھ زیادہ تھی۔ چلنا، ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ شام تک درد سے تھوڑی راحت محسوس ہوئی تو وہ اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی بات سُنی معائنہ کیا اور کہا۔

آپ کو Hernia کی تکلیف ہے۔ آپریشن کروا لیجیے۔ آرام ہو جائے گا۔

کیا کوئی اور علاج نہیں؟

ہے۔ دوائیاں، بیلٹ باندھنا مگر پھر بھی کہہ نہیں سکتے۔ اچانک کب آپریشن کی ضرورت پڑ جائے۔

سحر پریشان ہوگئی۔ اسے فکر میں دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا۔۔۔

گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سا آپریشن ہے دو روز ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ مجبوراً سحر جی کڑا کر کے تیار ہوگئی۔ آپریشن ہوا۔ دو روز بھی گزر گئے۔ ہسپتال سے چھٹی ملی تو سحر نے ڈاکٹر سے بل جاننا چاہا۔ ڈاکٹر نے الجھن محسوس کی۔ پھر کہا۔

میڈم میں شش پنج میں ہوں۔

کس لیے؟

میں طے نہیں کر پا رہا۔ آپ سے بل لوں یا نہیں۔

ایسی کیا بات ہے؟ سحر یہ کہتے ہوئے مسکرائی۔

بات یہ ہے میڈم۔۔۔ میں نے آپ کا آپریشن کیا ہے اور نہیں بھی۔

Doctor, Please جو کہنا ہے صاف صاف کہیے۔

میڈم، میں نے آپریشن کے لیے شگاف ڈالا، جلد ہٹائی تو آپ کے Hernia کو لگ کر ایک پھوڑا نظر آیا۔۔۔

تو اسے بھی نکال دیتے۔۔۔ سحر نے کہا۔

ممکن نہیں تھا۔ اسے چھونا خطرے کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

تو اب۔۔۔؟ سحر کی آواز میں گھبراہٹ نظر آئی۔

دیکھئے، آپ پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔۔۔

Doctor Please tell me the truth.

جو آیا ہے، اسے جانا تو ہے ہی آج نہیں تو کل۔

سحر سمجھ گئی۔ اس نے اللہ کو یاد کیا۔ سنبھل کر خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

ٹھیک ہے۔ یہ پھوڑا مجھے کتنی مہلت دے گا؟

یہ تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دن، ایک سال، تا عمر۔۔۔ جس دن یہ پھوڑا پھوٹے گا۔۔۔ آپ فوراً محسوس کریں گی۔۔۔

شکریہ۔۔۔آپ نے مجھے آگاہ کر دیا۔آپ اپنا بل لیں۔میں مقروض ہوکر مرنا نہیں چاہوں گی۔

زندگی سے رخصت ہونے کا پروانہ لے آنے کے بعد سحر کا طرزِ عمل ہی بدل گیا۔نماز کی پابندی تو شروع سے ہی تھی۔اب تسبیح کا سہارا لے کر دعاؤں کو ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کی کوشش میں کوشاں ہوگئی۔اس کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی ایک کشمکش اور تھی کہ ملک کے لیے کچھ نہ کچھ اس کی پسند کا پکوان پکاتی۔جیسے برسوں ملک نے اس کا پکایا نہیں کھایا،اس کی کسر نکال لینا چاہتی ہوں۔ملک کے باہر جانے کا وقت ہوتے ہی وہ کھڑکی کے پردے کی آڑ میں سے اسے دیکھتی اس اُمید کے ساتھ کہ کوئی بھولا بھٹکا ہوا کا جھونکا اس کے بدن کی خوشبو کی سوغات اسے دے جائے۔رات تخیل کے چاند کی کرنیں جب اس کے بستر پر اُترتیں تو یادوں کا جوار چڑھتا اور ان یادوں کی موجوں میں وہ ڈولنے لگتی۔کچھ اس طرح پرنالے سے بوند بوند ٹپکتے پانی کی طرح وہ بچے کھچے سانسوں کے ساتھ جی رہی تھی۔چل رہے سانسوں کو ایک روز رکنا ہی تھا۔سحر کے سانسوں کا پڑاؤ بھی آ گیا۔فجر کی نماز پڑھ کر جانماز سمیٹنے جھکی کہ پھوڑے کے پھوٹنے کا احساس اسے ہوا۔وقت قریب آیا جان کر اللہ کو یاد کیا۔اطمینان سے بستر پر جاتے ہوئے خالہ کو ہدایت دی اسے سونے دیا جائے اس نے تسبیح لی اور دانوں کا سفر شروع کیا۔

دوپہر چڑھتے چڑھتے سحر کا سانس تھم گیا۔پلنگ کے کنارے لٹک رہے بے جان ہاتھ تسبیح ایسے جھول رہی تھی جیسے سحر کی روح کو رُخصت کی ہری جھنڈی دکھا رہی ہو۔خالہ نے فوراً اوپر کی منزل پر جا کر خبر دی۔ملک عجلت سے نیچے آیا۔دیکھا سحر سانسوں کا کفن اوڑھے کوچ کر چکی تھی۔اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔جانے کس کی منتظر تھیں!!ان آنکھوں کو بند کرنے ملک آگے بڑھا مگر فوراً رک گیا۔وہ اس نادیدہ فصیل کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔جو نصف صدی سے ان کے درمیان حائل تھی۔

ماتم کے تین دن گزر گئے۔ان تینوں دنوں سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔سحر کے آگے پیچھے کوئی ماتم کرنے والا نہیں تھا۔دو لوگ تھے جنہوں نے غم میں تین دن گزارے۔خالہ کو فکر تھی کہ آگے کیا؟سحر جیسی مالکن۔۔۔ملک نے کہکشاں چھوڑنے کا طے کر لیا۔وہ مکان کی تلاش میں نکل رہا تھا تبھی سحر کے وکیل نے آ کر اسے ایک بند لفافہ دیا۔کہا۔۔۔میڈم یہ آپ کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔

ملک نے لفافہ چاک کیا۔وہ حیرت میں رہ گیا۔سحر نے اپنے وصیت نامہ میں اپنی پوری جائیداد ڈاکٹر اشفاق ملک کے نام کی تھی۔وہ کچھ کہہ نہیں پایا۔اس کی زبان سِل گئی تھی۔تبھی ڈاکیا زینہ چڑھتے ہوئے اوپر آیا۔اس کے ہاتھ میں سحر کے نام ایک رجسٹر تھا جو پردیس سے آیا تھا۔ملک نے رجسٹر لیا۔کھولا ایک کتاب تھی۔

Plilosophy and Religion

By Dr. Ashfaq Malik

یک لخت اسے خیال آیا سحر کی آنکھیں کس کی منتظر تھیں!!

جہاں تک کام چلتا ہو *غذا * سے
وہاں تک چاہیے بچنا *دوا * سے
اگر *خوں * کم بنے، *بلغم * زیادہ
تو کھا *گاجر، چنے ، شلغم * زیادہ
*جگر کے بل * پہ ہے انسان جیتا
اگر ضعف جگر ہے کھا *پپیتا *
*جگر * میں ہو اگر *گرمی * کا احساس
*مربّہ آملہ * کھا یا *انناس *
اگر ہوتی ہے *معدہ * میں گرانی
تو پی لی *سونف یا ادرک * کا پانی
تھکن سے ہوں اگر *عضلات ڈھیلے *
تو فوراً *دودھ گرما گرم * پی لے
جو دکھتا ہو *گلا نزلے * کے مارے
تو کر *نمکین * پانی کے *غرارے *
اگر ہو درد سے *دانتوں * کے بے کل
تو انگلی سے *مسوڑوں * پر *نمک * مَل
جو *طاقت * میں * کمی * ہوتی ہو محسوس
تو *مصری کی ڈلی ملتان * کی چوس
شفا چاہیے اگر * کھانسی * سے جلدی
تو پی لے *دودھ میں تھوڑی سی ہلدی *
اگر *کانوں * میں تکلیف ہووے
تو *سرسوں * کا تیل پھائے سے نچوڑے
اگر *آنکھوں* میں پڑ جاتے ہوں *جالے*
تو *دکھنی مرچ گھی * کے ساتھ کھا لے
*تپ دق * سے اگر چاہیے رہائی
بدل پانی کے *گنّا چوس * بھائی
*دمہ * میں یہ غذا بے شک ہے اچھی
*کھٹائی * چھوڑ کھا دریا کی *مچھلی *
اگر تجھ کو لگے *جاڑے * میں سردی
تو استعمال کر *انڈے کی زردی *
جو *بدہضمی * میں تو چاہے افاقہ
تو *دو اِک وقت * کا کر لے تو *فاقہ *

مصری ::: کی ::: ڈلی

(یہ نظم پچاس سال قبل رانڈھیر (بھارت) کے ایک حکیم صاحب نے کہی)

ریٹائرمنٹ پلان

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

میں احمد کی فارمیسی میں دوسال سے کام کر رہی تھی۔ احمد عرب تھا لیکن اس کا لب ولہجہ مقامی لوگوں جیسا تھا۔ نہ صرف لب ولہجہ بلکہ رہن سہن، لباس، اٹھنا بیٹھنا تقریباً سب کچھ۔ کھانے پینے اور کھلانے پلانے کا شوقین۔ پولائٹ، خوش اخلاق، نرم مزاج، دوسروں کی عزت کرنے والا لیکن کام کے دوران ''یو ہیو ٹو'' (You have to) والا رویہ اور نو کمپرومائز (No Compromise)۔

گاہگوں کو کسٹمرس (Customers) کے بجائے مریض یا مریضوں کے کیئر ٹیکر خیال کرتا تھا ان سے ہمیشہ بہت محبت سے پیش آتا اور اپنے اسٹاف کے تمام لوگوں کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ دوائیاں دیتے وقت اپنے ہر کسٹمر کو بہت اچھی طرح سمجھاتا تھا، دوائی کس طرح لینا ہے، کیا احتیاط کرنا ہے، اس کے کیا Side Effects ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اکثر بوڑھے لوگ اسے بہت تنگ کرتے، ایک ہی بات کو بار بار پوچھتے مگر کیا مجال جو اس کی تیوری پر بل آجائے۔ وہ مسکراتا رہتا، کبھی کہتا ''بے چارے! بڑی تکلیف میں ہوتے ہیں بڑھاپا۔۔۔ اس کے ساتھ بیماری، پھر حالات۔۔۔

احمد سے سب ہی لوگ بہت محبت کرتے تھے اس کے مریض، فارمیسی کے لوگ اور زیرِ تربیت لڑکے اور لڑکیاں البتہ بیوی سے کبھی کبھی اس کی بڑی لڑائی ہوتی تھی، بعض اوقات تو فارمیسی آکر بھی وہ اسے خوب سناتی تھی، یہاں تک کہ اسے چھوڑ کر چلے جانے کی بھی دھمکی دیتی تھی۔ اس کی بیوی زینب بھی فارمیسسٹ تھی لیکن جوب نہیں کرتی تھی احمد بھی اسے جوب کرنے کے لئے نہیں کہتا تھا۔

اتوار کا دن تھا فارمیسی مجھے ہی کھولنا تھی ایک بجے تک میری ڈیوٹی تھی، ایک سے دو بجے تک لنچ ٹائم اور دو بجے شینل کو آنا تھا دو بجے سے چھ بجے تک شینل کی ڈیوٹی تھی اور فارمیسی بھی اسے ہی بند کرنا تھی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی فارمیسی میں بہت رش تھا، میں بہت مصروف تھی اچانک مجھے احمد کی آواز سنائی دی ''میں کچھ ہیلپ کروں'' میں نے مڑ کر دیکھا تو احمد کھڑا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ میری جانب پھینکی۔

''نہیں میں سنبھال لونگی، مگر تم کیسے۔۔۔؟ کیا کوئی ایمرجنسی ہے۔؟'' میں نے مریض کی دوا بناتے ہوئے اس سے پوچھا۔

وہ میرے قریب آیا اور میرے دائیں کندھے کو ہلکا سا چھوا اور اپنے آفس میں چلا گیا۔

''شاید اسے کوئی 'پیپر ورک' کرنا ہو میں نے سوچا لیکن اس نے جو میرے کندھے کو ہاتھ لگایا اس کا نوٹس لئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے چھوا تھا۔ احمد ہمیشہ لیڈیز سے ایک فاصلہ رکھتا تھا۔

لنچ ٹائم پر ہم دونوں نے ساتھ لنچ کیا ''احمد آج تم کیسے آگئے تم تو کبھی بھی سنڈے کو آنا پسند نہیں کرتے ہو۔'' پھر خود ہی میں نے جھجکتے ہوئے کہا ''سوری! میں کچھ پرسنل ہو رہی ہوں۔''

''شینل نہیں آسکے گی۔ اسے کچھ ضروری کام ہے۔ میں نے سوچا کسی کو اچانک سنڈے کے دن ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے کوئی متبادل انتظام کرنے کے بجائے خود ہی آگیا۔''

لنچ کے دوران فارمیسی کے بارے میں اور فارمیسی کے چند خاص خاص لیکن مستقل خریداروں پر باتیں کر کے ہم لوگ ہنستے بولتے رہے۔ پتہ نہیں کیسے ہماری گفتگو کا رخ بوڑھوں اور بڑھاپے کی جانب مڑ گیا۔ '' Aging Process is terrible '' اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ '' میں نے زندگی میں بڑے قابلِ رحم بوڑھے دیکھے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔۔۔ اور ایسے بوڑھے بھی دیکھے ہیں جو نوّے (۹۰) پلس ہونے کے باوجود چاق چوبند رہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر بوڑھے بہت تکلیف اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ کیتھرین کو دیکھو خود اپنا اسکوٹر چلاتی ہوئی آتی ہے۔ گھر میں بھی اکیلی ہوتی ہے۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں اسکا، ہمت سے زندگی کو چلا رہی ہے۔ رابرٹ جو آرتھرائٹس کا مریض ہے اس سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ کتنی مشکل سے لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اور بے چاری ماریانہ اس کے ہاتھ چلتے ہیں اور نہ اس کے پاؤں کام کرتے ہیں نجانے کس طرح گاڑی ڈرائیو کرتی ہے۔ اور ایسے ہی بے شمار لوگ ہیں۔''

میں نے احمد کو دیکھا، ''کیا احمد بوڑھا ہو رہا ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''اس کا چہرہ ایک پکی عمر کے مرد کا چہرہ ہے اور دلکش بھی ہے، ہاں البتہ اس کی بیوی بوڑھی لگتی ہے۔ احمد تو خاصا ہینڈسم ہے۔ آج پہلی بار میں نے احمد کو اس نظر سے دیکھا تھا۔ اگر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی جائے تو میں اسے سنبھال لونگی۔۔۔ اگر میں اس سے عمر میں بہت چھوٹی ہوں تو کیا ہوا، مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔

یہ میں کیا سوچے جا رہی ہوں۔۔۔ وہ کیا بول رہا ہے۔ مجھے اس کی باتوں پر توجہ دینا چاہئے۔ جب میں نے اپنی سماعت کو اس کی آواز پر لگایا تو میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ ''جو لوگ اپنے ریٹائرمنٹ پلان کر لیتے ہیں وہ ایجنگ پروسس (Aging Process) سے کم متاثر ہوتے ہیں۔''

''یہ ریٹائرمنٹ پلان کی بات کہاں سے نکل آئی؟'' میں نے اسکو دیکھ کر سوچا۔

''کیا مجھے اس عمر میں ریٹائرمنٹ پلان کر لینا چاہئے۔؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہاری بات کون کر رہا ہے۔'' اس نے حیرانی سے میری طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

لنچ ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''اگر تم چاہو تو میں تمہاری ہیلپ کر سکتی ہوں۔'' اس نے تکلف نہیں کیا اور بولا ''جیسی تمہاری مرضی۔'' ہم دونوں کام پر لگ گئے۔ آرام سے فارمیسی بھگتائی اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے۔ اس سے اگلے دن میں آف ڈیوٹی تھی اور ناشتے کے بعد چھٹی پلان کر رہی تھی کہ میرے فون کی گھنٹی بجی دوسری جانب سے فارمیسی کی ایک کلیگ رتنا سنگھ کی گریہ آمیز آواز آئی۔۔۔ تمہیں خبر مل گئی ہے نا۔۔۔؟

''کیسی خبر؟ رتنا ڈیر۔۔۔'' رتنا سنگھ کو ہم سب رتنا ڈیئر کہتے ہیں۔

''ویری سیڈ نیوز۔۔۔ بوس احمد اس دنیا میں نہیں رہے۔ سڈن ہارٹ اٹیک آفٹر مڈنائٹ''

میرے ہاتھ سے فون گر پڑا، آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ ''کل سات بجے تک تو وہ میرے ساتھ تھا'' میرے ہونٹوں نے لرزش کی۔'' میں قریبی کرسی پر بمشکل بیٹھنے میں کامیاب ہوگئی دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

احمد بن مناف کی موت کے قریباً دو ہفتے بعد اس کی بیوی نے فارمیسی کا چارج سنبھال لیا۔ فارمیسی سنبھالنے کے بعد جو اس نے پہلا آرڈر سائن کیا وہ میرا 'لے آف' تھا۔ میں اس کے آفس کیبن میں گئی اور ایگریسو انداز میں سوال کیا۔

''مسز احمد! مجھے افسوس ہے کہ میں آپکو ڈسٹرب کر رہی ہوں لیکن میں سمجھ نہیں سکی کہ یہ کیا ہے۔؟

مسز احمد نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اوپر اٹھائیں ان آنکھوں میں سے آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ میں نوٹس پیریڈ کی تنخواہ کا ڈرافٹ ایک جھٹکے سے تھما دیا۔ ابھی میں اس کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مسز احمد نے ایک ڈائری تھما دی اور ساتھ میں ایک لفافہ بھی۔

''یہ سب آپ مجھ کو کیوں دے رہی ہیں۔ ان سے میرا کیا تعلق۔؟''

میں نے ان سے قدرے چیخ پر قابو پانے والی آواز میں استفسار کیا۔''

''تیرا کیا تعلق۔۔۔؟'' مسز احمد نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور بولی ''گھر جا اور خود ہی معلوم کر لے اپنا تعلق۔ ڈرٹی بچ!''

میرا غصہ سے برا حال تھا، مسز احمد کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں تیزی سے باہر نکل آئی میرے قدم انڈر گراؤنڈ کی طرف بڑھے مگر میں نے اپنا رخ بدل لیا اور پیدل چل کر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں گھس گئی۔ میں جانتی تھی کہ اس وقت میں گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مسز احمد کے ناقابلِ فہم رویّہ نے جیسے میرے بدن سے ساری توانائی باہر کھینچ لی تھی۔ ریسٹوراں میں بیرے کو خالی واپس کر دیا کہ آرڈر کچھ دیر بعد لے فی الوقت مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دے۔ اس کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے لفافہ جو کھول دیا گیا تھا ہاتھ میں لیا اور لفافے کے سارے ملفوفات باہر نکالے تو کیا دیکھتی ہوں کہ یوروپ اور دنیا بھر کے چھٹیاں گزارنے کے ریسورٹس (Resorts) وغیرہ کی تفاصیل تھیں جہاں احمد نے ریٹائر منٹ کے بعد جانے کا سوچا تھا۔ اس نے اپنا ریٹائرمنٹ جس کے ساتھ پلان کیا تھا وہ سارہ افضل یعنی میں تھی۔ اس ریٹائرمنٹ کا تفصیلی جائزہ لینے کی ہمت نہ پا کر میں نے ڈائری کھولی۔ اس کے اندر کبھی کسی ذکر، کبھی کسی خواہش کے ساتھ سارہ یعنی میرا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافے کو بیگ میں رکھا اور ڈائری کو بند کر کے اس پر اپنی ہتھیلی چسپاں کر کے بیٹھ گئی۔ شاید اس طرح بہت وقت گزر گیا تھا۔ کیونکہ بیرے کی آواز نے مجھے جیسے خواب سے جگا دیا ''آر یو او کے میڈم۔۔؟''

میں نے چونک کر بیرے کو دیکھا اور اس کو کافی اور سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ اس ریسٹوران کے سینڈوچ بہت پسند کئے جاتے تھے۔

احمد کو بھی ان کا شوق تھا۔

احمد۔۔۔ احمد بن مناف جو ریٹائرمنٹ پلان کر رہا تھا۔ جس کو اچانک ہارٹ اٹیک آ گیا تھا۔ جو مر چکا تھا۔۔ جس نے کبھی سارہ افضل یعنی مجھ کو بھی، یہ نہیں بتایا کہ وہ ڈائری میں اس کے ساتھ اپنی زندگی کو شیئر (Share) کرتا ہے۔ اور ہاں ریٹائرمنٹ پلان میں بھی اس کو اپنے ساتھ لئے گھوم رہا تھا۔ وہی سارہ جس کو کچھ وقت قبل اس کی بیوی۔۔۔ اس کی بیوہ نے 'ڈرٹی بچ' کہہ کر اپنے آفس سے نکال دیا تھا۔

احمد۔۔۔ احمد۔۔ احمد بن مناف کیا تم مجھ کو اندر ہی اندر چاہتے رہے تھے؟ کیا آج کی دنیا اور مغربی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے۔

یہ اندر ہی اندر محبت کرنا۔۔۔ لیکن ایسا ہو چکا ہے۔ یہ ریٹائرمنٹ پلان اور ڈائری 'اس ہونے' کے گواہ ہیں۔۔۔ اور ہاں میں یعنی سارہ افضل بھی۔۔۔

''ضعفِ عمر''

امریکہ اور جاپان کے ماہرین نے Serpine 1 نامی جین کا پتہ لگا لیا ہے۔ یہ جین امریکی ریاست انڈیانا کے علاقے ''امیش'' کمیونٹی میں پایا جاتا ہے۔ امیش لوگوں کی اوسط عمر پچاسی سال ریکارڈ کی گئی ہے جبکہ یہ جین نہ رکھنے والے افراد کی اوسط عمر پچھتر سال ہوتی ہے۔ ''امیش کمیونٹی'' کے لوگ روایت پسند کرسچن کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ان کی سادہ زندگی، سادہ لباس، سادہ رہن سہن اور سادہ خوراک صحت مند کی نشانی ہے۔ سائنسدان اس بات پر خوش ہیں کہ Serpine 1 نامی جین پر تحقیق سے ایسی دوائیں متعارف ہو جائیں گی جو اُن بیماریوں کا علاج کر سکیں گی جن کا تعلق ضعفِ عمر سے ہوتا ہے۔

دروازے اور کھڑکیاں

یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

''نہیں، نہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔'' مون اُن کی منہ بولی بیٹی سے مخاطب تھا۔ اور مزید کہا۔

''وہ ہرگز اکیلے پن کا شکار نہیں، اور نہ ہی کسی قسم کا اکلاپہ ہے اور نہ تنہائی اوڑھ رکھی ہے۔ وہ تو نہایت مرنجاں مرنج قسم کے شخص ہیں۔ اپنے حال میں مست الست۔ میں یوگی کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ تو بے حد تنہائی پسند ہیں۔ اُنہیں تنہائی سے عشق ہے۔ اور تنہا بیٹھے کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کوئی نظم لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے اُنہیں بہت قریب سے جانا ہے۔ جب جب مجھے فرصت نصیب ہوتی ہے میں اُن سے ملنے کے لیے اُن کے پاس آ جاتا ہوں۔ یوگی کا محض ایک خواب ہے محبت، عشق، والہانہ عشق کسی بھی شخص سے، کسی بھی شے سے، کوئی بھی ذی جاں ہو۔ انہوں نے چاہا ماسوا محبت کے کچھ بھی نظر نہ آئے۔ پیار ہی پیار کا وجود، دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ جب بھی وہ کسی پرند چرند کو دیکھتے ہیں اِن کی آنکھوں میں دیکھتے رہتے ہیں بے پناہ پیار اور شفقت سے۔ میں نے ان کے دل میں جھانکا ہے اُن کے معاشقوں کا مجھے علم ہے۔ بے طلب، بے ارادہ، بے مطلب کہ یہ زندگی پیار کے لیے ہی بنی ہے۔ پیار کا نام لب پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ زندگی ماسوا پیار کچھ بھی نہیں۔ یوگی نے جس کو بھی چاہا ٹوٹ کر چاہا۔ کوئی ان کو دھوکا، دغا نہیں دے سکتا کیونکہ ان کی طلب کچھ ہے ہی نہیں کوئی اُن کی زندگی میں آیا اور چھوڑ کر چلدیا۔ جبھی ان کی چاہ میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ اُنہوں نے کسی حصول کے لیے تو چاہا ہی نہیں ہے۔ واہ کیا خوب شخص ہے شائد وہ اس زمانے کا بندہ ہی نہیں ہے۔ کسی اور وقت کی مخلوق ہے اگر کوئی شخص اسے کچھ طویل وقفے کے بعد ملا تو اُسے اتنا کہنے پر اکتفا کیا ''آج کل نظر نہیں آتے، عید کا چاندہ ہو گئے ہو یا پھر Not to be seen now a days'' ان کی نظموں میں بھی کچھ انہی خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ شاید اس لیے آپ کو احساس گزرا ہے کہ وہ اکیلے پن، تنہائی کا شکار ہیں۔ البتہ یہ بات تو جاننی پڑتی ہے کہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں بے پناہ درد ہے جس کو وہ وقتاً فوقتاً صفحۂ قرطاس پر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

آپس کی رنجشیں، فاصلے، دلوں میں فاصلے اور وہ بھی بے وجہ فاصلے اور یہ فاصلے ہی یوگی کی زندگی کا المیہ ہیں۔ اُن کے درد کی وجہ۔ بغیر کسی بات کے دوریاں اختیار کر لینا یہ ہی زندگی میں ایک قسم کی ٹوٹ پھوٹ کرنے لگتی ہے اور دوریاں در آتی ہیں۔ دُوری ہو جانا الگ بات ہے مگر دوری کا احساس دلانا یہ آپسی محبت کے لیے بے حد مضر ہے یعنی کوئی شخص اپنے اردگرد ایک نہ دکھنے والا حصار سا بنالیتا ہے جو اس کو کسی حد تک قربت ہونے سے روکتا ہے۔ یہ حصار گو نظر نہیں آتا مگر اس کو احساس کی سطح پر محسوس کیا جا سکتا ہے اور پھر جب کوئی اپنا ہو اور وہ اس طرح کی حرکت کرے تو سینے میں ایک عجیب قسم کی درد کی لہریں اُٹھتی ہے جو مسلسل دل کو کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ رشتوں میں دوریاں پیدا کر دیتی ہیں اور جب اپنے خون کے رشتوں کی بات ہو تو جگر لہولہو ہوتا ہے، روح چیخ اٹھتی ہے۔ کوئی کہے تو کس سے کہے اور کیا کہے؟؟؟ اگر پیار نہیں ہے تو سنسار کی حقیقت کیا ہے؟ اور اکثر اپنے دوست کا یہ شعر کوٹ کرتے ہیں:

''ہم دل کو بیچتے ہیں کوئی اسے مول لے
اس کا بس ایک مول ہے، کوئی ہنس کے بول لے''

آپ تو جانتی ہیں کہ آپ کے انکل آپ کو کس قدر پیار کرتے ہیں۔ اپنی سگی بیٹی کی طرح اور آپ بھی اُن کو اپنا حقیقی انکل مانتی ہو۔ اُن سے آپ کا گاہے گاہے ہزاروں میل کی دُوری پر جب ہوتی ہو تو اُن کے لیے یہ دوری یہ فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ یہ دلوں میں تو فاصلہ نہیں۔ اُن کو آپ سے کبھی شکوہ نہیں ہوتا کہ آپ اُن کی نگاہوں سے دوری پر ہو۔ مگر آج کل وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں اُن سے ملا تو کہنے لگے کہ اُن کا بیٹا تو امریکہ میں مقیم ہے اور دونوں بیٹیاں کینیڈا میں جا بسی ہیں۔ دہلی میں تو اُن کا اِکا دُکا دوست ہے وہ بھی کوئی جگری یار نہیں۔ پھر بھی وہ یہاں خوش ہیں، اپنی زندگی جی رہے ہیں۔ بچوں سے فون پر یا کبھی کمپیوٹر پہ بات ہو جاتی ہے۔ ایک دن وہ مجھے عجیب قصّہ سنا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ جس فلیٹ میں وہ رہتے ہیں اس کے اوپری فلیٹ میں ایک فیملی رہتی ہے۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ ایک بیٹا بی اے پاس کر کے کوئی کورس کر رہا ہے اور دوسرا ہائر سیکنڈری کا امتحان دینے والا ہے۔ اس عورت کی عمر لگ بھگ اُن کی بیٹی جتنی ہو گی۔ کہہ رہے تھے کہ وہ کسی ذہنی بیماری کا شکار ہے اور پریشان سی رہتی ہے۔ ایک دن میں نے گرم گون ہوا لگانے کے لیے دھوپ میں رکھا تو پوچھنے لگی یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ گون ہے۔ کہنے لگی میں دیکھوں؟ میں نے کہا دیکھ لو۔ اُس نے گون اُٹھایا اور پہن لیا اور قدِ آدم آئینے کے سامنے خود کا جائزہ لینے لگی اور پوچھنے لگی۔ کیسا لگتا ہے۔ میں نے کہا اچھا لگتا ہے پھر اُس نے کہا میں لے جاؤں۔ میں نے کہا، ہاں لے جاؤ۔ اور وہ لے گئی۔ اُس کے خاوند نے اس کو ڈانٹا اور کہا تم انکل کا گاؤن کیوں اٹھا لائی ہو۔ کہنے لگی انکل جی نے دیا ہے۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ وہ لوٹا کر آئے۔ مگر وہ نہیں آئی۔ اس کا شوہر میرے پاس آیا اور معذرت طلب کرتے ہوئے کچھ کہنے کو ہی تھا کہ میں نے کہا ''میرے عزیز میں جانتا ہوں کہ وہ ذہنی طور سے نارمل نہیں ہے۔ آپ کیوں دل کو لگاتے ہیں۔ آخر گاؤن ہی تو ہے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کے کسی اور عورت سے ناجائز تعلقات ہیں اور اس کی بیوی نے خاوند کو رنگے ہاتھوں پکڑا

ہے۔اور بعد میں اس کو مزید پتہ چلا کہ وہ اس عورت کے گھر کا خرچ بھی اٹھاتا ہے اور اپنے گھر میں اس لیے تنگی رہتی ہے جس کا اُس کی بیوی کو صدمہ پہنچا اور وہ ڈپریشن کا شکار ہوگئی۔ دواؤں کے استعمال سے کچھ فرق پڑا مگر مکمل طور سے نارمل نہ ہوسکی۔ جب سے مجھے یہ سب علم ہوا مجھے بڑا دُکھ ہوا اور اس کے شوہر پہ بے حد غصہ آیا۔اس کے بعد وہ میرے پاس اکثر آتی رہتی ہے اور جب بھی وہ کسی چیز کے لیے کہتی ہے کہ ''لے جاؤں'' تو میں کہتا ہوں کہ ''وہ لے جائے'' حالانکہ وہ چیز اس کے کسی کام کی بھی نہیں ہوتی اور پھر بعد ازاں میری نوکرانی اس کے گھر سے وہ سب کچھ اُٹھالاتی ہے۔ میری نوکرانی مجھے اکثر کہتی ہے کہ میں اس کو کیوں لے جانے دیتے ہوں۔ میں کہتا ہوں اس کو خوشی ملتی ہے اور مجھے بھی بُرا نہیں لگتا۔اس کو میرے پاس بیٹھنا اور بچوں کی سی حرکتیں کرنا، میں ٹوکتا نہیں ہوں وہ مسکراتی رہتی ہے کہ مجھے اس میں اپنی بیٹی ہی نظر آتی ہے۔اور ایسا کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے نوکرانی کو بھی تنبیہہ کر رکھی ہے کہ وہ اپنی چیزیں لوٹا لائے مگر اُسے کچھ بھی نہ کہے تاکہ اُس کو بُرا لگے۔آخر وہ ہے تو بیمار ہی نا۔ مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے جب کوئی کسی کو اس طرح دکھ دیتا ہے، ایسی حرکت کیوں انسان کرتا ہے جس سے دوسرے کو ذہنی دکھ پہنچے۔

شاید یوگی نے اس کا دکھ بھی اوڑھ لیا ہے اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ اس کو کسی شے کے لیے انکار کر کے وہ دُکھی نہ کرے۔اب سننے میں آیا ہے کہ اس کے شوہر نے باقاعدگی سے دوسری عورت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے اور گھر پر کبھی کبھار ہی آتا ہے جس کے باعث بیوی اور بچے پریشان حال رہتے ہیں۔ اُنہیں یہ سب سن کر بے حد دُکھ ہوا مگر کیا کر سکتے ہیں۔

میں یوگی کے پاس ہر دوسرے تیسرے دن جاتا رہتا ہوں تاکہ اُن کو یہ احساس کبھی نہ گزرے کہ کوئی اُن کو پوچھتا نہیں ہے اور بالخصوص اتوار کو تو میں زیادہ دیر تک قریب رات تک اُن کے پاس رہتا ہوں۔

ایک دن اسی دوران اُنہوں نے کہا کہ اُن کی بڑی بیٹی جس کا نام لپیکا رکھا تھا جو اُس نے ہائر سیکنڈری کے امتحان میں فارم بھرتے ہوئے نوتن رکھ لیا اور اس طرح اس کے بعد گرین کارڈ میں نوتن ہے مگر ہم سب اور قریبی لوگ آج تک اس کو لپو کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ یہ بچپن میں بڑی فرمانبردار، سمجھدار سگھڑ رہی ہے اور ہر کام کو بڑی خوش اسلوبی سے کرتی رہی ہے۔ نوکری تو اس نے بی اے پاس کرنے کے بعد ہی شروع کر دی تھی مگر ایم اے انگلش بعد ازاں سروس کے دوران ہی کیا۔ جس جگہ بھی کام کیا وہاں ہمیشہ اس کے کام کو سراہا گیا۔اور اس کا پہناوا اس قدر اچھا ہوتا ہے کہ ہر کوئی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بلخصوص اس نے ہوٹل انڈسٹری میں ہی ایڈمنسٹریشن میں کام کیا ہے اور اپنے کام میں محنتی اور ایماندار رہی ہے۔ پھر اس کی شادی ہوگئی اور دوبئی چلی گئی مگر شادی کوئی زیادہ دیر نہیں چل سکی جس سے اس کی بیٹی ہے۔کون غلط ہے اور کون صحیح ہے یہ بحث تو فضول ہوتی ہے ہر کوئی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔اس لیے کسی کو یک طرفہ ذمہ دار ٹھہرایا نہیں جاسکتا ہے (اس لیے بھی یوگی کو اُس عورت کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوسکتی ہے) کیونکہ اس کی عمر بھی کچھ ایسی ہی ہے جب اس کی بیٹی ابھی چار ماہ کی تھی تو ایک دن اُس کا شوہر صبح سویرے پَو پھٹتے ہی گھر سے نکل گیا اور پھر کبھی لوٹا نہیں۔ گو کوششیں کی گئیں مگر سب لاحاصل۔ کوئی سود مند نہ ہوئی۔اس کی طلاق ہو گئی جس کے بعد میری بیٹی نے فیصلہ لے لیا تھا کہ وہ انڈیا نہیں رہے گی یہاں اس کو لوگ جینے نہیں دیں گے اور ہر کوئی اس میں ہی نقص نکالیں گے اور طعنوں، نشتروں سے زخمی کرتے رہیں گے۔ گھر میں مخالفت ہوگی مگر پھر یہ سوچ کر کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ کس طرح زندگی جینا چاہتا ہے۔اس لیے کوئی زیادہ مخالفت نہیں کی گئی۔ کوئی دوسرا کسی کے لیے کیا فیصلہ دے سکتا ہے۔ جس قدر سمجھانا فرض شناسی کا حق تھا وہ کہا۔آخر فیصلہ تو اس کا اپنا ہی تھا ہر کوئی اس میں آزاد ہے۔مزید یہ بڑی سمجھدار اور سگھڑ ہے اس لیے بھی اس کو اپنے حال پہ چھوڑنا ہی مناسب خیال کیا اور وہ ایک فائیو سٹار شیریٹن ہوٹل سانا یمن روانہ ہوگئی۔ اپنی بیٹی کو اپنے والدین کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر۔ میں بتانا بھول گیا کہ پہلے جب کبھی وہ کام سے لوٹتی تھی تو دن بھر جو جو ہوا اس کی ایک ایک تفصیل دیا کرتی تھی اور جس کے بعد اس کو مناسب مشورے دیے جاتے تھے۔ ہر چھوٹی بات کے لیے بھی وہ مشورہ کیا کرتی تھی مگر جب سے وہ ہندوستان کی سرحد پار کر کے یمن گئی ہے وہ مکمل خود مختاری کے طور سے اپنی زندگی جی رہی ہے۔ کبھی اپنی تکلیف و پریشانی کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔ اچھا بُرا اپنا وقت جس طرح بھی ہوا اس نے گزر بسر کیا۔ کوئی شکوہ کوئی کسی قسم کی شکایت اس کی زبان پر نہ رہی اور اس نے کوئی ملال کبھی ظاہر نہ کیا کہ وہ مطلقہ ہے۔ کسی کی شکایت تک اُس کی زبان پر نہ رہی۔اس کی بیٹی کم وبیش ہوسٹل میں رہی اور گاہے گاہے چھٹیوں کے درمیان اپنے نانا نانی کے ہاں آتی رہی اور بہت اچھی طرح اُس کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ کبھی کبھار وہ چھٹیوں میں اپنی ماں کے پاس بھی یمن چلی جاتی۔اس طرح وقت گزرتا رہا پھر سانا (یمن میں) انتہا پسندوں کے باعث افراتفری کا ماحول ہوگیا اور اس طرح وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بحری جہاز سے انڈیا لوٹ آئی۔ جب وہ بحری جہاز سے اتر رہی تھی تو ہم نے اُسے خبروں میں بحری جہاز سے اترتے دیکھا اور ہم بے حد خوش ہو رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اتنی دیر میں بیل ہوگئی اور وہ ہمارے دروازے کے باہر کھڑی ہے، ہم نے نیوز بند کی اور سب اُس سے مل کے خوش ہو رہے تھے۔ دس برس سے زائد دیش سے باہر رہنے کے بعد اُس کا یہاں جی نہیں لگ رہا تھا۔

پھر اِدھر اُدھر سے طرح طرح کے سوال اُچھلنے شروع ہو گئے جس کے باعث اس کو ناگواری ہوئی اور اس نے لوٹنا ہی بہتر جانا۔اس لیے اُس نے جلد از جلد بیٹی کو پیچلر آف فزیوتھارپی۔ بی پی ٹی میں ڈیرہ دون میں داخلہ لے دیا اور خود وہ تھوڑی سی دور، کچھ دیر کے بعد جاب مل گئی اور وہ دبئی روانہ ہوگئی جہاں اس کو رمادہ ہوٹل Ramada Hotel میں ہیومن ریسورسز منیجر Human Resources Manager کی حیثیت سے نوکری مل گئی اور وہ دبئی چلی

گئی۔ ویسے بھی اب اُس میں پہلے والی میل جول تو نہ رہی تھی۔ کسی سے مشورہ لینا یا کسی کے مشورے پر عمل درآمد کرنا اس کی ذات کا اب حصہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ زندگی اب اپنے ڈھنگ سے گزارنے کی عادی ہوگئی تھی۔ اور جس شخص سے کوئی مطلب نہ ہو اس سے تعلق خاطر رکھنا اس کو قطعی مناسب نہیں لگتا تھا۔ ہر کسی سے دُوری اس کا چلن بن چکا تھا اور پھر جب اُس کی بیٹی بھی عمر کے اُس دور میں آ چکی تھی جس کے لیے اُس کو زیادہ دیکھ ریکھ کی حاجت نہیں رہ گئی تھی۔ پہلی سی پرورش کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اس طرح وہ فیملی کی زندگی سے قریب قریب کٹ گئی تھی۔ گو بی پی ٹی کا کورس چار سال کا تھا اور اس اثنا وہ کبھی نانا نانی کے پاس یا زیادہ تر وہ اپنی ماں کے پاس جاتی رہی۔ نانا نانی تو اب قریب لوکل گارڈین کی حیثیت سے ہی تھے اور بس بی پی ٹی کا کورس ختم ہوتے ہی اُس نے اپنی بیٹی کو اپنے پاس ہی بلا لیا تھا۔ اس لیے فیملی کے ساتھ کچھ زیادہ سروکار رکھنے کی اس کی ضرورت قریب ختم ہوگئی تھی اور بغیر مطلب میں تعلق رکھنا اس کی ذات سے ہمیشہ کے لیے نکل چکا تھا۔ اپنی زندگی کے بارے میں اب کچھ بھی کسی سے مشورہ یا شیئر Share کرنا اُس کو فضول لگتا تھا۔ گو والدین اس کے لیے متفکر رہے مگر اب وہ بھی خاموش ہو چکے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ اس نے اپنے آپ کو بالکل الگ کر لیا ہے اس لیے وہ بھی اس کی زندگی کے بارے میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ البتہ سرسری طور سے بات چیت ہو جاتی اور اس طرح وہ اپنے اردگرد دیواریں کھڑی کرتی رہی۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی رہیں۔ بیٹی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہوا جب بھی اُس نے بغیر کسی کے مشورے کے ہر کام از خود سرانجام دیا۔

اُس کو کیا خبر والدین کے دل میں نہاں درد کو کون ماپ سکا جو مسلسل روح کی گہرائیوں سے رہ رہ کر اٹھتا رہتا تھا۔ گو وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتے مگر اُن کی آنکھوں سے سب کچھ پڑھا جا سکتا تھا مگر کوئی پڑھنا چاہے جب نا۔ اور اس کی ماں تو بیٹی کے غم میں گھُل گھُل کر جان کھو بیٹھی کہ اس کی بیٹی کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی تھی اور بیٹی کا غم ماں کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح ختم کرتا رہا۔ کون اس درد کو محسوس کرتا ماسوا اس کے والد کے جو ظاہراً ہنستے مسکراتے رہے محض اپنا غم چھپانے کے لیے اور یہ زہر خاموشی سے پیتے رہے مگر اب وہ اس طرح خاموش ہیں شاید وہ جان چکے ہیں کہ یہ سب لاحاصل ہے۔

ہاں تو کہہ رہا تھا کہ بیٹی کی شادی میں محض والد کی شمولیت رہی اور بس اللہ اُس کے بھائی نے بڑھ چڑھ کر اپنے تمام فرائض ادا کیے جس کے لیے اس نے اخراجات کی کوئی پرواہ نہ کی۔

بیٹی کی ازدواجی زندگی سال بھر ہی چل سکی۔ کون غلط اور کون صحیح تھا۔ آج کل یہ سوال اپنے معنی کھو چکا ہے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مناسب سوچتا ہے اور پھر اب تو کوئی کسی کا زور بھی کہاں چلتا ہے۔ ہر کوئی خود مختار ہے وقت کے ساتھ دیواریں اور بلند ہوتی رہیں۔ مزید دل کے دروازے اور احساس کی کھڑکیاں ہر کسی پر بند رکھے۔ اور ایک عجیب سی دُوری کا احساس نفس نفس کے ذہن و دل میں بھر دیا۔ وہ لوگ جو ہر لحاظ سے اس کے بہی خواہ (بچپن سے لے کر آج تک) رہے اُن سے بھی کوئی ذہنی تعلق نہیں رکھا۔ اور اس بات سے وہ سب نالاں ہیں کہ وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ اُن کی لپّو اس قدر بدل سکتی ہے۔

کوئی کہاں کھو گیا، کب اور کیوں یہ ایک سوال ہی بنا رہا۔ جس کا جواب کھوجتے جگر لہولہو کر بیٹھے۔ اب تو وہ اس تگ و دو میں ہیں کہ یہ دروازے اور کھڑکیاں دیواروں کو بھی ہمراہ لیے کہیں ایسی جگہ لے جائیں جو ہم میں سے کسی کی دسترس میں تو ہو مگر ہمیں قربت کی جرأت نہ ہو۔ کوئی نہ جان سکے کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے، سوچئے کہ جو شخص زمانے بھر میں محبت کی جوت ملانے کی تلقین کرتا رہا ہے جس کے سینے میں ماسوا محبت اور کچھ بھی نہ ہو ایسے انسان کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی جس کا شہر دل ایسی آگ لگنے سے بھسم ہوگیا ہو جو اُس کے کسی اپنے ہی نے لگائی ہو۔

دل کی پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اصولی طور پر کہانی اوپر ختم ہو جانی چاہیے مگر میں کیا کروں جذبات کی ایک رَو ہے جو مجھے پیچھے کی طرف بہائے چلی جا رہی ہے۔ میرے باپ، دادا، پردادا کی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایمانداری، دوست داری، قناعت اور رواداری جس طرح اُن لوگوں کے مزاج کا حصہ تھی وقت گزرنے کے ساتھ سوکھے پتوں کی مانند ایسے ہوا ہوگئی کہ اپنی بود باش دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ میں انہی پُرکھوں کی اولاد ہوں۔ اگر میں اور میرے پُرکھے پانی کے منہ زور دھارے کے آگے بند نہیں باندھ سکے تو مجھے یا ہماری نسل کو یہ حق قطعی نہیں پہنچتا کہ ہم اپنی اگلی نسل کو دوشی ٹھہرائیں۔ زبان ہو، کلچر ہو، تہذیب ہو یہ اپنا راستہ خود تلاشتا ہے اس کے آگے نہ گزری نسل بند باندھ سکی ہے اور نہ ہماری نسل اس میں کامیاب ہو سکی ہے۔ تو پھر چنتا کاہے کی؟ وقت کے دھارے پر بہے جاؤ، خود بھی سُکھی رہو اور دوسروں کو بھی سُکھ پہنچاؤ۔

اجتہاد

دینِ حق کے مستقل احکام کو چھیڑو نہیں
باقی باتوں میں تعصّب تو نہیں جائز مگر
زندہ و پائندہ رہنے کا ہے نسخہ اجتہاد!
ورنہ پھر اِلحاد سے ممکن نہیں ہرگز مَفر

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

منزل بے نشاں

ڈاکٹر عشرت ناہید
(لکھنؤ، بھارت)

آج شام سے ہی کالی گھٹائیں گھر آئی تھیں اور رات ہوتے ہوتے مزید گہری ہوتی گئیں تھیں پھر بجلی بھی چمکنے لگی تھی اور بادل شاید پہلے برسنے کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تھے ان کے اس زور آور ٹکراؤ سے جو آواز ہوتی وہ اتنی شدید گھڑ گھڑاہٹ پیدا کر رہی تھی کہ کمزور دل انسان کی تو حرکت قلب ہی رک جائے ایسی ڈراؤنی طوفانی رات، میں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے دونوں بچوں کے ساتھ بنگلے نما گھر میں تنہا تھی۔

اس کا شوہر اس کا محافظ اس کا کفیل اور سب سے بڑھ کر اس کا مجازی خدا۔۔۔

۔۔۔خدا
جو نور کی چادر کے پرے بیٹھا اپنی مخلوق کی حفاظت کرتا
اپنی مخلوق کو ہمت دیتا
اپنی مخلوق سے رحم کا معاملہ کرتا
اس کے مسائل سنتا
اس کی دعائیں قبول کرتا
التجائیں سنتا
کرم کرتا
اور یہ زمین کا مجازی خدا
سفاکیت کا علمبردار
محبت سے عاری
بے رحمی کی علامت
جس کے سامنے ہر التجا بے کار
ہر مسئلہ بے معنی

آج پھر اسے چھوڑ کر اپنے آبائی شہر چلا گیا تھا اپنی خوبصورت رنگین دنیا آباد کرنے ہاں رنگین ہی تو ہے اس کی دنیا جسے اس نے سب سے چھپا کر سجا رکھا ہے۔

کوئی اس کے دل سے پوچھے کہ آج یہ رات اس پر کیسا قہر ڈھا رہی تھی۔

یہ رات بھی کتنی عجیب ہوتی ہے نا وہ سوچ رہی تھی
کبھی کنوارے جذبے جگاتی تب اسکی خوبصورتی کچھ الگ ہی ہوتی
پھر مسکراہٹوں بھری اور دھیمی دھیمی سرگوشیوں سے بھری ہوتی تو کتنی حسین لگتی
یہی کبھی خوابوں کی دنیا میں لے جا کر پلکوں پر حسین سپنے سجاتی
اور پھر وقت کے ساتھ بدل کر بے دردری سے ان سپنوں کو توڑ کر بکھیر بھی دیتی
تب کسک اور خلش کے سوا کچھ نہ دیتی
کبھی گناہ پر آمادہ کرتی تو کبھی ضمیر کی ملامت بن جاتی۔

رات ایسی ہی ایک رات آج بھی تھی دہشت والی جس کا ساتھ ہوا دے رہی تھی اور اس کی وحشتوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

ہوا
ہوا جو کہ زندگی کی علامت
سانسوں کو مدھر جھنکار دیتی
کبھی پروا بن جاتی
کبھی بادصبا بن کر پیغام لاتی
کبھی چاندنی کی خوشبو بکھیرتی تو مدمست کر دیتی
اور جب روپ بدلتی تو کتنی سخت ہو جاتی
بالکل چنڈالنی کا روپ دھارن کرو ناش کرنے پر تل جاتی
لو کے تھپیڑے کی طرح گرم ہو جاتی
تو کبھی
طوفان کی شکل اختیار کر سب کو فنا کرنے پر آمادہ ہو جاتی

آج بھی تو ایسی ہی ایک گہری رات تھی، کالی سیاہ رات۔ ہوا کے ساتھ مل کر ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی عجیب روپ دھارن کر گئی تھی۔

ماضی اسے سترہ سال پرانے سفر پر لے گیا

یہی جولائی کا مہینہ، ساون کا مہینہ جب وہ بہت سارے خواب اور نئی خوشنما زندگی کے ارمان لیے ساجن سے ملن کے جذبات کو گدگداتے گیت کے بولوں میں مگن دعاؤں اور قرآن کے سائے میں وہ رخصت ہوئی تھی۔ تمام راستہ بارش ہوتی رہی کتنی سہانی لگ رہی تھی۔ پانی کے قطرے گاڑی کے شیشے سے ٹکراتے اور پھر آپس میں مل کر نیچے کی طرف جاتے ان کے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہونے کا عمل اس کی آنکھوں کو بھی کتنے سارے خوبصورت خوابوں سے ہم آغوش کر رہا تھا۔

کار گھر کے بڑے سے آہنی گیٹ میں داخل ہو کر رکی تو خوابوں کا سلسلہ بھی تھما اسکی نند نے بڑے چاؤ اور محبت سے ہاتھ تھام کر اسے اتارا اندر کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ شاٹ سرکٹ کا دھماکہ ہوا اور بجلی گل ہو گئی۔

''دلہن کے آتے ہی لائٹ چلی گئی اندھیرا ہو گیا کچھ اچھا نہ ہوا''
ایک بوڑھی دھیمی سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی
''ہاں'' لمبی سی سانس لے کر کسی نے ہاں میں ہاں ملائی
''اندھیرا اچھا شگون تو نہیں؟''
''شگون کیا ہوتا اچھے اور برے اعمال تو ہمارے اپنے ہوتے فضول

باتیں ہیں ان پر کبھی دھیان نہیں دینا چاہیے۔''
ابو کی بات ذہن میں گونجی

اس اندھیرے کو اجلا شگون تو مجھے بنانا ہے ایک عزم اس کے اندر جاگا رات بارہ بجے تک لائٹ آ بھی گئی اسے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا کچھ ہی لمحوں میں مجازی خدا کے قدموں کی آہٹ پر وہ مزید سمٹ گئی تھی وہ قریب آئے باتیں کیں بہت اچھی اچھی باتیں خوشگوار زندگی کی باتیں وہ مسکراتی رہی کہ اس کے بنے خواب سب سچ ہوتے جو دکھائی دے رہے تھے۔لیکن ان پیاری پیاری مدھر باتوں کے درمیان وہ سچ بھی سامنے آ گیا تھا جس کی اسے بالکل ہی توقع نہیں تھی نہ ہی گمان تھا کہ وہ ان کی پسند نہیں تھی بلکہ والد کی پسند کیا بلکہ ان کی ضد پر اس گھر میں آئی ہے۔

اس کا عزم اب بھی سلامت تھا۔

لیکن اس کا یہ عزم اسے ایک سراب سے ہمکنار کرتا رہا وہ بڑھتی رہی وہ دور جاتا رہا۔ وہ سراب کو حقیقت میں بدلنے پر مصر تھی مگر وہ تو جنگل میں مرگ ترشنا سا ثابت ہو رہا تھا وہ ادھوری پیاس لیے ایک پھول اور ایک کلی کی ماں بن چکی تھی مگر تشنگی تھی کہ کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی کبھی دل کی کلی کھلی ہی نہیں وہ بھٹکتی رہی چاہت کی چاہے جانے کی آرزو میں، مکمل کسی کے ہو جانے اور کسی کو پا لینے کی خواہش میں اور پھر پا لینے کے بعد کی سرشاری کی کیفیت میں۔

وہ بہت خوش ہوئی تھی اس وقت جب بیٹا ہوا اور اس وقت بھی جب کہ بیٹی ہوئی کہ دنیا مکمل ہو گئی تھی اتنے پیارے خدائی تحفے پا کر۔اس کے اندر پھر آرزو جاگی تھی کہ اب شاید وہ میرا ہو لیکن ''وہ بچوں کا باپ تھا نہایت شفیق بے انتہا محبت کرنے والا'' مگر اب تک وہ اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا۔

رات گزرتی جا رہی تھی
ہوائیں اپنا رخ بدل رہی تھیں

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔۔ پردے ہلنے لگے اسی اثناء بجلی بھی چلی گئی اب کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔اندھیرا خوف، باہر ہلکی ہلکی بارش کی آواز جواب دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھی ہوائیں بھی تیز تھیں اس کی سنسناہٹ رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔جلد ہی لائٹ آ گئی کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی لیکن پھر بھی اس کی گھبراہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی دونوں بچوں کی طرف دیکھا دونوں معصوم محو خواب تھے بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی شاید کوئی پیارا سا خواب دیکھنے میں مگن تھا اس بات سے بے خبر کہ ماں پر کیسی وحشتوں کا عالم طاری ہے یکا یک وہ ہنس پڑا شاید پریاں اسے جھولا جھلا رہی تھیں دادی کہا کرتی تھیں کہ جب بچے نیند میں ہنستے ہیں تو پریاں اور فرشتے انہیں جھولا جھلاتے ہیں باغوں کی سیر کراتے ہیں۔

وہ ڈر سے سمٹنے لگی کہ بیٹی نے کروٹ لی اور بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔اس کی پیاری بیٹی اس کی جان اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں کا لمس اس کی روح تک کتنا کومل احساس جگاتا تھا بیٹی اس کی بائیں جانب تھی یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے بیٹی میری بائیں جانب کیوں ہے وہ پھر لرزنے لگی کسی انہونی کے خوف سے۔اسے تو دائیں جانب ہونا چاہیے تھا داہنی طرف جس سے نامہ اعمال ملنا تھا تو کیا اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں؟ عجیب سے وسوسوں نے اسے گھیر رکھا تھا اس کے دائیں جانب اس کا بیٹا عارش تھا۔بیٹا مرد۔

مرد کے کتنے روپ۔

جیسے جیسے زندگی اس کے قریب سے گزرتی رہی تجربے ہوشیار کرتے رہے اور ایک کے بعد ایک مرد نما سارے رشتے اپنا اصل اس کے سامنے ظاہر کرتے گئے باپ، بھائی، شوہر اور اب بیٹا۔

باپ مشفق باپ جس نے بچپن میں بانہوں کا جھولا دیا تھا اور بڑے ہونے پر بھی اسے کئی بار یہ احساس ہوا کہ امی سے زیادہ ابو پیار کرتے ہیں اور کرتے بھی تھے لیکن وہ اسے ڈولی میں بٹھاتے ہی کیسے لاتعلق ہو گئے تھے۔وہ حیران تھی۔جب اس نے انہیں اپنی داستان غم سنائی تو دل کو امید سی جاگی تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کرینگے جیسے کہ ہمیشہ جب بھی اس سے کوئی غلطی ہوتی اور امی ناراض ہونے لگتیں تب وہ اسے امی کی ڈانٹ سے بچا لیا کرتے تھے اور وہ ان کے پاس آ کر محفوظ ہو جایا کرتی تھی اور اب تو اس سے کوئی غلطی بھی سرزد نہ ہوئی تھی اس نے ابو کی طرف بڑی پر امید نظروں سے دیکھا تھا اور پوچھا تھا کہ ''ابو اب کیا کروں؟'' اسے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح ابو اسی کے حق میں فیصلہ دینگے مگر ان کا سفاک سا جواب اس کی سماعتوں سے گزر کر دل کو پارہ پارہ کر گیا تھا۔

''نہ میں نے تمہیں بلایا تھا نہ ہی جانے کے لئے کہونگا۔فیصلہ تمہیں خود کرنا ہوگا'

اور پھر وہ اپنے دل کی کرچی کرچی چبھتی ہوئی اشکوں سے انہیں جوڑتی ہوئی واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی بھائی بھی دروازے پر کھڑا مجبور اور لاچار سا ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا ماں تو اس سے زیادہ بے کس کوئی اور نہیں۔اس کی آس بھری نگاہیں اس سے ٹکرائیں اور ندامت لیے لوٹ آئیں اور وہ سینہ تانے خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے لے آیا تھا پھر اسی دنیا میں جہاں سراب ہی سراب تھا۔

کھڑکی کے پاس کھٹ سی آواز ہوئی خیالوں کا تسلسل پھر ٹوٹا دل ڈر اور خوف سے پھر لرزنے لگا اب کیا کروں وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا بچوں کو خود سے اور قریب سینے سے چپکا لیا۔

سرہانے موبائل رکھا تھا سوچا کسی کو فون کروں۔نہیں میری آواز اس تک چلی جائیگی لیکن کروں بھی تو کس کو اس شہر میں کوئی بھی تو شناسا نہیں کسے مدد کے لیے بلاؤں؟ ابھی دو ماہ ہی تو ہوئے تھے اس شہر میں آئے ہوئے اور چونکہ اسے پسند نہیں تھا کہ وہ پڑوسیوں سے بھی بات کرے سو وہ کبھی بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کر پائی تھی۔

''چہارسُو''

اسے یاد آیا۔۔۔۔۔

کتنی منتیں کی تھیں، کتنا گڑگڑائی تھی وہ کہ ہمیں یوں اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ ڈر لگتا ہے اور اس نے تفحیک اڑاتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ''کس بات کا ڈر۔ ڈر تم سے ڈر جائے گا۔''

وہ خاموش رہ گئی تھی۔

اور وہ چلا گیا تھا غریب رتھ پر سوار ہو کر

غریب رتھ ٹرین کا نام بھی کیسا تھا سفر سے جڑا ''رتھ'' کیسا خوبصورت لفظ

اس سے وابستہ کہانی پھر اس کے ذہن میں گھومنے لگی

مہابھارت جنگ کا منظر

پانچوں پانڈو کوروؤں سے جنگ کر رہے

بھیشم اپنی گدا اٹھائے ودھ پر ودھ کیے جا رہے

ارجن رتھ پر سوار اور سارتھی کرشن

ارجن کے دل میں انتقام کی آگ ہے پانچالی کے چیر ہرن کی

کرشن پانچالی کے بھی رکھوالے تھے اور آج ارجن کے بھی راہنما بن گئے تھے

رتھ دوڑ رہا تھا اور کرشن گیان دے رہے تھے

''دشمن کو کبھی کمزور مت سمجھو بلکہ اس کے کمزور پہلو کو تلاش کر اس پر وار کرو''

تب ہی دروازے کی کنڈی پر ضرب پڑنے کی آواز پھر آنے لگی کھٹاک کھٹاک

شاید دروازہ توڑنے کی کوشش تھی

بارش بھی تیز ہو گئی تھی پیڑوں کے پتوں پر پانی کی آواز عجب سی ہیبت پیدا کر رہی تھی

دونوں بچوں کو اس نے تقریباً جکڑ رکھا تھا نظریں کھڑکی کے پردے پر جمی ہوئی تھیں ایک ہاتھ اندر کی طرف آیا پردہ سرکا اس کی سانسیں رکنے لگیں بچوں پر گرفت اور سخت کر لی اور ڈری ہوئی کبوتری کی طرح آنکھیں بند کر لیں پھر دھیرے دھیرے ہلکے سے آنکھ کھولی ایک کالا سا دھندلا چہرہ کھڑکی سے اندر کا جائزہ لے رہا تھا ڈر سے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ آیۃ الکرسی کا ورد ہونٹ بھینچ کر کرنے لگی کہ کہیں ہونٹ ہلتے نہ دیکھ لے پھر ہمت کر کے دوبارہ آنکھ کھولی ہیولا غائب ہو چکا تھا ہلکے سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی اس نے موبائل کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا کیا کروں کسے فون کروں نمبر ملایا پھر سارتھی کا۔ جو کہ رتھ پر سوار دور بہت دور جا رہا تھا اپنی منزل کی طرف آج کا کرشن پانچالی کا محافظ نہیں تھا اور نہ ہی پانچالی کی پکار سن پا رہا تھا۔

''آپ کا صارف پہنچ سے دور ہے برائے مہربانی کچھ وقت بعد رابطہ قائم کریں''

لیکن پانچالی تھی کہ آنکھیں بند کیے اسی کا جاپ کیے جا رہی تھی۔

اسی کی تپسیا کو اس نے تو اپنا جیون مان رکھا تھا

پھر وھاٹس اپ آن کیا سارتھی کو میسیج کرنے لگی

''باہر کے دروازے پر کوئی ہے''

''بہت ڈر لگ رہا ہے''

''سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں؟''

کھٹاک کھٹاک آواز میں تیزی تھی

جلدی سے اس نے موبائل آف کیا دروازے پر پڑنے والی مسلسل ضرب سے لگ رہا تھا کہ کسی بھی پل کنڈہ ٹوٹ جائے گا پھر کیا ہو گا؟

یا اللہ۔ میرے بچے

خوف سے سہمی ہوئی ہرنی شکار ہو جانے سے زیادہ اپنے دونوں قیمتی مشک کی حفاظت کے لیے پریشاں کبھی دروازے کبھی کھڑکی پر نظر پردہ پھر سرکا دو آنکھیں سرخ سرخ سی اس کی ڈری سہمی آنکھوں سے ٹکرائیں فوراً آنکھیں بند کر لیں چیخ لبوں سے آزاد ہونے کو ہی تھی کہ اس نے سختی سے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا دانت کی چبھن سے ہونٹ کٹ گئے چہرے پر تکلیف ابھر آئی۔

پھر ہمت کر کے آہستہ سے پلکیں کھولیں ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

ضرب تو دروازے پر تھی پھر کھڑکی میں کون تھا اس نے سوچا جو اس کا دل دہلائے جا رہا تھا وہ ہیولا جب بھی نظر آتا ضرب کی آواز کم ہونے لگتی اور کم ہوتے ہوتے بند ہو جاتی۔

عجیب حالات جن سے وہ سہر سہر جا رہی تھی

پھر اسے خیال آیا کہ یہ رجب کا مہینہ ہے رحمتوں برکتوں کا مہینہ شب معراج کا مہینہ اس میں تو بلائیں اس کے بندوں کو نہیں ڈراتیں اس کی راتیں تو نورانی ہوتیں ہیں۔

یہ تو حبیب اور محبوب کے ملن کا مہینہ

دھم کی آواز نے اس کا تسلسل توڑا ہیولا کمرے میں آ چکا تھا اور آگے بڑھ رہا تھا یا اللہ یہ میری طرف کیوں بڑھ رہا ہے؟

یہ تو قریب آتا ہی جا رہا ہے

میرے بچے

وہ بالکل اس کے قریب تھا ڈر اور خوف سے اس نے آنکھیں میچ لیں

لمحے اس پر صدیاں بن کر بیتنے لگے نجانے کتنی دیر وہ ساکت پڑی رہی

تب ہی بند آنکھوں میں ایک روشنی کا چھنا کہ سا ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں

ہیولا تھا نہ ضرب کی آواز تھی

تھا تو صرف ایک ادراک

جس نے اس کے شعور کو جگا دیا تھا

اس کی ذات کا اس رات کا جنون رسے بھری تھی

اسے سیراب کر چکی تھی

وہ آزاد ہو چکی تھی حصار سے

اور صدا آ رہی تھی اس کے اندر سے کہ ملن کی رات میں ڈر کیسا خوف کیسا

وہ سربسجود ہو گئی۔

تب ہی سارتھی کو کیے گئے وھاٹس اپ میسیجز کا جواب موصول ہوا

''او۔ کے۔۔ ٹرین از ٹو آورس لیٹ''

بالجبر

نقشبند قمر نقوی بخاری
(ٹلسا، امریکہ)

عدالت کی کارروائی شروع ہونے میں دیر نہیں تھی۔

عدالت کے کمرے میں اچھا خاصا اجتماع ہو چکا تھا، ایک طرف چند اخبارات کے نمائندے جمع تھے، ان میں سے کئی اپنے کیمرے سنبھالے تھے باقی نوٹ بکس اور قلم۔ دوسری جانب کرسیوں پر مدعی اور مدعا علیہ کے متعلقین تھے جن کے سامنے ہی ان کے وکلاء اپنے مددگاروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر کرسیوں کی تین قطاروں پر جیوری کے نمائندے بیٹھ چکے تھے۔ کمرے کا ایک حصہ جج کے لیے مخصوص تھا جس کے گرد خوش رنگ لکڑی کا کٹہرا تھا۔ اس کے عقب میں بہت بڑی میز کے پیچھے جج کی کرسی، میز پر لکڑی کے ایک بورڈ پر ایک چوبی ہتھوڑا رکھا تھا جو جج لوگوں کو متوجہ یا متنبہ کرنے کے لیے چوبی بورڈ پر مار کر چونکا دیتا تھا۔

کٹہرے کے ایک جانب دو پولیس افسر بھی کھڑے تھے۔

کرسیوں کی دونوں قطاروں کے سامنے دونوں جانب ایک ایک پوڈیم بھی تھے۔ ایک مدعی کے وکیل کے لیے اور ایک مدعا علیہ کے وکیل کے بولنے کے لیے۔ ان پوڈیمز پر مائیکروفون بھی لگے تھے۔

وکیلوں کے ساتھ مدعی بھی بیٹھا تھا اور دوسرے جانب کی کرسیوں پر جو وکلا تھے ان کے ساتھ ان کا موکل، مدعا علیہ بھی تھا۔ مدعی کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے جبکہ مدعا علیہ کی ہیئت سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

جج کی نشست کے عقب میں ایک دروازہ کھلا اور ایک پولیس افسر نے بہ آواز بلند اعلان کیا:

''انز ایبل جج ڈینیو۔۔۔ آل رائز۔۔۔''

کمرے میں سارے حاضرین ادب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ عقبی دروازے سے جج داخل ہوا اس کا سیاہ رنگ کا قبا نما لباس شاید ریشمی رہا ہوگا۔ وہ بڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ حاضرین بھی اس کے بیٹھنے کے بعد اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

جج نے کارروائی شروع ہونے کا حکم دیا اور پہلے مدعی کے وکیل کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے دعوے کی تفصیل بتائے۔ وکیل اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس پوڈیم کے پاس آ گیا جہاں مائیکروفون لگا تھا اس نے پوڈیم پر اپنی فائل رکھ کر کھول دی۔

''یور آنر۔۔۔ میرا موکل ۔۔۔ رابرٹ شادی کے سرٹیفکیٹ کی رو سے مدعا علیہ شوگن کا شوہر ہے۔۔۔''

''شوگن کی جنس۔۔۔؟'' جج نے سوال کیا۔

''شوگن مرد ہے۔۔۔ سرٹیفکیٹ کی رو سے وہ رابرٹ کی بیوی ہوتا ہے''

''اس کا مطلب ہے کہ دونوں فریقین مرد ہیں۔۔۔''

''درست ہے یور آنر۔۔۔''

''کیا انہوں نے سیم سکس میرج کے تحت شادی کی تھی۔۔۔؟'' جج نے پوچھا۔

''جی ہاں یور آنر۔۔۔''

''کیا میڈیکل ایگزامینیشن کے رپورٹ سے شوگن مرد ثابت ہوتا ہے۔۔۔؟'' جج نے سوال کیا۔

''جی ہاں یور آنر۔۔۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ موجود ہے'' وکیل نے جواب دیا۔

''اس کی کاپیاں جیوری کو دی جائیں۔۔۔ اور میرج سرٹیفکیٹ کی بھی۔۔۔''

''مناسب ہے یور آنر۔۔۔''

''کیا رابرٹ بھی میڈیکل ایگزامینیشن سے گزرا۔۔۔؟'' جج نے سوال کیا۔

''جی ہاں یور آنر، اس کا سرٹیفکیٹ بھی حاضر ہے''

وکیل نے میڈیکل سرٹیفکیٹز اور میرج سرٹیفکیٹز کی کاپیاں پولیس افسر کو دیں جو اس نے جیوری کے نمائندوں کو تقسیم کر دیں۔

''ان دونوں کو شادی کیے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔۔۔'' وکیل نے کہنا شروع کیا ''اور دونوں اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔۔ رابرٹ مستقل ملازم ہے اور شوگن نیم وقتی کام کرتا ہے۔۔۔ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال بیوی کے ذمے ہے۔۔۔''

''جیوری کو بتایا جائے کہ بیوی کون ہے۔۔۔'' جج نے حکم دیا۔

''یور آنر۔۔۔ بیوی کا نام شوگن۔۔۔''

''شوگن مرد ہے۔۔۔؟؟ جج نے کہا۔

''ہاں یور آنر۔۔۔''

''رابرٹ بھی مرد ہے۔۔۔؟'' جج نے کہا۔

مدعا علیہ کا وکیل اس وقت اٹھ کر کھڑا ہوا۔۔۔

''آبجکشن۔۔۔ یور آنر۔۔۔''

''تمہیں کیا اعتراض ہے۔۔۔؟'' جج نے پوچھا۔

''یور آنر۔۔۔ ایک کو بیوی اور دوسرے کو شوہر کہنا نامناسب ہے وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ضرور ہیں لیکن دونوں کو پارٹنر تصور کرنا چاہیے۔ شوہر اور بیوی کہنا درست نہیں''

''کیوں درست نہیں۔۔۔؟ مدعی کے وکیل نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ قانون ان دونوں کو بطور پارٹنر شناخت کرتا ہے۔۔۔''

''مدعی کا دعوی کیا ہے۔۔۔؟ جج نے سوال کیا۔ اگرچہ اس کو مقدمے کی ساری تفصیلات کا علم تھا اور اس کے سامنے فائل بھی رکھی تھی۔

''وقوعے کی رات، فریقین محوِ خواب تھے۔'' مدعی کے وکیل نے کہنا شروع کیا۔

''ایک ہی بستر پر یا علیحدہ علیحدہ۔۔۔'' جج نے پوچھا۔

''ایک ہی بستر پر۔۔۔''

''پھر کیا ہوا۔۔۔؟'' جج نے سوال کیا۔

''مدعی۔۔۔شوگن نے رابرٹ کو ٹٹولا۔۔۔''

''جسم کے کس حصے کو ٹٹولا۔۔۔؟''

''اس کے کولھوں کو۔۔۔اور دبایا۔۔۔جس سے رابرٹ کی آنکھ کھل گئی۔۔۔'' رابرٹ نے شوگن کی طرف کروٹ لی اور اس سے پوچھا۔

''کیا نیند نہیں آ رہی۔۔۔؟''

''آبجکشن۔۔۔'' مدعا علیہ کے وکیل نے کہا۔

''آبجکشن سسٹینڈ؟'' جج نے کہا۔

''شوگن نے اس کے کولھوں کو نہیں دبایا تھا۔۔۔بلکہ۔۔۔رابرٹ نے اپنے کولھے شوگن کی طرف کر دیے تھے۔۔۔''

''پھر کیا ہوا۔۔۔'' جج نے سوال کیا۔

''شوگن نے اس کو رضامندی تصور کیا اور۔۔۔جو چاہتا تھا وہ برضا و رغبت کیا''

''یہ درست نہیں۔۔۔'' مدعی کے وکیل نے کہا ''رابرٹ نے ہرگز رضامندی کے ساتھ انڈرویئر نہیں اتاری تھی۔۔۔شوگن نے اس کی انڈرویئر کھینچ کر نیچے کی تھی۔۔۔''

''خیر۔۔۔پھر کیا ہوا۔۔۔؟'' جج نے پوچھا۔۔

''شوگن نے زبردستی وہ کام انجام دیا جو رابرٹ انجام دینا رہا تھا''

''آبجکشن۔۔۔'' شوگن کا وکیل پھر بولا۔

''آبجکشن سسٹینڈ۔۔۔''

مدعا علیہ۔۔۔شوگن۔۔۔کا وکیل اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

''یور آنر۔۔۔شوگن نے کوئی زبردستی نہیں کی۔۔۔''

''شوگن اپنے شوہر کی نسبت زیادہ قوی اور مسکولر ہے۔اس نے اپنی طاقت سے رابرٹ کو مغلوب کر لیا۔۔۔اس پر سوار ہو گیا۔۔۔''

''رابرٹ نے خود شوگن کو سوار ہونے کی دعوت دی تھی'' شوگن کے وکیل نے کہا۔

''یہ درست نہیں۔۔۔''

''یہ قطعاً درست ہے، رابرٹ نے شوگن کے ساتھ اس کام میں پورا تعاون کیا اور اس کو خوش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔۔۔''

''قطعاً غلط۔۔۔میرا موکل تکلیف سے بیتاب تھا۔۔۔اور اس کو یہ کام سخت ناگوار تھا لیکن وہ شوگن کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکا۔''

''یور آنر۔۔۔کیا میں آپ سے قریب آ کر بات کر سکتا ہوں؟''

''ہاں۔۔۔لیکن دوسرا وکیل بھی موجود ہو گا۔۔۔''

''کوئی بات نہیں۔۔۔''

''اجازت ہے۔۔۔''

مدعا علیہ کا وکیل پہلے بڑھا اور جج کے کٹہرے تک آ گیا پھر دوسرا وکیل بھی آ پہنچا۔

''رابرٹ یعنی مدعی۔۔۔اس دوران شوگن سے بہت نرم آواز میں بات کر کے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔۔۔جیسے وہ لطف اندوز ہو رہا ہو۔۔۔''

''یہ درست نہیں۔۔۔میرا موکل بہت تکلیف میں تھا۔۔۔''

''تم دونوں اپنی اپنی جگہ واپس جا سکتے ہو۔۔۔'' جج نے حکم دیا۔

دونوں وکیل واپس آ گئے۔

''مدعی کو پیش کیا جائے۔۔۔'' جج نے کہا۔

پولیس افسر مدعی۔۔۔رابرٹ۔۔۔کو اس اسٹینڈ میں لے آئے جہاں ملزمان کو سوال و جواب کے لیے بٹھایا جاتا تھا۔۔۔رابرٹ کسی قدر برہم نظر آ رہا تھا۔

''مدعا علیہ کے وکیل کو سوالات کی اجازت ہے۔۔۔'' جج نے کہا۔

وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

''کیا تم نے شوگن کو خود متوجہ کیا تھا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔''

''آبجکشن۔۔۔'' استغاثے کے وکیل نے کہا۔

''سسٹینڈ۔۔۔'' جج بولا۔

''رابرٹ کی پشت شوگن کی طرف تھی، ایسی حالت میں وہ اس کو کیسے متوجہ کر سکتا تھا''

''انڈرویئر تم نے خود اتاری تھی نا۔۔۔؟'' وکیل نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔''

وکیل مسکرایا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یور آنر۔۔۔میں کچھ اور پوچھنا نہیں چاہتا۔۔۔معزز نمائندگان جیوری نے توجہ کے ساتھ سب کچھ سن لیا ہو گا۔۔۔''

''رابرٹ کو اپنی نشست پر واپس جانے کی اجازت ہے۔'' جج نے کہا۔

''یور آنر۔۔۔'' مدعی کا وکیل بولا ''میں شوگن سے سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔۔۔''

''اجازت ہے۔۔۔شوگن کو پیش کیا جائے۔۔۔''

شوگن کو اب اسی کٹہرے میں لا کر بٹھایا گیا اور رابرٹ کے وکیل نے پوچھا۔۔۔

باقی صفحہ ۸۹ پر ملاحظہ کیجیے

وہی خدا ہے !

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

کھانے کی پلیٹیں، ڈونگے اور ڈیشز اُسی طرح ادھ بھرے اور ادھ خالی ڈائننگ ٹیبل پر دھرے تھے۔ جیسے ہی ہم نے چائے کوفی کی بابت دریافت کیا تمام احباب گفتگو درمیان میں چھوڑ کر ایک ایک کر کے ڈرائننگ روم کی جانب بڑھ گئے جس کا صاف کا مطلب یہ تھا کہ چائے اور کوفی ڈرائننگ روم میں بیٹھ کر پی جائے گی۔ میرے خیال میں اس کا ایک سبب سگریٹ کا دھواں بھی ہوسکتا ہے جو ڈائننگ میں چائے پینے کے سبب گھر والوں کے لیے ناگواری کا باعث بن سکتا تھا۔

منجھلے بیٹے کو بلا کر ہم نے احباب کی فرمائش کے مطابق چائے اور کوفی لانے کو کہا تو چہرے پر ناگواری کے تاثرات لاتے ہوئے بیٹا بولا ''دو دو چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی ایک بنوا لیتے ہیں'' ہم نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیٹے کو اُسی طرح کی دھیمی آواز میں کہا ''مہمانوں کی پسند کے مطابق بتلا رہا ہوں'' ہماری ہدایت کے جواب میں بیٹا اپنی زبان میں بُڑ بُڑ کرتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

جیسے ہی ہم ڈرائننگ روم میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر حفیظ نے چہرے پر ناگواری کے تاثرات لاتے ہوئے کہا ''یار تمہاری یہی بُری عادت ہے جب کام کی بات ہوتی ہے تو تم نک چڑھی بیوی کی طرح نخرے دکھانے لگتے ہو'' ہم نے کہا ''بھائی آپ کی خاطر مدارات اگر نخرے دکھانا ہے تو میں بیٹے کو منع کر دیتا ہوں چائے کوفی کے لیے'' فوری طور پر ہاتھ بڑھاتے ہوئے پروفیسر نصیب گویا ہوئے ''یار ایسا ظلم نہ کرنا، یہ کھانا وانا تو ہم تکلفاً کھا لیتے ہیں اصل میں زندہ ہم چائے اور سگریٹ پر ہیں۔'' ہاتھ میں دم توڑتی سگریٹ کو دکھاتے ہوئے مخصوص اشارہ کہ میری چائے بڑے کپ میں لانا التجائی انداز میں کرنے لگے۔

ہم نے صوفے کے کونے میں دھنستے ہوئے دریافت کیا ''ہاں۔۔۔ تو گفتگو کہاں تک پہنچی۔۔۔؟'' کمال صاحب نے اپنی مخروطی انگلیوں کو گھماتے ہوئے کہا ''میاں! میرِ مجلس کے بغیر گفتگو بے چاری تو ڈھاڈے کی جورو کی مانند درمیان میں اٹکی ہوئی ہے'' ''بسم اللہ، دیر کس بات کی ہے چلو بھائی! پروفیسر ڈاکٹر شکیل احمد خان، جہاں سے گفتگو کا سرا ٹوٹا تھا وہیں سے شروع کر دو۔''

یار تم لوگ بڑے کور ذوق ہو۔ علمی، ادبی اور سائنسی گفتگو کے لیے ایک موڈ اور ماحول درکار ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر آدمی کے ذہن میں نصب بلب ایک ایک کر کے خود بخود روشن ہوتے جاتے ہیں۔ تو بھیا! میری کھوپڑی میں تو اس وقت اندھیرا چھایا ہوا ہے یہ اپنے چھپے رستم جو سامنے بیٹھے ہیں اب تو ان کی باری بنتی ہے، یہ بتلائیں کہ ''خواب عذاب ہوتے ہیں یا ثواب ہوتے ہیں''۔

''او میرے ملک کے نامور دانش ور یہ عذاب جہنم والا نہیں ہے آپ پر گزرنے والی کیفیت والا عذاب ہے۔ اب دیکھو گفتگو شروع ہوئی ہے تو دماغ کے بلب جلنا شروع ہو گئے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ خواب کا تعلق انسان کی ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ آدمی خوش باش ہے تو خواب بھی ہنستے کھیلتے آئیں گے اور اگر آدمی کسی طور پریشان یا مضطرب ہے تو پھر بقول ہمارے بابا نورا ڈراؤنے آئیں گے۔''

''اس بار ہم نے ہمت کر کے گفتگو میں حصہ ڈالتے ہوئے اپنے اسٹیورڈ عقیل صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میاں تمہارا بیشتر وقت تو جہاز میں اڑتے ہوئے گزرتا ہے تم بتاؤ کہ دورانِ پرواز تمہیں نیند آ جائے تو خواب آتے ہیں، آتے ہیں تو کس طرح کے؟ ویسے تمہیں خواب دیکھنے کی خاص ضرورت تو نہیں۔''

اسٹیورڈ عقیل صاحب نے بڑی سی جماہی لیتے ہوئے۔۔آ آ آ۔۔ کر کے منہ پر ہاتھ رکھ کے جماہی کو واپس کیا اور بولے ''بھائی نیند کیا بلا ہے یہ تو ہم نہیں جانتے ہفتہ دو ہفتہ میں جب گھر آنا ہوتا ہے تو نیند نہیں بے ہوشی ہوتی ہے۔ البتہ دورانِ پرواز نیند کے نام پر جھونکے ضرور آتے ہیں اور اُنہیں جھونکوں کے درمیان خواب کے نام پر روزمرہ کے معمول سے چند جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے ہی وہ جھلکیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں تو کسی ایئر ہوسٹس کے ٹکرانے یا جہاز کے جھٹکوں کے باعث آنکھ کھل جاتی ہے اور ہماری شکل اس طرح کی ہو جاتی ہے جس طرح افیم کھانے والے شخص کی ہوتی ہے۔

''یار خواب تو میں نے ایک دفعہ دیکھا تھا! ڈاکٹر نسیم نے بھاری پیٹ کے باوجود سیدھا ہو کر بات شروع کی۔ اُس وقت میں کراچی، ہاں کراچی سے واپس گھر آ رہا تھا۔ جونہی اسلام آباد ایئرپورٹ پر باہر آ کے ٹیکسی ڈرائیور سے اپنے گھر کا کرایہ دریافت کیا تو طبیعت جھک ہو گئی۔ سوچا گھر فون کر کے بیٹے کو بلاؤں لیکن نامناسب وقت کے باعث اچھا نہ لگا۔ اسی ادھیڑ بُن میں دائیں بائیں ٹہل رہا تھا کہ ایک مغربی بود و باش کی نوجوان خاتون نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم مل کر ٹیکسی کر لیتے ہیں میں نے بھی اُسی طرف جانا ہے جہاں آپ نے جانا ہے۔''

''پھر!'' عقیل صاحب کے منہ سے پھر کا لفظ بہت اشتیاق سے ادا ہوا۔

پھر کیا جناب اندھے کو چاہیے دو آنکھیں۔ جھٹ پٹ میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور خاتون بیک سیٹ پر۔ ڈرائیور نے ہم دونوں کی کفایت شعاری پر مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور منہ ہی منہ میں گنگناتا ہوا تیزی سے گاڑی دوڑانے لگا۔ ایسے مواقع پر اکثر لوگ خواتین سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم ہمیشہ سے کم گو رہے ہیں لہٰذا اپنے خیالوں میں گم خاموش بیٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ خاتون بھی چیونگم چباتے ہوئے اپنے حال میں مگن رہیں۔ جس وقت ہم لوگ ٹیکسی والے کو اپنی منزل بتلا رہے تھے تو خاتون نے اپنا

پتہ شہری علاقہ بتلایا تھا مگر اچانک گاڑی رکوا کر ایک اندھیری گلی میں گاڑی موڑنے کے لیے ڈرائیور کو اشارہ کیا تو ڈرائیور بولا ''آپ نے تو شہر میں اترنے کے لیے کہا تھا'' خاتون نے اطمینان سے کہا ''جی جی بس یہیں تھوڑی دُور ہے۔''

گاڑی جوں جوں گلی میں بڑھ رہی تھی اُسی رفتار سے اندھیرا بھی بڑھ رہا تھا۔تھوڑی دُور چلنے کے بعد سر پھیر کر ڈرائیور خاتون سے اُن کی منزل دریافت کرتا وہ ہر بار ہاتھ کے اشارے سے یہی کہتیں ''بس تھوڑی دُور رہ گیا ہے'' کئی دفعہ کی تھوڑی دُور کے بعد سنسان پہاڑی کے قریب خاتون نے یہ کہہ کر گاڑی رکوائی کہ وہ سامنے میرا گاؤں ہے اور ڈرائیور کو اپنے حصے کا کرایہ ادا کر کے چلی گئیں۔خاتون کے جانے کے بعد ہم نے سوچا کہ فرنٹ سیٹ پر بے آرامی سے بیٹھنے کے بجائے بیک سیٹ پر کمر سیدھی کر لیتے ہیں۔ابھی گاڑی تھوڑی دُور ہی چلی ہوگی کہ ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ہم نے ڈرائیور سے پوچھا ''کیا ہوا؟'' ڈرائیور خوف سے بولا ''صاحب وہی عورت'' وہی عورت کے نام پر ہماری سٹّی گم ہوگئی ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ڈرائیور جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور بونٹ کی طرف اشارہ کر کے ہمیں پکارنے لگا ''یہ دیکھئے! تازہ ڈنٹ اُسی عورت کے ٹکرانے کا ہے۔'' سراسیمگی کے عالم میں بونٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہم نے کہا ''یہ کس طرح ممکن ہے؟'' کافی دیر ہم لوگ ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے تبادلۂ خیال کرتے رہے یہ ہاتھ رکھنا بھی ایک طرح سے حوصلہ دینے کے مترادف تھا۔ڈرائیور نے ہمت کی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہمیں فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔گاڑی تھوڑی دور چلی ہوگی کہ ڈرائیور زور سے چلّایا ''وہ دیکھئے صاحب!'' جیسے ہی ہم نے ڈرائیور کی آواز پر آنکھیں پھاڑ کر سامنے کی سمت دیکھا تو وہی خاتون چیونگم چباتی ہوئی سر کے ہیٹ کو درست کرتی نظر آئیں۔ہم نے ہوش وحواس بحال رکھتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی نہ روکنے کی تنبیہہ کی۔ڈرائیور نے بھی گاڑی کی اُچھل کود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایکسیلیٹر پر پیر کا پورا دباؤ ڈالے رکھا۔خدا خدا کر کے پکی سڑک آئی تو ہم لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔کچھ دُور چلنے کے بعد ایک چھپر ہوٹل نظر آیا تو میں نے ڈرائیور کو چائے پینے کی دعوت دی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی۔

رات کافی ہوگئی تھی ہم دونوں چائے کے دوران گزری ہوئی واردات کا ذکر کرنے لگے تو ہوٹل کے مالک نے ہماری طرف کان لگا کر توجہ کی اور پھر اُٹھ کر ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔''صاحب یہ آپ امریکہ والی خاتون کی بات تو نہیں کر رہے؟'' حیرت اور تعجب کو دباتے ہوئے ہم نے کہا ''تمہیں کیسے معلوم؟'' ہوٹل والے نے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ''بے چاری! کچھ دن پہلے امریکہ سے آئی تھی اور اکیلے ٹیکسی کر کے اپنے گاؤں جا رہی تھی کہ چند اوباش نوجوانوں نے اُس کی عزت لوٹ کر اُسے قتل کر دیا تب سے اُس کی روح تڑپ رہی ہے۔صاحب جی! دعا کیجیے اللہ تعالیٰ اُس کی روح کو صبر عطا فرمائے۔''

''او میرے دانشور بھائی! یہ کہانی میں برسوں سے سنتا آ رہا ہوں مجھے تو یہ سرے سے گھڑیل لگتی ہے۔ویسے بھی تم سے خواب سنانے کو کہا تھا قصّہ نہیں۔'' ڈاکٹر نسیم نے جب بات شروع کی تو ان کی آواز دُور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔''میرے لیے تو آج بھی اک خواب ہی ہے، بھیانک خواب۔اور میں جب تک زندہ رہوں گا یہ خواب اپنے دماغ سے کسی طور بھی کھرچ نہ پاؤں گا۔''

ڈاکٹر نسیم نے فضا کو سحر انگیز بنا دیا تھا جسے نارمل کرنا ضروری تھا لہٰذا حضرت افلاطون ایسے مواقعوں پر اپنی دانش کو فوراً کام میں لاتے ہیں۔اس بار بھی اپنی دانش کا تیر ہماری طرف داغتے ہوئے بولے ''میاں! تم بڑے گپ چُپ بیٹھے ہو، تم نے تو بڑی رنگ برنگی زندگی گزاری ہے۔تمہارے خواب بھی یقیناً رنگ برنگے ہونے چاہئیں۔'' حسبِ روایت افلاطون صاحب نے آنکھ دباتے ہوئے ہماری طرف ہاتھ بڑھایا تو ہمیں بھی اخلاقاً اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مَس کرنا پڑا۔

کچھ اس طرح فقیر نے زندگی کی مثال دی!
مٹھی میں دھول لی اور ہوا میں اُچھال دی!!

''سو بھائی ہماری زندگی اور ہمارے خواب تو اس شعر سے عبارت ہیں اب آپ جو چاہیں نتیجہ اخذ کر لیں۔''

''دیکھا۔۔۔دیکھا۔۔۔یہ ہمیشہ ہی دامن بچا جاتے ہیں۔''

''لطیفی صاحب درست کہہ رہے ہیں۔میاں! یاروں سے کیا پردہ، دوست ہوتے ہی دکھ سکھ میں شرکت کے لیے ہیں، ہم بھی تو سنیں! تمہارے خواب کس طرح کے ہوتے ہیں'' غوری صاحب نے لطیفی صاحب کی بات میں وزن ڈال کر ایک طرح سے ہمیں مجبور کر دیا۔

''اوں۔۔۔آں۔۔۔کہہ تو صحیح رہے ہو یارو! اب مسئلہ یہ ہے کہ کہاں سے شروع کیا جائے اور کہاں ختم۔بات تو ایک طرح سے ہزاروں خواہشیں والی ہے۔بہرحال کوشش کی جاسکتی ہے۔اب یہاں اپنی زندگی کی بابت آپ لوگوں کو کچھ بتانے سے بہتر ہے کہ چراغ لے کر کھڑا ہو جاؤں۔''

''وہ سب ہمیں معلوم ہے آپ اپنے خوابوں کی بابت بتلائیں۔''

جمالی صاحب نے ایک طرح سے حتمی فیصلہ دینے کی کوشش کی۔

ایک بات آپ کو ابتدا میں بتلا دوں کہ میں نے اپنے مرحومین کو اُس طرح خواب میں کبھی نہیں دیکھا جس طرح اکثر لوگ بتلاتے ہیں کہ ابّا باجی کا رشتہ فلاں کے ساتھ پکا کر گئے ہیں، نانا نواسے کا نام رکھ گئے ہیں، ماموں اپنی اولاد کو وراثت میں حصہ نہ ملنے پر خفا ہو رہے ہیں، پڑوسی لیا ہوا قرض معاف کرانے آ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ہاں! چلتے پھرتے اپنے پیاروں کو اکثر دیکھتا ہوں مگر اُن سے کبھی کسی طرح کا مکالمہ، گفتگو یا مطالبہ نہیں ہوا۔

''حیرت کی بات ہے، ہمارے ابّا جی تو اکثر خواب میں آ کے باتیں کرتے ہیں۔'' ٹھیک کہہ رہے ہو میری والدہ بھی اُس وقت بہت ناراض ہوتی ہیں جب اُن کے نام کی خیرات نہ کی جائے۔عقیل صاحب نے کمال صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مہر ثبت کر دی۔

بھئی دیکھئے اپنے اپنے دماغ کی ساخت، اپنی اپنی نفسیات اور اپنے

اپنے حالات کے تحت آدمی خواب دیکھتا ہے ضروری نہیں جو خواب زید دیکھے بکر بھی عین مین اُسی طرح کے خواب دیکھے۔ اب مجھے لے لیجیے آنکھ لگی نہیں اور خواب آنا شروع۔ ساری رات دنیا جہان کے خواب دیکھتا ہوں۔ آنکھ کھلنے کے بعد کوئی مجھ سے پوچھے کیا دیکھا تو میں کوراجواب دے دیتا ہوں ''مجھے کچھ یاد نہیں'' لطیفی صاحب نے ہماری بات کو آگے بڑھایا تو ہماری ہمت بھی بڑھ گئی۔

''دماغ کی ساخت اور نفسیات کے علاوہ اعمال اور نظامِ ہضم کو بھی شامل کر لیجیے۔'' کمال صاحب نے حسب عادت لقمہ دیا۔

ہمارے ساتھ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ ہمیں نہ صرف دیکھے گئے خواب یاد ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ہم نے وہ خواب جاگتے میں دیکھے ہیں۔ واقعات کے ساتھ معاملات بھی پوری طرح یاد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ہم بیرون ملک گئے تو وہاں ایک صاحب سے کسی بات پر تو تکرار ہوگئی۔ ہم نے طیش میں آ کر اُن صاحب کو مُکا دے مارا۔ اُن صاحب نے جیب سے پستول نکالا اور ٹھاہ ٹھاہ تین گولیاں ہمارے پیٹ میں اتار دیں۔ گولیوں کی آواز سے ہماری آنکھ کھلی تو گولیاں مارنے والے صاحب ہمارے میزبان اور مقام اُن کے گھر کے سامنے والا چوک تھا۔ ہمیں بڑی شرم آئی کہ اگر ہم اپنے میزبان کو یہ خواب سنائیں گے تو وہ ہمارے بارے میں نجانے کیا رائے قائم کریں گے۔

ایک دفعہ کا قصّہ ہے کہ ہم اپنی شریکِ حیات کے ساتھ بازار شاپنگ پر گئے جیسے ہی بازار میں داخل ہوئے سامنے سے آتی ہوئی نیلی آنکھوں والی عورت نے ہمیں غور سے دیکھا اور بولی ''تو یہاں پھر رہا ہے اور میں نے ساری دنیا چھان ماری، چل میرے ساتھ۔'' اب جناب ایک بازو ہمارا اُس خاتون کے ہاتھ میں اور دوسرا ہماری بیگم کے۔ دونوں ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہیں اور اس شدت سے کھینچ رہی ہیں کہ ہمارا ایک بازو اُس خاتون کے ہاتھ میں اور دوسرا اپنی شریک حیات کے ہاتھ میں اور دھڑ زمین پہ۔ جونہی ہماری چیخ نکلی پھر آنکھ کھُل گئی۔

ہمارے خوابوں میں لطف کے بجائے کرب کی کیفیت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ مراد فیملی سے ہے دوسرے شہر شادی میں شرکت کی غرض سے گئے۔ لڑکی کے والدین صاحبِ حیثیت لوگ تھے انہوں نے ہمیں رات بسر کرنے کے لیے الگ کمرہ مہیا کیا اور ہر طرح کی آسائش بھی میسر تھی۔ ہر آدمی اکثر یہ شکایت کرتا ہے کہ اُسے اپنے گھر، اپنے کمرے اور اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔ ہم بھی اُنہی بے چین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تمام آسائش سے پُر بیڈروم میں صرف ایک چیز کی کمی تھی ''نیند''۔ قریب ساری رات کروٹیں بدلنے کے بعد جب پچھلے پہر کچھ دیر کے لیے ہماری آنکھ لگی تو ایک شناسا چہرہ خاموشی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا اور دبے پاؤں ہمارے قریب آ کر آس پاس نگاہیں گھما کر تسلی کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے ہمارا گلہ دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ چیخ کے ساتھ ہماری آنکھ کھلی تو ہم پسینے میں شرابور تھے مسئلہ پھر وہی درپیش کہ اس واقعے کا ذکر کریں تو کس سے کریں۔ لہٰذا خاموشی میں عافیت سمجھی اور بجھے دل کے ساتھ شادی میں شرکت کر کے تین دن کے پروگرام کو دو دن پہ مختصر کیا اور علالت کا جھوٹ بول کر خاموشی سے گھر کو لوٹ آئے مگر آج تک اُس خواب بلکہ اُس طرح کے کئی خوابوں کا بوجھ ہم دل پر لیے گھوم رہے ہیں۔

میاں! تمہارے خوابوں پر تو ہوررفلم بن سکتی ہے۔ جمالی صاحب نے جملہ چسپاں کیا تو ہم مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔

کل صبح! یقیناً کل صبح قریب تین بجے، نہیں تین بجے سے کافی پہلے ہم گھر سے نکلتے ہیں، کچھ دیر جانے پہچانے راستوں کے بعد اجنبی راہیں اور اجنبی لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم ان لوگوں کو روک کر پوچھیں کہ بھائی یہ کونسا علاقہ ہے اور یہاں کون لوگ بستے ہیں؟ پہلے پہل جب ہم نے ایک صاحب کو روک کر اپنے دل کا ماجرا بیان کیا تو انہوں نے ہمیں سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور ہاتھ کی جنبش سے عدم واقفیت کا تاثر دے کر آگے بڑھ گئے۔ ہمارا دل چاہا کہ ہم کچھ دیر رک کر ستالیں، بھوک بھی چمک رہی تھی مگر دُور دُور تک کھانے کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی لیکن کوئی ایسی قوت تھی جس نے ہمارے رکتے قدم کو چلتے رہنے پر مجبور کیا۔

سفر کے کئی پڑاؤ گزر گئے ہیں ہر پڑاؤ کا ماحول اور وہاں کے لوگوں کی ہیبت مختلف ہونے لگتی تھی۔ یہاں بھی ہماری خواہش ہے کہ ہم لوگوں سے اس جگہ کا نام اور یہاں کے لوگوں کی بابت کچھ دریافت کریں مگر ہر شخص ہے کہ چپ کی چادر اوڑھے اپنے کام میں مگن دکھائی دیتا ہے۔ ایک شخص دُور سے آتا دکھائی دیا تو ہم نے دونوں ہاتھ اور پیر کھول کر اُس کے سامنے دیوار بنتے ہوئے دریافت کیا کہ بھائی صاحب! اس جگہ پر کھانا کہاں ملتا ہے؟ کھانے کے نام پر اُن صاحب کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے اور کچھ توقف کے بعد انہوں نے اپنی پشت کی جانب منہ کر کے ہاتھ کے اشارے سے سیدھا جانے کو کہا۔

ہم چل رہے ہیں، چل رہے ہیں مگر کسی طرح کا کوئی ذی روح ہمیں دیکھنے یا ہم پر توجہ دینے کے لیے قطعی تیار نہیں۔ ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے بھوک کے ساتھ پیاس بھی ستانے لگی ہے مگر یہاں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں۔ کبھی اندھیرا بڑھ جاتا ہے تو کبھی اجالے کی روشنی ہمارے گرد ہالہ کھینچ لیتی ہے۔ کبھی اوس گرتی محسوس ہوتی ہے تو کبھی بارش کی بوچھار ہمارے وجود کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ یہاں بھوک کی کیفیت محسوس نہیں ہو رہی، پیاس بھی اُس شدت سے تنگ نہیں کر رہی۔ ایک بات یہاں جس نے ہمیں توجہ پر مجبور کیا وہ یہاں کے لوگوں کا لباس تھا۔ جو کوشش کے باوجود نظر نہ آتا تھا مگر اُن کا سراپا پوری طرح ملفوف تھا۔ اُن کے چہرے خوش شکل مگر خدوخال کوشش کے باوجود نمایاں نہ تھے۔ اُن کی چال میں بلا کا بانک پن، ٹھہراؤ اور تہذیب سے مرصع تھی۔ وہ لوگ کون تھے، کیا کرتے تھے، اس کی بابت ہمارا علم صفر تھا۔ ہم جب بھی یہ جانے بغیر کہ ہمارے سامنے جو آ رہا ہے وہ عورت ہے یا مرد؟ بچہ ہے، بوڑھا یا جوان؟ جس تیز رفتاری سے ہم آنے والے شخص کی طرف بڑھتے اسی برق رفتاری سے اس کا ہیولہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ ہماری بے چینی صرف یہ تھی کہ ہم کہاں ہیں اور کس غرض سے

''چہارسُو''

ہمیں یہاں لایا گیا ہے۔ پچھلے تین نہیں بہت سے ڈراؤنے خوابوں کی تعبیر یا تصویر رہ رہ کر ہمارے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ ہمارا دل کہہ رہا تھا کہ وہ خواب جو زندگی بھر تم دیکھتے رہے ہو وہ خواب نہیں آج کے خواب کا پیش خیمہ تھے۔ خواب نہیں حقیقت۔ جو آج ہمیں پیش آنے والی ہے۔

''اے میرے قلم کار اتنی ہیبت نہ پھیلا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جائے!'' افلاطون صاحب کی حسِ مزاح نے ماحول کی سراسیمگی کو کسی قدر ہوا میں تحلیل کر دیا مگر سب لوگ دلچسپی سے آنکھیں پھاڑے ہماری جانب دیکھ رہے تھے جس کا مطلب تھا ہمیں قصہ جاری رکھنا چاہیے۔

ہم بڑھ رہے ہیں آگے اور آگے حیرت مگر یہ ہے کہ جوں جوں ہم سفر طے کر رہے ہیں ووں ووں ہماری تکان دُور ہو رہی ہے، ہمارا جسم ہلکا پھلکا اور دل و دماغ ہشاش بشاش ہونے لگے ہیں۔ شاید یہ ان درختوں کا کرشمہ ہے جو گھنے اور سرسبز و شاداب ہونے کے ساتھ پھلوں سے لدے ہوئے ہیں مگر ٹھہریے! یہ سبز رنگ ہم نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔ سبز ہونے کے باوجود ان میں خاص طرح کی سنہری مائل مقناطیسی لہریں ہمیں اپنی اوور کھینچ رہی ہیں اور ان میں لگا پھل کس قدر دل نشین، کس قدر جاذبِ نظر اور کس قدر خوش رنگ ہے۔ بظاہر ہماری نظر سرخ رنگ کی گواہی دے رہی ہے مگر ایسا سرخ رنگ نہیں۔۔۔ ایسا سرخ رنگ جس میں اشتہی رنگ کی آمیزش ہو، جس میں خاص طرح کی خوشبو اور دیکھنے والے کے لیے خاص طرح کی طلب ہو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ اور یہ۔۔۔ یہ ہمارے گرد بہتی ندی کا پانی۔۔۔ کس سُبک روی سے بہہ رہا ہے۔۔۔ ہم ہاتھ بڑھا کر اس پانی سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں مگر ہمارا ہاتھ اُس پانی کی جانب جو رنگ، خوشبو اور بہاؤ میں سب سے الگ سب سے جدا ہے ہمارا ہاتھ روک دیتا ہے۔۔۔ ہمارے دل سے آواز آتی ہے تم پانی کی طرف ہاتھ کیوں بڑھا رہے ہو۔۔۔ تم تو کلی طور پر سیراب ہو۔۔۔ کلی طور پر۔۔۔

اب ہمارے دل میں خوف کے بجائے اشتیاق پیدا ہو رہا ہے۔ ہم آگے اور آگے بڑھتے جا رہے ہیں اسی لباس، اسی نقوش، اسی ہیئت کے لوگ ہمارے دائیں بائیں چل رہے ہیں، ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اُن سے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ رک کر دریافت کریں کہ للہ! ہمیں ہماری منزل کا پتہ بتا دو۔۔۔ وہی منزل جس کے لیے ہم پہروں۔۔۔ دنوں۔۔۔ اور قرنوں چل رہے ہیں اور اب بھی اس امر سے بے خبر ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، کیوں جا رہے ہیں اور کس لیے جا رہے ہیں اور ہمارے اس سفر کا انجام کیا ہوگا؟

اس بار بھی ہمارے دل اور دماغ کی یکجائی سے آواز آتی ہے کہ ''اے بے صبر انسان ہمت سے کام لے تیری منزل تجھ سے زیادہ دُور نہیں!''

اگر ہماری جگہ یہاں کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اپنے دل کی آواز کو غیبی آواز کا تاثر دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کرتا! مگر ہمارے دل کی آواز کیا ہماری آواز ہوتی ہے؟ اگر جواب ہمارے ذمہ ہے تو ہم کہیں گے ہرگز نہیں، دل تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جس کا کام ہمارے جسم کو خون مہیا کرنا ہے اور کیا ہمارا جسم بجائے خود خون کا لوتھڑا نہیں؟

سفر پھر سے شروع ہو گیا ہے، رفتار خود بخود آہستہ آہستہ اور آہستہ ہو رہی ہے۔ سنہری لہروں میں لپٹے سرمئی بادل قریب اور قریب آ گئے ہیں فضا میں خاص طرح کی نرماہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ لوگوں کی چہل پہل اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جیسے یہاں کے سارے مکین موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر آ گئے ہیں۔ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ نہ کوئی کسی کو دیکھتا ہے، نہ کوئی کسی سے پوچھتا ہے، بس ہر کوئی اپنی ترنگ میں سبک روی سے چل رہا ہے۔۔۔ چل رہا ہے۔۔۔ چلے جا رہا ہے۔

اب تو ہمارے دل میں یہ خواہش سر ابھارنے لگی ہے کہ اے کاش!۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم یہاں کے ہو رہیں۔۔۔ نہ جھوٹ ہو۔۔۔ نہ چھل۔۔۔ نہ کپٹ ہو۔۔۔ نہ دھوکا۔۔۔ نہ فریب ہو۔۔۔ محبت۔۔۔ فقط محبت۔۔۔ محبت کے سوا کچھ نہ ہو۔۔۔ اوہ! میرے خدا۔۔۔ یہ خوشبو۔۔۔ یہ سراپا۔۔۔ یہ بانکپن۔۔۔ یہ لجاجت۔۔۔ یہ اپنائیت۔۔۔ یہ انداز سپردگی۔۔۔!!

ہم دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ میرے ہاتھوں کی لرزش میرا ساتھی محسوس کرتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھ میرے سراپے کے گرد اس شدت سے پھیلا دیتا ہے کہ میں خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کرتا ہوں۔ پل بھر کا یہ سفر ہمیں ایک ایسی پناہ میں لے جاتا ہے جہاں کی رونق، نور، انسان کی آنکھیں چکا چوند کر دیتی ہے۔۔۔ میرا ساتھی مجھے دیوانہ وار چومنے لگتا ہے۔ میں بھی ہمت کرتا ہوں مگر میرے اندر وہ گرم جوشی پیدا نہیں ہو پاتی جو میرے ساتھی کے اندر ہے۔۔۔ میں اُس کے اندازِ خود سپردگی پر حیران ہوتا ہوں مگر اُس کی مسکراہٹ اور ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلانے کی ہوش ربا ادا مجھے خود بخود اُس کی اوور لے جاتی ہے اور پھر۔۔۔ آدم و حوّا کی اولاد۔۔۔ دو روح ایک جان ہو جاتے ہیں۔

وہ جس انداز سے میری خوشنودی دریافت کرتی ہے اُس سے میری آنکھیں چونک جاتی ہیں۔ وہ میری کیفیت کو بھانپ کر تیزی سے جانے کے لیے اٹھتی ہے۔۔۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کر بے تابی سے کہتا ہوں۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے۔۔۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکتی ہے اور بادلوں میں کڑکنے والی بجلی کو دیکھ کر اعتماد سے کہتی ہے۔۔۔ شینہ۔۔۔!

میری آنکھ کھل جاتی ہے۔۔۔ میں آج بھی پسینے میں شرابور ہوں۔۔۔ مگر میرے دل کی دھڑکن۔۔۔ پُرسکون۔۔۔ اور دماغ مطمئن ہے۔۔۔

میں باہر جا کر تازہ ہوا کی خنکی، ادھورے چاند کی مٹیالی چاندنی میں پھولوں، پودوں اور لچکتی بیلوں سے سرگوشیاں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔ میرے پلنگ کے سرہانے دیوار پر آویزاں تصویر کے ہنستے مسکراتے سراپے نے میرے قدم روک لیے ہیں۔۔۔ اور مدہوش کر دینے والی تیز خوشبو میرے نتھنوں میں بھر گئی ہے۔۔۔!!!

''جبر کی زنجیر''

منظر ایوبی

(کراچی)

بستی میں جس جانب دیکھا تیرے چاہنے والوں کی
بگڑی ہوئی تقدیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

پورب پچھّم اتر دکّن سب کا اک سورج ہے تو
الگ الگ تنویریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

سرمایہ داروں کی سانسیں اکھڑ چکیں لیکن اب تک
قبضے میں جاگیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

شہر کے چوراہے پر کچھ کچھ، اَن دیکھی بے چہرہ سی
لٹکی ہوئی تصویریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

دنیا میں ہر رہزنِ دل کو آزادی حاصل ہے مگر
تجھ پر ہی تعزیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

الٹے سیدھے خواب ہیں سب کے، ٹیڑھی ترچھی امیّدیں
ایک سی پھر تعبیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

کالوں، گوروں سب کے لبوں پر امن کا نعرہ ہے تو پھر
ہاتھوں میں شمشیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

آہیں بھرتے قیدی ہی سے منظرؔ پوچھ رہے ہو تم
پگھلی ہوئی زنجیریں کیوں ہیں، میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

زندانِ دلِ زار کا در کھول رہا ہوں
آلام کی یورش ہے کہ میں بول رہا ہوں

جا کر کوئی کہہ دے یہ ذرا اہلِ خرد سے
میزانِ جنوں میں، میں خِرد تول رہا ہوں

دو دن کا ہُوں مہمان فقط اے قفسِ زیست
میں مائلِ پرواز ہوں پَر تول رہا ہوں

یہ فیض ہے شیرینیِ گفتار کا تیری
میں تلخیِ حالات میں رَس گھول رہا ہوں

اُس طرزِ فقیری پہ مجھے ناز ہے جس میں
میں طعنہ زنِ لعنتِ کشکول رہا ہوں

آنے کو ہے نیند اِس سفرِ زیست میں شاید
گہوارۂ ہستی میں ابھی ڈول رہا ہوں

مجھ کو تو بھی کر زیبِ گلو اے مرے دلدار
میں تیرا وہ گوہر ہُوں جو انمول رہا ہوں

کیا ہے کوئی شیدائی الفاظ و معانی
اقلیمِ سخن کے میں گُہر رول رہا ہوں

○

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

کچھ یہاں پھیلا ہوا تھا ، کچھ وہاں پھیلا ہوا
خواب میں دیکھا ، زمیں پر آسماں پھیلا ہوا

شب کے اندھیارے میں، دیکھی روشنی ہی روشنی
دن کے اجیالے میں تھا ، ہر سو دھواں پھیلا ہوا

ہم نے پھولوں کی طرف جب بھی کیا اپنا سفر
ہر قدم ہم کو ملا ، دشتِ تپاں پھیلا ہوا

بے اماں اکثر ہوا ہے ، آدمی اس کے تلے
آدمی کے سر پہ جو ہے سائباں پھیلا ہوا

ایک نقطے پر سمٹ آیا یقیں کا ارتکاز
اس سے پہلے ، عالم تھا گماں پھیلا ہوا

عمر بھر باندھی تھی، جس دامن میں اپنی ہر طلب
آج وہ دامن تھا سوئے آسماں پھیلا ہوا

○

غالب عرفان
(کراچی)

چہرے چہرے سے ہے خوشی غائب
زندہ لوگوں سے زندگی غائب

خود ہی دیکھا تو پھر یقین ہوا
آئنے میں ہے چہرگی غائب

کل تو ہم سب یہیں تھے لیکن آج
کوئی حاضر ہے اور کوئی غائب

رات بھر تیرگی کے بعد بھی جو
دن ہے نکلا تو روشنی غائب

نسلِ حاضر کے آدمی میں بھی
عقل حاضر ہے آگہی غائب

رنگ و خوشبو سے لیس انساں میں
جسم حاضر ہے تن دہی غائب

دیکھتا ہوں ۔۔۔ جو کوئی تازہ غزل
شعر حاضر ہے شاعری غائب

خواب زادوں میں خواب ہے لیکن
خواب منظر سے ہے میری غائب

ہے مسافر، مسافرت بھی مگر
راستے سے ہے راستی غائب

دشت و دریا سے شہرِ عرفاںؔ تک
روح باقی ہے تازگی غائب

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

دلِ بے تاب سے نکلے ہوئے ہیں حسن وخوبی
سبھی اوراق پر بکھرے ہوئے ہیں حسن وخوبی

تری تصویر میں کیسی ہوئی ہے ان کی صورت
کہیں سے ڈھونڈ کے لائے ہوئے ہیں حسن وخوبی

ہنر میں دستِ قدرت رنگ وروغن بھر رہا ہے
فنِ تعمیر میں چمکے ہوئے ہیں حسن و خوبی

کوئی بھی نقش گھر میں جی لبھانے کا نہیں ہے
در و دیوار سے اُترے ہوئے ہیں حسن وخوبی

یہ مہماں زمزے ہیں قہقہے ہیں قمقمے ہیں
ہمارے شہر میں اُترے ہوئے ہیں حسن وخوبی

ہر اک دیوار کے سائے میں جا کر دیکھتا ہے
نجانے کس طرف سوئے ہوئے ہیں حسن وخوبی

مری تحریر میں اب کیف وکم عنقا ہے ثاقبؔ
کہ لفظوں میں چھپے بیٹھے ہوئے ہیں حسن وخوبی

○

ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

اعتکافوں میں رہے فن کی ریاضت کی ہے
عمر بھر اپنے ہی خوابوں کی امامت کی ہے

چھیڑ پھولوں سے ہواؤں سے شرارت کی ہے
زخم کھائے ہیں تو کانٹوں نے عیادت کی ہے

صحنِ مسجد میں تو جاروب کشی کی ہے مگر
ہم نے گلیوں میں ہی تکمیلِ عبادت کی ہے

کچھ قصور ایسا زلیخا کی نظر کا بھی نہیں
جسم کے بھیس میں روحوں نے سیاست کی ہے

غیر ممکن تھا عمارت کو بچانا لیکن
جان پر کھیل کے ملبے کی حفاظت کی ہے

تو ہی موجود وہاں تھا نہ مصاحب تیرے
پھر بھی زنجیر ہلانے کی جسارت کی ہے

میری پہچان سے ہی اُس کا بھرم تھا سارا
دوست ہوتا تھا مرا جس نے ملامت کی ہے

کم نہیں ہونے دیا دردِ جہاں کا رتبہ
ہم نے مر کر بھی صلیبوں کی حفاظت کی ہے

بوجھ اُتاریں بھی تو شاہین سرِ شام کہاں
اجنبیت تو خرابے میں قیامت کی ہے

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

بالکل نئے بھی ہو کے پُرانے سے لگتے ہیں
ہم لوگ رفتگاں کے زمانے سے لگتے ہیں

رِشتہ تو اُن سے کوئی نہیں، پر جنابِ عشق
عادات سے مرے ہی گھرانے سے لگتے ہیں

زخموں کی ٹیس اپنی جگہ اِک عذاب ہے
لیکن جو زخم، زخم دِکھانے سے لگتے ہیں !

شاید زمانے کو بھی ہوں اُن سے شکایتیں
شاکی جو لوگ اپنے زمانے سے لگتے ہیں

کمرے میں کوئی اَور نہیں ہے، تو غالباً
ہم، ہم کلام اپنے سرہانے سے لگتے ہیں !

دراصل تارِ اشکِ رواں کے ہیں سلسلے
تسبیح میں پروئے جو دانے سے لگتے ہیں

آتش مزاج لوگ جو لب کھولنے لگیں
لاوا اُگلنے والے دہانے سے لگتے ہیں

اِک پیڑ جب گِرایا گیا تو پتہ چلا
دھرتی کو زخم پیڑ گرانے سے لگتے ہیں

جب بھی مَیں کہنا چاہوں کوئی بات تو مُجھے
الفاظ سب لغت کے پُرانے سے لگتے ہیں

اس شہرِ بے مثال کے باغات میں نسیمؔ
شاخوں پہ پھول آگ لگانے سے لگتے ہیں

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

وہ کم نظر جو قریۂ آزر کے ہو گئے
مدت ہوئی کہ لوگ وہ پتھر کے ہو گئے

رہبر بنے جو آپ تھے منزل سے بے خبر
گم کردہ راہ ہم بھی تو رہبر کے ہو گئے

حاصل بھی کیا ہے خواہشِ نام و نمود سے
نسیاں کی نذر تذکرے اکثر کے ہو گئے

یہ بھی عجب ہے یار کی دیکھی نہ اک جھلک
محرومِ دید پھر بھی اسی در کے ہو گئے

ہم نے سفر کے خواب بُنے تھے تمام عمر
جب دشتِ بے صدا میں گئے گھر کے ہو گئے

آئے نہ چہچہاتے پرندے جو لوٹ کر
رہ کے قفس میں وہ بھی تو بے پر کے ہو گئے

بے چہرگی میں کیسے گزرتی ہے زندگی
اس تجربے میں ہم بھی تو بے سر کے ہو گئے

طغیانیوں میں غم کے سفینوں کے خیر ہو
ساحل سے کٹ کے وہ بھی سمندر کے ہو گئے

سرخوش تھے قتل گاہ میں آئے جو تشنہ لب
ہم پر کھلا کہ سرخرو، وہ مر کے ہو گئے

○

ساغر ترپاٹھی

(ممبئی، بھارت)

بکھرے ہوئے جذبات کا عنوان ہیں ہم بھی
تم ساتھ نہیں ہو تو پشیمان ہیں ہم بھی

شمشیر بکف سر پھرے دشت کی فضا سے
حیران اگر تم ہو پریشان ہیں ہم بھی

ہندو ہیں اگر آپ مسلمان کی نظر میں
ہندو میں نگاہوں میں مسلمان ہیں ہم بھی

آنکھوں میں بسایا ہوا ہو خواب کوئی تم
سینے میں سجایا ہوا ارمان ہیں ہم بھی

دو چار ہی دن اور ہے دنیا کی کہانی
دو چار دن کے یہاں مہمان ہیں ہم بھی

بھولی ہوئی نایاب سے تم بھی ہو کوئی شے
کھویا ہوا اک قیمتی سامان ہیں ہم بھی

بے چین ہمارے لیے رہتے ہو اگر تم
بے تاب تمہارے لیے ہر آن ہیں ہم بھی

پیچیدگیوں رشتوں میں ہمارے نہیں کوئی
تم جتنے ہو سہل اُتنے ہی آسان ہیں ہم بھی

اُمیدیں کئی دل میں تمہارے ہیں فروزاں
آنکھوں میں لیے سینکڑوں امکان ہیں ہم بھی

ہم تشنہ لبی اپنی مٹانے چلے آئے
اے شہرِ کراچی تیرے مہمان ہیں ہم بھی

تاریخِ ادب جس کو صدا یاد کرے گا
اے شہرِ ادب وہ تیری پہچان ہیں ہم بھی

ساغرؔ ذرا افسانۂ دل کھل کے سناؤ
نادان اگر تم ہو تو نادان ہیں ہم بھی

ساغرؔ تیری چاہت میں چلے آئے کہاں سے
اے شہرِ کراچی بڑے آسان ہیں ہم بھی

○

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

کوئی آباد گھر سنسان کیوں ہے
گلستاں اس طرح ویران کیوں ہے

شکست و ریخت ہے کوئی نہ شورش
بہت خاموش اب طوفان کیوں ہے

جو اک مدت سے مجھ کو جانتا تھا
سمجھتا مجھ کو اب انجان کیوں ہے

اسی نے کی مٹانے کی بھی کوشش
مٹا کے مجھ کو پھر حیران کیوں ہے

ترقی ہر طرف ہے زندگی میں
بہت پیچھے مگر انسان کیوں ہے

کسی کو زندگی دینا ہے مشکل
تو لینا جان پھر آسان کیوں ہے

جب اس کا کچھ نہیں میں نے بگاڑا
تو پھر دشمن مرا شیطان کیوں ہے

عجب انداز کے بنتے ہیں گھر اب
حویلی سے بڑا دالان کیوں ہے

نہیں رہتے ہیں جب کوٹھی میں صاحب
مسلح پھر کوئی دربان کیوں ہے

وہ تیغ کند لے کر ہے مقابل
مرا قاتل ہے اور نادان کیوں ہے

مناظرؔ کو بھی خود حیرت ہے اس پر
کہ دشمن اس کے گھر مہمان کیوں ہے

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۱۱

کچھ کہنے سے پہلے ان کی بات سننا چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہم سے کس قسم کی کاروباری بات کرنا چاہتے ہیں، باپو نے پوچھا۔ وکرم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، آپ کو شاید نہیں معلوم کہ ہمارے شراب کشید کرنے کے کئی کارخانے ہیں۔ ہم لوگ پچھلی تین پشتوں سے اس کاروبار سے وابستہ ہیں۔ ہماری بنائی ہوئی شراب دنیا کے ہر کونے میں جاتی ہے اور پسند کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے دنیا کے ہر کونے کی شراب چکھی ہے۔ لیکن کل آپ کے ہاں سے پینے والی دیسی شراب نے دوسری تمام شرابوں کے ذائقے کو مات کر دیا۔ میں آپ کو کل ہی بتا دیتا لیکن مسٹر سمتھ کی موجودگی میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے آپ کے ہاں شراب پینے کے بعد وہ بھی آپ سے شراب کا نسخہ بٹورنے آئے گا۔ یہ گورے لوگ بڑے چاپلوس ہوتے ہیں اور آپ سادہ لوح لوگ ہیں۔ آپ اسے اپنا نسخہ بتا دیں گے اور یہ مغرب میں ہماری دیسی شراب بنا کر اس کو ولایتی سا نام دے کر رقم کمائے گا۔

کل آپ کے یہاں سے نکل کر ہمیں کلکتہ جانا تھا لیکن ہم نے صرف آپ سے دوبارہ ملنے کے لیے اپنا واپسی کا سفر ایک دن کے لیے ملتوی کر دیا۔ کل سے لانی اور میں سوچ رہے ہیں کہ ہم آپ کے حقوق کو ان گورے لوگوں سے محفوظ کر کے اپنے دیس کی چیز اپنے دیس میں رکھیں۔ مسلسل سوچتے سوچتے ہم اتفاقِ رائے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سب سے پہلے ہم اپنے ماہرین کی مدد سے آپ کی بنائی ہوئی شراب کا نسخہ بنوائیں گے۔ پھر اپنے وکیل کی مدد سے اس نسخے کو دنیا کے ہر ملک سے آپ کے نام پر تمام حقوق محفوظ کرائیں گے اور پھر آپ ہماری کمپنی کو یہ شراب کشید کی اجازت پچاس فیصد منافع کے عوض دیں۔ یعنی اس شراب کی فروخت سے جتنا منافع ہوگا اس کا پچاس فی صد آپ کا اور پچاس فی صد ہماری کمپنی کا ہوگا۔ ہم نے اس شراب کا نام بھی سوچا ہے۔ ہماری ملاقات چونکہ ہمارے بچوں کی وجہ سے ہوئی ہے اس لیے اس شراب کا نام دونوں بچوں کے ناموں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ رامو کے پہلے دو حروف اور نیتو کے پہلے دو حروف لے کر ہم نے اس شراب کا نام رانی تجویز کیا ہے۔

باپو نے کہا، وکرم بابو، ہم سادہ سے لوگ ان جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔ میں آپ کو اس شراب کا نسخہ ابھی بتائے دیتا ہوں۔ آپ اس سے جو کچھ کرنا چاہیں میری بلا سے کریں۔ وکرم جوش سے بیوی کی جانب دیکھ کر بولا، دیکھا ہنی میں ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ اگر وہ گورا مسٹر سمتھ ہم سے پہلے ان کے پاس آتا تو یہ اُسے بالکل یہی کہتے جو مجھے کہہ رہے ہیں۔ اسے یہ نسخہ مفت میں مل جاتا جسے وہ لنڈن میں لاکھوں پاؤنڈ میں بیچتا۔ پھر وہ باپو سے مخاطب ہو کر بولا، آپ کو کسی بھی جھمیلے میں نہیں پڑنا پڑے گا۔ میرے ماہرین اور میرے وکیل یہ سب کچھ کریں گے۔ وکرم بابو، میں نے تو اپنی گزار دی ہے اب اور کتنی رہ گئی ہے کہ اس چکر میں پڑوں؟ باپو کی بات پر وکرم نے جواب دیا، آپ صرف اپنے بارے میں کیوں سوچ رہے ہیں شمان جی۔ آپ اپنے رامو کے بارے میں سوچیئے۔ آپ تو گزار چلے لیکن رامو اپنا جیون ابھی شروع کر رہا ہے۔ اس کاروبار سے ایک تو آپ کے بچے کا مستقبل سنور جائے گا اور دوسری بات یہ کہ آپ کو اپنی جیب سے ایک دھیلا بھی نہیں دینا پڑے گا۔ اس کام کی ساری ذمہ داری ہم اپنے سر لیتے ہیں۔ باپو کچھ دیر سوچ کر کہنے لگے، میں اپنے رامو کے لیے تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میرے رامو کا اس سے بھلا ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے آپ جیسے کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔

شکریہ شمان جی، اب آپ کو ہمارے ساتھ چند دنوں کے لیے کلکتہ چلنا ہوگا۔ وہاں پر میرے ماہرین پہلے آپ کی مدد سے شراب کا فارمولا تیار کریں گے۔ پھر ہمارا وکیل اس فارمولے پر ہندوستان میں آپ کے حقوق محفوظ کروائے گا۔ ہندوستان میں ہماری جان پہچان کے سبب یہ کام جلدی ہو جائے گا اور حقوق ہمیں دنوں میں مل جائیں گے۔ باقی ممالک سے حقوق ملنے میں وقت لگے گا جس کی ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں ہے کہ شراب کی پہلی کھیپ آنے میں چھ ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔ پہلی کھیپ آنے تک ہمیں دوسرے ممالک سے حقوق بھی مل جائیں گے۔ اگر یہ کاروبار میرے رامو نے سنبھالنا ہے تو اس شراب کے نسخے کے حقوق میرے بجائے میرے رامو کے نام سے لیں تو زیادہ بہتر ہوگا، باپو بولے۔ آپ کا مشورہ مجھے بہت پسند آیا ہے شمان جی، وکرم جذباتی لہجے میں بولے۔ بس اب آپ ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔ اور ہاں! میں چاہتا ہوں کہ آپ کی شراب کے دونوں گھڑے ہم اپنے ساتھ کلکتہ لے جائیں۔ میں اپنے ماہرین کو اس کا ذائقہ بھی چکھانا چاہتا ہوں۔ باپو نے کہا، بالکل لے چلیں۔ وکرم گھڑے اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو میں نے انہیں روک کر کہا۔ آپ تکلیف نہ کریں، میں یہ گھڑے آپ کی گاڑی میں رکھتا ہوں۔ انہوں نے گاڑی کی چابی نیتو کو دیتے ہوئے کہا، تم جا کر رامو کے لیے گاڑی کھولو، جی اچھا پاپا، نیتو نے اپنے باپ سے گاڑی کی چابیاں لیتے ہوئے کہا۔

میں گھڑا اٹھائے نیتو کے پیچھے نیچے اترا۔ اس نے کالی لمبی گاڑی کی ڈکی (ڈگی) کھولی، میں نے اس میں پہلا گھڑا کچھ اس طرح رکھا کہ وہ گاڑی چلنے کے دوران جھٹکوں سے ٹوٹنے اور چھلکنے نہ پائے۔ نیتو وہیں کھڑی رہی جبکہ میں دوسرا گھڑا اٹھا لایا اور اسے بھی بڑی احتیاط سے گاڑی کی ڈکی میں رکھا۔ اس عرصے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ اوپر آئے تو باپو لنگوٹ پر کرتا پہن کر تیار تھے۔ میں نے ایک سوٹ کیس میں اپنے اور باپو کے لیے کچھ

کپڑے رکھے اس کے ساتھ باقی ضروریات کی چیزیں رکھیں اور سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بولا، چلیں ہم تیار ہیں۔ آپ یہاں تالا والا نہیں لگائیں گے؟ لانی حیرت سے بولی۔ باپو نے جواب دیا، نہیں بیٹی پہلے تو سانپوں کے اس مسکن پر کوئی آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر کوئی آ بھی گیا تو یہاں سے اسے سانپوں کے زہر اور چند منکوں کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آئے گا۔

نیچے اتر کر وکرم نے ہم تینوں سے کہا، سفر کے دوران میں شان جی کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ لانی بولی تم باتیں کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہو کہ تم گاڑی چلا رہے ہو، اس لیے تم یا تو شان جی سے باتیں کرو اور یا پھر گاڑی چلاؤ۔ وکرم کا جواب سننے سے پہلے میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں گاڑی چلا لیتا ہوں اور آپ باتیں کریں۔ تب تو مسئلہ حل ہو گیا، وکرم جو شیلے انداز میں بولے۔ میں شان جی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھوں گا تم تینوں اگلی نشست پر بیٹھنا۔ لانی میرے ساتھ بیٹھیں اور نیتو اگلی سیٹ پر کھڑکی کے پاس۔ میرے گاڑی چلانے کی خبر اگرچہ باپو کے لیے بھی نئی تھی اس کے باوجود انہوں نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ سب کے بیٹھنے کے بعد میں نے گاڑی کو کچے روڈ پر چلانا شروع کیا تو وکرم بولا، لگتا ہے تمہیں گاڑی چلانے پر خاصا عبور حاصل ہے۔ تم گاڑی کب سے چلا رہے ہو؟ جی ایک سال سے، میں نے جواب دیا۔ کیا تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟ وکرم نے پوچھا۔ جی نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ اچھا کلکتہ جا کر تمہارا لائسنس بھی بنوا دیتے ہیں۔ تم بس مجھے اپنے دو فوٹو اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اپنا نام لکھ کر دینا۔ کلکتہ میں ٹریفک پولیس کا موجودہ ایس پی میرا دوست ہے۔ اس لیے تمہارا لائسنس بنوانے میں کسی قسم کی دیر نہیں لگے گی۔

سفر کے دوران مجھے نیتو کے گھر والوں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وکرم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اپنے پتا کے سورگباش ہونے کے بعد اس نے چھوٹی عمر میں ہی اتنے بڑے کاروبار کی باگ دوڑ سنبھالی تھی۔ لانی بڑی سلجھی ہوئی خاتون تھیں جس نے چین میں ہندی زبان سیکھی تھی اس لیے وہ چین کی حکومت کی طرف سے ہندوستان میں چین کے کاروباری فروغ کی اتاشی مقرر ہو کر آئی تھی۔ وکرم نے اپنے کاربار کو چین میں فروغ دینے کے سلسلے میں لانی سے پہلی بار ایک کاروباری ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد دونوں کی ملاقاتیں ذاتی نوعیت کی ہونا شروع ہو گئیں۔ جو بڑھتے بڑھتے محبت اور پھر شادی کے بندھن میں داخل ہو گئیں۔ شادی کے بعد لانی نے نوکری چھوڑ کر وکرم کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ سے پچھلے بیس سال سے وکرم کا کاروبار پہلے سے کئی گنا پھیل گیا تھا۔ یہ لانی ہی تھی جس نے اس کاروبار کو ہندوستان سے نکال کر دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا دیا تھا۔ وکرم نے اپنی زندگی کی باگ ڈور تقریباً تقریباً اپنی بیوی کے سپرد کر رکھی تھی۔ لانی کبھی اس کی سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی تھی تو کبھی اس کے بزنس پارٹنر کے۔ وہ روزانہ کارخانوں میں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ کام کرتی تھی۔ شوہر کے ساتھ دنیا کے ممالک میں کاروبار کو فروغ دینے کے لیے سفر کرتی اور گھر میں ماں کے فرائض بھی بخوبی نبھاتی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی بیٹی نیتو تھی جو ہندی، چینی اور انگریزی زبان کسی اہلِ زبان کی طرح پڑھتی، بولتی اور لکھتی تھی۔

کلکتہ جاتے جاتے ہم نے ایک دوسرے سے کافی شناسائی پیدا کر لی۔ لانی نے مجھے اپنے شوق بتائے۔ چین کے متعلق بتایا۔ اپنے والدین اور اپنے ایک بھائی کے بارے میں بتایا۔ باتوں کے دوران لانی نے اچانک میری اور نیتو کی جانب دیکھ کر سوال کیا، تم دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟ کل بھی اور آج بھی میں نے تمہیں آپس میں بولتے نہیں دیکھا۔ نیتو اور میری آنکھیں لانی کے اس سوال پر پہلی بار چار ہوئیں۔ میں نے نیتو کی جانب دیکھ کر بات بناتے ہوئے جواب دیا، آپ کا تعلق بھی مشرق سے ہے اور آپ جانتی ہونگی کہ ہمارے معاشرے میں بزرگوں کی موجودگی میں بچوں کا آپس میں باتیں کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بچے اس وقت تک نہیں بولتے جب تک ان سے بات نہ کی جائے۔ کل سے آپ بزرگ ہی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم نے اب تک آپ کے سوالوں کے جواب ہی دئے ہیں۔ اور جہاں تک آپس میں باتیں کرنے کا تعلق ہے تو ہماری آپس کی باتیں، آپ کی باتوں میں مخل ہوں گی اس لیے ہمارا نہ بولنا ہی بہتر ہے۔ میرے جواب پر نیتو کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ہاں یہ بات تو ہے۔ ہم اپنے والدین اور بزرگوں کی موجودگی میں چوں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر میری نیتو بہت بولتی ہے۔ شاید تمہاری دوستی نے اسے بزرگوں کا احترام کرنا سکھا دیا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری نیتو بڑی مغرور اور خودسر ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ایک دوست کی حیثیت سے نیتو کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے بہت ہی سنبھل کر دینا تھا اس لیے میں نے کہا، ناتجربہ کار ہونے کے ناتے ہم میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ کچھ لوگوں کا زیادہ دھیان خامیوں پر جاتا ہے اور کچھ خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اور نیتو جی اس عمر میں اچھائیوں سے پُر ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ ہم میں کئی کمزوریاں ہیں جو وقت، تجربے اور عمر کے ساتھ ساتھ کم ہو جائیں گی۔ بہت سی کمزوریوں کے باوجود میں نے نیتو جی کو ایک اچھا انسان پایا ہے۔

اس بار میرے جواب سے نیتو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ لانی بولی، مجھے تم سے باتیں کر کے حیرت اور خوشی ہو رہی ہے۔ تمہیں بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تمہارے اندازِ گفتگو سے نہیں لگتا کہ تم سترہ اٹھارہ سال کے ناپختہ ذہن کے لڑکے ہو۔ اس عمر کے بچے عموماً چھچھوری باتیں کرتے ہیں جبکہ تمہاری گفتگو ٹھوس ہے۔ کچھ لوگوں کو زمانہ جلد سکھاتا ہے اور کچھ دیر سے سیکھتے ہیں، میں نے جواب دیا۔ لانی بولی، زمانہ سکھائے یا نہ

سکھائے کچھ لوگ سیکھنے کا سرے سے شعور ہی نہیں رکھتے۔ اور کچھ لوگ نہ عمر کے تجربوں میں سیکھتے ہیں اور نہ ہی زمانے کے سکھانے پر سیکھتے ہیں۔ ایسے میں ہم کلکتہ کے نواح میں داخل ہوئے تو پیچھے سے وکرم کی آواز آئی، اس سڑک پر ہمارے داہنی جانب زمین میں جتنا گنا اُگا ہے یہ سب ہمارے کھانڈ کے کارخانے میں جائے گا۔ یہ زمین تو نواب ادریس خان کی ہے، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ہاں بالکل تم نے ٹھیک کہا ہے۔ کیا تم اُنہیں جانتے ہو؟ لانی نے پوچھا۔ جی ہاں، میں نے مختصر سا جواب دیا۔ لانی کہنے لگی، ان کے ہمارے خاندان سے قریبی مراسم ہیں۔ وہ نیتو کی سب سے پیاری سہیلی مونا کے خالو ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں لانی کو کوئی جواب دیتا، نیتو پہلی بار ہماری گفتگو میں شامل ہو کر بولی، مونا کے ایک بھائی کی منگنی بھی ان کے گھر ہوئی ہے۔ انک کی منگیتر کا نام سارہ تو نہیں؟ میں نے نیتو سے سوال کیا۔ آپ سارہ کو کیسے جانتے ہو؟ نیتو نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ پر سوال جھاڑ دیا۔ وہ میری منہ بولی بہن ہیں، میں نے جواب دیا۔ بھئی واہ، ہمارے تو آپ لوگوں سے خاندانی مراسم نکل آئے۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے وکرم کی آواز آئی۔

کلکتہ قریب آیا تو لانی اور وکرم مجھے اپنے گھر کا راستہ بتانے لگے۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی کلکتہ کے نواح میں کھانڈ اور شراب کے کارخانے کے پیچھے تھی۔ سورج ڈوبنے کے وقت ہماری کار کارخانے میں داخل ہوئی۔ گاڑی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی تو کئی نوکر ہماری جانب لپکے۔ گاڑی روک کر میں نیچے اترا تو وکرم نے کہا، بھئی تم اپنے ڈرائیونگ کے امتحان میں پورے اترے ہو، اور اتنی دیر گاڑی چلانے کا شکریہ۔ اور ہاں میں نے ایک لمحے بھی محسوس نہیں کیا کہ تم نے گاڑی چلاتے ہوئے کوئی غلطی کی ہو۔ رامو آپ سے زیادہ محتاط ڈرائیور ہے، لانی نے اوپر سے گرہ لگائی۔ یہ لو، تمہیں اور کیا چاہیے۔ ہماری ڈرائیورنگ میں کیڑے نکالنے والی بیگم نے بھی تمہیں گاڑی چلانے کی سند دے دی؟ وکرم مسکراتے ہوئے بولا۔ کل تم ڈرائیور کے ساتھ جا کر اپنی تصویر کھنچوا کر میرے حوالے کر دینا اور تمہارا پکا لائسنس بن جائے گا۔ ایسے میں نوکروں نے ہمیں گھیر لیا۔ وکرم نے ایک نوکر سے کہا، لال جی، مہمانوں کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔ پھر ہمیں مخاطب ہو کر کہا، آپ جا کر تازہ دم ہو لیں۔ ڈنر پر ملاقات ہوگی۔ لال کو سب لوگ لال اس لیے کہتے تھے کہ وہ اپنے سر کے سفید بالوں کو مہندی لگا کر سرخ کیے رہتا تھا۔ ہم دونوں لال کی معیت میں ایک جانب چلے تو دوسرا ملازم ہمارا سامان لے کر ہمارے پیچھے ہو لیا۔ ہمیں جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اس میں دو بستر تھے اور کمرہ بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ پیچھے سامان لانے والے نے ہمارا سامان کمرے میں لا کر ایک جانب رکھ دیا۔ لال نے واپس جاتے ہوئے کہا، سرکار، آپ تازہ دم ہو لیں میں آپ کو رات کے کھانے پر بلانے آؤں گا۔

اُن کے جاتے ہی باپو بولے، رامو بیٹے تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ تم موٹر چلانا بھی جانتے ہو۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا باپو، میں نے جواب دیا۔ ویسے تم موٹر چلاتے ہوئے بڑے بچ رہے تھے، باپو تعریفی لہجے میں بولے۔ آپ غسل خانے میں جا کر نہا کر ذرا تازہ دم ہو لیں باپو، میں نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ تازہ دم ہی ہوں رے۔ میں کون سا بھاگتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ راستے کی مٹی نے تو برا حال کر دیا ہے باپو، آپ نہا لیں تو یہ مٹی ڈھل جائے گی۔ میں نے کہا۔ اچھا تم کہتے ہو تو نہا لیتا ہوں۔ میں نے غسل خانے کے اندر جا کر باپو کو اس کا طریقہ استعمال بتایا اور باہر آ گیا۔ مجھے ابھی تک ان تمام حالات پر سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور مجھے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ باپو کا کہنا تھا جو شے بن مانگے ملتی ہے اوپر سے آتی ہے۔ اور اوپر سے آنے والی چیز کو دھتکارنا کفرانِ نعمت ہے۔ میں آنکھیں بند کیے ایک بستر پر لیٹ کر یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ باپو نہا کر نکلے تو میں بھی نہانے چلا گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو دیکھا کہ باپو اپنا میلا کرتا اور لنگوٹ دوبارہ پہنے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ایک دُھلا ہوا کرتا اور لنگوٹ اپنے سوٹ کیس سے نکال کر دیا اور خود بھی کرتا پاجامہ پہنا۔ باپو بولے، تم میرے کپڑے بھی اٹھا لائے تھے؟ تو اور کیا باپو، ہم یہاں چند دن رہیں گے۔ اس لیے ہمیں کپڑوں کے ایک سے زیادہ جوڑوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہی سوچ کر میں اپنے اور آپ کے کئی جوڑے لایا ہوں۔ باپو تعریفی انداز میں کہنے لگے اب تم بھی سیانی سوچ رکھنے لگے ہو۔

ہماری باتوں کے دوران لال نے ہمیں کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ ہم لال کی اردلی میں کھانے کے کمرے میں پہنچے جہاں اہلِ خانہ پہلے ہی موجود تھے۔ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ نیتو اور میرے درمیان کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد وکرم نے اٹھتے ہوئے کہا، آپ آج کی رات آرام کریں کل سے ہم اپنا کام شروع کریں گے۔ لانی اور میں ایک کاروباری میٹنگ کے سلسلے میں ابھی کہیں جا رہے ہیں اس لیے رات کو دیر سے واپس آئیں گے۔ آپ کی سیوا کے لیے یہاں نوکر موجود ہیں اور نیتو بھی یہاں ہے۔ اچھا کل ملاقات ہوگی یہ کہتے ہوئے دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس جانے کے لیے کرسی سے ابھی اٹھا ہی تھا کہ نیتو کی ملتجی آواز آئی، اگر آپ سفر سے زیادہ تھکے ہوئے نہیں ہیں تو میں آپ کو اپنے گھر کا باغیچہ دکھا لاؤں، پلیز۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اس لیے میں نے باپو سے کہا، آپ لال کے ساتھ کمرے میں جائیں میں ابھی آتا ہوں۔ باپو اور لال کو بھجوا کر میں نے نیتو سے کہا، غسل نے سفر کی تھکاوٹ دور کر دی ہے اور پھر مجھے کھلی آب و ہوا بھی اچھی لگتی ہے۔ چلیں آپ کے باغیچے میں کچھ دیر بیٹھ کر کھلی ہوا کھاتے ہیں۔ ایک ساتھ چلتے ہوئے ہم چند راہداریاں اور دروازے طے کرنے کے بعد ایک بڑے سے باغیچے میں داخل ہوئے۔ یہاں پھلوں کے درختوں سے بھرے ہوئے باغیچے کے درمیان ایک تالاب تھا جس کے اطراف کرسیاں بچھی تھیں۔ نیتو ایک کرسی پر بیٹھی تو میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

بیٹھتے ہی نیتو نے کہا، اس سے پہلے کہ میں آپ سے جھیل پر اپنی ناشائستگی کی معافی مانگوں میں آپ پر ایک بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں اپنے والدین کو آپ کے ہاں نہیں لائی تھی۔ اس کے برعکس جس قسم کا نازیبا سلوک میں نے آپ سے جھیل پر کیا تھا مجھے خطرہ تھا کہ آپ اس وجہ سے میرا غصہ میرے والدین پر نکالیں گے اور اسی ڈر سے میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ آپ سے ملیں۔ سانپ کی کاٹ کے حادثے کی اطلاع پر وہ مجھے دیکھنے اور چھٹیوں میں گھر واپس لے جانے کے لیے آئے تھے۔ جب انہیں کالج کے سٹاف سے معلوم ہوا کہ آپ نے مجھے موت کے کتنے قریب سے کھینچ کر زندگی کا تحفہ دیا ہے تو وہ آپ سے ملے اور آپ کا شکریہ ادا کئے بنا کلکتہ واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ میں نے آپ کا شکریہ ادا کر دیا ہے اور انہیں آپ سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ میری بات مان بھی لیتے اگر مس بوٹاک انہیں مسٹر سمتھ سے نہ ملواتیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مسٹر سمتھ بھی آپ سے متاثر ہیں۔ وہ آپ کا ذکر اتنے احترام سے کرتے ہیں جیسے عیسائی یسوع مسیح کا ذکر کرتے ہیں۔ ان سے آپ کا ذکر سن کر میرے والدین آپ سے ملنے کے اور مشتاق ہو گئے جبکہ میں خود کو ملامت کرتی رہی کہ آخر میں نے اتنے اچھے انسان سے اتنی بدتمیزی کیوں کی تھی۔

اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، انہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ آپ نے نہ صرف ان کے بھائی کو بلکہ کئی دوسرے لوگوں کو بھی زندگی کا تحفہ دیا ہے اور آپ اس وقت اپنے گھر جا چکے ہیں۔ چونکہ انہوں نے آپ کا گھر دیکھا ہوا تھا اس لیے وہ ہمیں آپ کے ہاں لائے تھے۔ والدین کی بے عزتی کے ڈر سے آپ کے ہاں آنے تک کا راستہ میں نے جس خوف سے کاٹا وہ میں جانتی ہوں یا میرا بھگوان۔ اس دوار اگر میرے والدین مجھے ایک لمحے کو بھی اکیلا چھوڑ دیتے تو میں آپ کے گھر آنے کی بجائے خودکشی کر لیتی۔ ایک بار تو پاپا اور ممی نے پوچھا بھی کہ میں اتنی زرد کیوں ہو رہی ہوں؟ وہ تو بھگوان کا شکر کہ میری بجائے مسٹر سمتھ نے جواب دیا اور مجھے جواب نہ دینا پڑا۔ مسٹر سمتھ کہنے لگے، شاید اس کے ذہن میں سانپ کی کاٹ کا خوف اور جسم پر زہر کا اثر ابھی باقی ہے۔

نیتو نے اپنی بات ختم کر کے میری جانب دیکھا جیسے وہ میرے ردِعمل کی منتظر ہو۔ میں نے پوچھا، اچھا اب جبکہ آپ کے والدین میرے گھر آ کر مجھ سے مل چکے ہیں تو آپ کا ڈر کسی قدر دُور ہوا یا نہیں؟ وہ تو اسی وقت دُور ہو گیا تھا جب آپ نہ صرف اُن سے احترام سے پیش آئے تھے بلکہ ان کے آگے میرا ذکر بھی بڑے اچھے انداز سے کیا تھا۔ جھیل پر آپ مجھے باؤلا کر کے گئے تھے۔ اس کے بعد میں آپ کے بارے میں جتنا زیادہ جانتی گئی آپ سے پہلے سے زیادہ متاثر ہوتی گئی۔ لیکن آپ کی اس ادا نے تو مجھے مار دیا اور میں اپنا دل ہار بیٹھی، اس نے شریر مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے کہا، ایک کا غصہ دوسرے پر احمق نکالا کرتے ہیں۔

جھیل والا واقعہ آپ کے اور میرے درمیان تھا، میرے اور آپ کے والدین کے درمیان نہیں تھا اس لیے ان کو اس میں خواہ مخواہ پٹکانا حماقت سے کم نہ ہوتا۔ میں کم از کم اس قدر احمق نہیں اور نہ ہی آپ کو احمق سمجھتا ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا، آپ کے خیال میں آپ کے والدین نے میرے گھر آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی؟ وہ اُٹھلا کر بولی، بالکل نہیں، بلکہ مجھے خوشی ہے کہ وہ آپ کے ہاں آئے تھے۔ اگر وہ میرا کہنا مان کر آپ کے ہاں نہ آتے تو آپ کے بارے میں کئی حقائق پردے میں رہتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ اس وقت میرے گھر، میرے اتنے قریب بیٹھ کر مجھ سے باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ جس وقت آپ نے ہمارے گھر آنے کی دعوت قبول کی تھی میں خوشی سے چیخنا چاہتی تھی لیکن ایسا نہیں کر سکی۔ میری عادت ہے کہ جب میں بہت خوش ہوتی ہوں تو ایک زوردار چیخ مارتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ میں نے بوکھلا کر کہا، بھگوان کے لیے خاموش ہو جائیں، آپ کے نوکر کیا سوچیں گے؟ اس نے ہنس کر جواب دیا میرے نوکر میری چیخوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

کیا آپ ابھی تک مجھ سے خفا ہیں؟ نیتو نے لجاجت سے پوچھا۔ جھیل پر مجھے آپ پر غصہ تو آیا تھا لیکن مجھے آپ سے خفا ہونے کا کوئی حق نہیں تھا، میں نے مونا جی سے بھی یہی کہا تھا۔ میرے جواب پر وہ کچھ زیادہ اُٹھلا کر بولی، تو جناب میرے بلاوے پر دوسرے روز جھیل پر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے تھے؟ اس روز میں آپ سے نہ صرف اپنے پہلے رویے کی واقعی معافی مانگنا چاہتی تھی اور اپنی جان بچانے پر آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی تھی۔ میں اس دن تیار نہیں تھا اس لیے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اور ہاں آپ ایسی حرکت ہی کیوں کرتی ہیں جس سے پچھتا کر آپ کو خواہ مخواہ کسی سے معافی مانگنا پڑے؟ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔ اوہ وہ۔۔۔ اس نے کچھ دیر ٹھہر کر جواب دیا، اس کی وجہ بھی آپ کو بتائے دیتی ہوں۔ اس کی سچی اور بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میرے حُسن، میری دولت اور لاڈ پیار نے مجھے بے حد مغرور بنا دیا ہے۔ کالج کے لڑکے میرے اردگرد ایسے منڈلاتے رہتے ہیں جیسے مکھیاں شہد کے گرد۔ میرا خیال تھا کہ میری جان بچانے کو بہانہ بنا کر آپ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح میرے حُسن سے اور میری امارت سے متاثر ہو کر میرے آس پاس منڈلانا شروع کر دیں گے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جب میرا حُسن اور میری دولت آپ کو متاثر نہیں کر سکے تو مجھے آپ پر غصہ آ گیا۔ اس لیے میں نے آپ کو جھیل پر بلا کر بے عزت کر کے بدلہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی صاف دلی سے اقرار کرتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ اب تک میں نے جن جن لڑکوں کو سب کے سامنے بے عزت کیا تھا وہ بھیگی بلی بنے میرے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جس نے مجھے اور زیادہ شیر بنا دیا ہے۔ لیکن آپ پہلے انسان ہیں جس نے میری اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر مجھے میرا مناسب مقام بتایا ہے۔ اور جب سے مجھے اپنا مقام ملا ہے، میں خوش ہوں کہ اس دنیا میں کوئی ایک انسان ایسا ہے جو مجھے آئینہ دکھانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور میں نے اسی وقت دل

میں فیصلہ کیا تھا کہ اگر اس دنیا میں کوئی انسان مجھے بات کرنے کی تمیز سکھا سکتا ہے تو وہ آپ ہیں اور میں آپ سے ہر حالت میں بات کرنے کی تمیز سیکھوں گی۔ کیا آپ مجھے بات کرنے کی تمیز سکھائیں گے؟

اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور میرا جواب سنے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، دوسری وجہ یہ ہے کہ میرے تجربے کے مطابق لوگ کسی کے کام آنے کے بعد جتاتے جتاتے نہیں تھکتے۔ مجھے خوف تھا کہ آپ بھی ویسا کر کے سارے کالج میں میرا جینا دوبھر کر دیں گے۔ لیکن آپ کے بارے میں میرا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ آپ میرے آگے پیچھے پھر پھر کر اور مجھے بار بار جتانے کی بجائے مجھ سے اجتناب برتتے رہے۔ آپ کی اس ادا نے تو مجھے آپ کا اور دیوانہ کر دیا۔ پھر میں نے مونا سے کہلوا کر آپ کو دوبارہ بلوا بھیجا تھا۔ جب آپ مونا کے بلاوے پر نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ اگر میں سب کے سامنے دوسروں کو بے عزت کر سکتی ہوں تو سب کے سامنے آپ سے معافی بھی مانگ سکتی ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے اگلا دن لائبریری اور اس کے آس پاس منڈلا کر اس آس پر گزارا کہ شاید آپ وہاں آ جائیں، اگر اس روز آپ مجھے نظر آتے میں آس پاس کے لوگوں کی پروا کیے بنا آپ سے معافی کی خواستگار ہوتی۔ لیکن آپ لائبریری نہیں آئے۔

پھر جب مسٹر سمتھ ہمیں آپ کے گھر سے ریسٹ ہاؤس چھوڑ گئے تو پاپا اور ممی نے آپ کے ہاں شراب کی تعریف کرنے کے بعد آپ کو اپنے کاروبار میں شرکت کا پروگرام بنایا۔ ان کو ڈر تھا کہ اگر وہ آپ تک پہلے نہ پہنچے تو مسٹر سمتھ آپ کو ٹھگ لیں گے۔ پاپا گوروں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ پہلے ہی ہمارے ملک کا سارا خزانہ لوٹ کر اپنے ملک لے جا چکے ہیں اور اب ہماری ایجادات کو اپنے نام کر کے پیسے بناتے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید آپ پاپا کی بات نہیں مانیں گے۔ اس کے باوجود میں خوش تھی کہ مجھے ایک بار پھر آپ کے ہاں جانے کا موقع ملے گا۔ شاید آپ سے اکیلے میں بات کر کے کم از کم ایک بار آپ سے کھلے دل سے معافی مانگنے کا موقع تو مل جائے گا۔

ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ میری گود میں رکھتے ہوئے کہا، میرے اس ہاتھ پر سانپ نے کاٹا تھا، اگر آپ میرا زخم دیکھنا چاہیں تو یہ ہاتھ حاضر ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر میں نے کاٹ کے مندمل ہوتے ہوئے زخم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہا، اب یہ زخم تو بھرتا نظر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک آپ کے دل کا زخم بھی بھر چکا ہوگا۔ اُس نے کھلکھلا کر جواب دیا، جی ہاں وہ تو میری چیخ نے آپ کو بتا دیا ہے۔ بلکہ میرے نوکروں کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی ہے۔

اچھا یہ بتائیں کہ آپ کو سانپ نے کیسے کاٹا تھا، میں نے پوچھا تو وہ بولی میں اور مونا ہر روز فرصت کے وقت جھیل کے کنارے ٹہلا کرتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ ٹہلتے وقت لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جھیل کے کنارے سے اٹھا کر جھیل کے پانی میں پھینکتی جاتی ہوں۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ جسے لکڑی کا ٹکڑا سمجھ کر اٹھایا تو وہ موا سانپ تھا۔ میرے ہاتھ پر ڈس کر ایک دم سے بھاگ گیا۔ مجھے ڈر تو لگا لیکن درد نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے زیادہ پروا نہیں کی۔ وہ تو مونا نے جا کر مس بوٹاک کو بتایا۔ جنہوں نے آپ کو بلا کر مشورہ لیا اور سب کچھ ہوا۔ تو پھر آپ کو مجھ سے زیادہ مونا کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیے۔ دراصل مونا نے یہ بات بروقت آگے بڑھا کر آپ کی جان بچائی ہے، میں نے صاف دلی سے اسے کہا۔ جی ہاں وہ تو میں نے کر دیا تھا اس لیے تو وہ میری سب سے پیاری سہیلی ہے اس نے جواب دیا۔

پھر میں نے نیتو کو آری سانپ کے بارے میں بتایا کہ یہ سانپ شیش ناگ سے اس لیے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ اس کی کاٹ درد بالکل نہیں کرتی جس کی وجہ سے لوگ اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھتے۔ جب اس سانپ کا زہر مریض کے جسم پر اثر کرنا شروع کرتا ہے تو اس وقت تک علاج کی دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان میں لوگ شیش ناگ کے زہر کی نسبت اس سانپ کے زہر سے زیادہ مرتے ہیں۔ نیتو کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا سر میرے کاندھوں پر۔ میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا، اچھا یہ بتائیں کہ ہمارا کل کا کیا پروگرام ہے؟ وہ بولی، پاپا نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو فوٹو کھنچوانے لے جانا ہے۔ اور ہاں میں نے بھی تو فوٹو کھنچوانا ہے اس نے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے کس لیے فوٹو کھنچوانا ہے؟ میں نے پوچھا۔ نیتو بولی میں نے اپنا پاسپورٹ رینیو کروانے کے لیے فوٹو کھنچوانا ہے۔ اور پھر اس کے بعد؟ میں نے سوال کیا۔ پھر اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہاں جانا ہے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ارے ہاں یاد آیا! آپ سانپوں کے شوقین ہیں اور کلکتہ کی پولو گراؤنڈ میں آج کل ناگ پنچھمی لگی ہے۔ اگر آپ کہیں تو آپ کو وہاں لے چلوں گی؟ میں اب سے پہلے کبھی ناگ پنچھمی دیکھنے نہیں گیا، میں نے کہا۔ اور میں بھی کبھی نہیں گئی، اس نے جواب دیا۔ اچھا تو پھر ہم کل فوٹو اتروانے کے بعد ناگ پنچھمی چلیں گے، میں نے کہا۔

ہم کافی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر نیتو میرے کندھے سے اپنا سر اُٹھاتے ہوئے بولی، یہاں خنکی بڑھ رہی ہے اب ہمیں اندر چلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں سونا چاہیے، میں نے کہا۔ ہاں اب دیر بھی خاصی ہو گئی ہے، وہ اٹھتے ہوئی بولی۔ چلیں میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے میرے کمرے تک آئے تو نیتو بولی، آپ سے باتیں کرنے کے بعد میرے من کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اس لیے میں کافی راتوں بعد آج رات گہری اور پُرسکون نیند سو سکوں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ کل تک کے لیے اجازت، کہتے ہوئے وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ میرے کمرے میں آیا تو بابو نہ جانے کب سے گہری نیند سو چکے

تھے۔ میں بھی کپڑے تبدیل کر کے اپنے بستر پر سو گیا۔

دوسری صبح باپو نے مجھے جگایا۔ ہم دونوں تیار ہو کر کمرے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ باپو نے پوچھا، لڑکی سے صلح ہو گئی رے؟ جی ہاں باپو۔ پھر میں نے انہیں نیتو سے رات والی باتیں بتائیں تو کہنے لگے، لڑکی کا خوف بھی بجا تھا۔ ہمارے ہاں کسی پر معمولی سا احسان کرنے کے بعد اسے زر خرید غلام سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں لال نے ہمیں ناشتے کی اطلاع دی۔ ہم دونوں اٹھ کر ناشتے کی میز پر پہنچے تو اہلِ خانہ کو وہاں موجود پایا۔ آج کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے نیتو کے زوردار قہقہے سن لیے تھے۔ آؤ بھئی آؤ، ہم آپ کے منتظر ہیں، وکرم نے کہا۔ ہم لوگ بیٹھے تو وکرم بولے، سانپ کے ڈسے جانے سے کل تک ہماری نیتو کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ آج صبح ہماری پرانی نیتو ہمیں واپس مل گئی ہے۔ لگتا ہے سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو گیا ہے، میں نے کہا۔ یا سپیرے کا اثر شروع ہوا ہے، لانی نے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا کر گرہ لگائی۔

واقعی آج والی نیتو پچھلے دنوں والی نیتو سے، بہت مختلف معلوم ہو رہی تھی۔ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ ماں اور باپ کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ اور تو اور، نوکروں تک کو چھیڑ رہی تھی۔ نیتو کی خوشی نے جیسے گھر کے سارے ماحول میں خوشی کی روح پھونک دی تھی۔ مجھے اس بات پر اطمینان ہوا کہ رات ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں تھیں اس کی وجہ سے نیتو کا ذہنی بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ وکرم نے نیتو سے کہا، بیٹے تم ڈرائیور کو ساتھ لے کر ڈرائیونگ لائسنس کے لیے رامو کی تصویر کھنچوانے لے جاؤ۔ میں نے بھی اپنا پاسپورٹ رینیو (Renew) کروانے کے لیے تصویر کھنچوانی ہے پاپا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تم اپنی تصویر بھی بنوا لینا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے، اچھا تم یوں کرو، اپنی تصویر کے ساتھ رامو کے پاسپورٹ کے لیے تصویر بھی بنوا لینا۔ میں تمہارے ساتھ اس کا پاسپورٹ بھی بنوانے بھجوا دوں گا۔ آج کل کے دور میں ڈرائیونگ لائسنس کی طرح پاسپورٹ کا بھی ہر وقت تیار ہونا ضروری ہے۔ اور پھر کاروباری سلسلے میں نہیں معلوم کب غیر ملک جانا پڑے۔ یہ تو بڑا اچھا خیال ہے، لانی بولی۔ پھر نیتو سے کہنے لگی، اچھا میں شمان جی کو لے کر کارخانے جا کر شراب کا فارمولا تیار کرواؤں گی۔ تصاویر بنوا کر تم کارخانے میں میرے دفتر آ جانا۔ فوٹو گرافر سے کہنا کہ تصاویر تیار ہونے پر دینا ناتھ کو بھجوا دے۔ دینا ناتھ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس کے اور پاسپورٹ کے فارم رکھے رہتے ہیں۔ دینا ناتھ کی مدد سے فارم پُر کرنے کے بعد دستخط کر کے اس کے پاس چھوڑ دینا۔ میں اسے تمہارے آنے سے پہلے تمام ہدایات دے دوں گی۔ اور ہاں تم اپنا پرانا پاسپورٹ بھی لانا مت بھولنا۔ جی ممی، اچھا تو اب ہم جائیں؟ نیتو نے پوچھا۔

اتنی جلدی، کیا تم نے ناشتا کر لیا ہے؟ وکرم نے نیتو سے پوچھا۔ آج اسے ناشتے کی ضرورت نہیں ہے، لانی نے کہا۔ وہ کیوں؟ وکرم بولا۔ رات اسے روحانی غذا ملی ہے، لانی نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ کیسے؟ وکرم نے پوچھا۔ یہ ہم عورتوں کے سمجھنے والی بات ہے، لانی نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اچھا اچھا تم لوگ جاؤ، وکرم لاپروائی سے بولا۔ ارے رامو کو تو ناشتا کرنے دو بیٹا، اس نے ابھی تک ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔ لانی مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ اوہ ساری ممی، نیتو بولی۔ جی میں ناشتا صرف ایک کپ چائے یا ایک کپ دودھ سے کرتا ہوں، میں نے اپنی پیالی سے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ لانی نے نیتو سے کہا، تم ابھی گھر پر ہی رہو۔ دس بجے سے پہلے کوئی دکان نہیں کھلی ہو گی۔ اچھا ٹھیک ہے ممی ہم کچھ دیر رُک کر باہر جائیں گے، نیتو نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

لانی، باپو اور وکرم کے جانے کے بعد نیتو میرا ہاتھ پکڑ کر بولی، چلیں کچھ دیر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، آج آپ بڑے شگفتہ موڈ میں ہیں۔ وہ بولی تو اور کیا۔ رات آپ سے باتیں کر کے اور صبح ممی سے باتیں کر کے میرے من کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا، ممی سے بات کر کے! کیا مطلب؟ کہنے لگی، میری ممی بڑی ذہین ہیں۔ وہ ممی ہونے کے ساتھ ساتھ میری اچھی سہیلی بھی ہیں۔ میرے موڈ میں ذرا سی تبدیلی دیکھ کر سمجھ جاتی ہیں کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ آج صبح سویرے وہ میرے کمرے میں آ کر پوچھنے لگیں کہ میں پچھلے دو دنوں سے کس وجہ سے پریشان ہوں۔ میں نے جب سانپ کے کاٹنے کے واقعے کے بعد کے تمام واقعات انہیں بتائے تو وہ بھی مجھ پر ناراض ہونے لگیں۔ لیکن جب میں نے انہیں ہماری رات والی گفتگو سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہو گئیں۔ میری باتیں سن کر وہ آپ سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ کہنے لگیں یہ لڑکا پچھلے جنم میں ضرور کوئی اوتار ہو گا۔ اوتار ہونا تو بہت دُور کی بات ہے انسان ہونا بھی مشکل ہے میں نے جواب دیا۔ دیکھا، ایسی بڑی باتیں کر کے آپ دوسروں کا دل موہ لیتے ہیں، اس نے تالاب کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا، نیتو جی، یہ بڑی باتیں نہیں ہیں یہ سچی باتیں ہیں۔ لوگ آج کل سچی باتیں کہاں کرتے ہیں، وہ بولی۔ رات آپ نے اپنے بارے میں سچی باتیں کیں تھی، میں نے اسے کہا۔ وہ تو میں کبھی کبھی کرتی ہوں، اس نے ہنس کر جواب دیا۔

اچھا ایک بات پوچھوں؟ اس نے کرسی پر بیٹھ کر کہا تو میں نے جواب دیا، جی پوچھئے۔ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟ نیتو نے مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے پوچھا تو میں نے جواب دیا، نیتو جی شکل وصورت سے آپ معصوم کشمیری حُسن اور چینی وقار کے سنگم کی ایک اعلیٰ مثال ہیں جو آپ کو لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں لڑکیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر نہ جانے روزانہ کتنی آنکھوں کو روشنی ملتی ہے۔ نہ جانے کتنے کان آپ کی آواز کا ساز سننے کو بے تاب رہتے ہیں اور نہ جانے کتنے دل آپ پر قربان ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں چاند ستاروں کو روشنی دیتی ہیں اور آپ کی مسکراہٹ بہار کے پھول کھلاتی ہے۔ آپ اپنی کمزوریاں جانتی ہیں اور آپ دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھاتیں۔ جہاں تک آپ کی سیرت کا تعلق ہے تو آپ میں وہ تمام

اصناف موجود ہیں جو کسی بھی اچھے انسان میں ہوتے ہیں۔

میں خاموش ہوا تو اس نے میری جانب دیکھ کر مناسب الفاظ تلاش کرتے ہوئے کہا، آپ۔۔۔آپ۔۔۔آپ نے اتنی خوبصورت باتیں کرنا کہاں سے سیکھا ہے؟ بھگوان کی سوگند، آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے کانوں کو گدگداتا ہوا، میرے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہوا میرے دماغ پر کسی بادل کی طرح قطرہ قطرہ برسا ہے۔ آج تک کسی نے مجھ سے میرا تعارف آپ جیسے جادوئی الفاظ میں نہیں کروایا۔ آپ کے یہ الفاظ میرے جیون کا سرمایہ ہیں۔ آپ کی شخصیت سے بڑا سرمایہ کوئی نہیں۔ یہ الفاظ تو اس کا ایک معمولی سا عکس ہیں، میں نے جواب دیا۔ آپ نے۔۔۔اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک قریب لانی کی آواز آئی، میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھے ہو۔ نیتو نے کہا، جی ممی آپ! آپ پاپا کے ساتھ نہیں گئیں؟ انہیں کارخانے چھوڑ کر آئی ہوں۔ تمہارے پاپا کو ایک میٹنگ میں جانا تھا لیکن وہ کچھ کاغذات گھر بھول گئے تھے۔ میں ان کے لیے کاغذات لینے آئی تو سوچا کچھ دیر کارخانے میں رکنے کی بجائے تمہارے پاس رک جاؤں۔ یہ کہتے ہوئے وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

پھر میری جانب دیکھ کر بولیں، میں نیتو کی ماں تو ہوں ہی اس کی سہیلی بھی ہوں اور ان دونوں حیثیتوں سے میں تمہاری بہت بہت شکر گزار ہوں۔ میں نے کہا، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر میں نے کچھ کیا بھی ہے تو میرے بھاگوں یہ قرعہ میرے نام نکلا ہے۔ تمہاری ماں نے تمہاری تربیت کتنی اچھی کی ہے۔ مجھے تمہارے ماں باپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی، لانی حیرت سے بولی۔ ماؤں والے بڑے بھاگ وان ہوتے ہیں مجھے اپنی حقیقی ماں کے بارے میں نہ کچھ علم ہے اور نہ کچھ یاد ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تمہیں ماں کا پیار نہیں ملا، لانی بولی۔ لیکن جس نے بھی تمہاری تربیت کی ہے اس نے بڑا کام کیا ہے۔ باپو نے اور کتابوں نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے، میں نے کہا۔ ہاں میری ایک منہ بولی ماں ہیں اور کالی ہیں جو میری ماں جیسی ہیں۔ یہ کالی کون ہے، یہ ایک شیش ناگن جس نے مجھے اب تک ماں کا پیار دیا ہے۔ شیش ناگن نے آپ کو ماں کا پیار دیا ہے؟ نیتو نے حیرت سے پوچھا۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔

لانی نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا، آج صبح میں اپنی نئی نیتو سے ملی ہوں۔ تم نے میری نیتو کو نئی زندگی ہی نہیں دی اسے زندہ رہنے کا نیا مقصد بھی دیا ہے۔ جس کے لیے تمہارا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میں نے جواب دیا، نہ میں نے اسے نئی زندگی دی ہے اور نہ ہی آج صبح آپ نئی نیتو سے ملی ہیں۔ میرے خیال میں آج صبح آپ اپنی اصلی نیتو سے ملی ہیں۔ جو زندگی اور زندہ لوگوں سے پیار کرتی ہے اور جس نے غرور کا نقلی خول اتار پھینکا ہے۔ دیکھا ممی، یہ کتنی پیاری باتیں کرتے ہیں؟ نیتو ماں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تو لانی نے جواب دیا۔ ہاں، اسے نہ صرف باتیں کرنے کا ڈھنگ آتا ہے بلکہ باتیں دل میں اتارنے کا فن بھی آتا ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ کانوں کے راستے دل تک اُترنے والی باتیں ہمیشہ خوبصورت ذہنوں کی اختراع ہوتی ہیں۔ پھر اس نے نیتو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، اچھا اب میں چلتی ہوں۔ مجھے تمہارے پاپا کو کاغذات دے کر میٹنگ میں بھیجنا ہے اور پھر شان جی کے ساتھ اپنے ماہرین کی موجودگی میں شراب کا نسخہ بھی تیار کروانا ہے۔ جانے سے پہلے لانی نے نیتو اور میرے ماتھے پر بوسہ دیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

لانی کے جانے کے بعد نیتو اٹھتے ہوئے بولی، میں جا کر فوٹو کھنچوانے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ آپ بھی تیار ہو جائیں۔ میں نے کہا، جی ہاں۔ اس وقت مجھے جینا کا دیا ہوا وہ سبق یاد آ رہا تھا جو اس نے مجھے اپنے جیون کی سب سے پہلی تصویر کھنچواتے ہوئے دیا تھا۔ نیتو مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی۔ میں سوٹ پہن کر نیتو کے انتظار میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ کمرے میں آئی تو میں کھڑا ہو گیا، نیتو نے بند گلے کی نیلے پھولوں والی سفید قمیض پہنی تھی۔ اس سے ملتا ہوا سفید پھولوں والا نیلا دوپٹہ اور سفید پاجامہ پہنا تھا اور اس نے اپنے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ آپ اس لباس میں اچھی لگ رہی ہیں، میں نے کہا۔ شکریہ اور آپ بھی سوٹ میں خاصے جچ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ہم کوٹھی کے برآمدے میں نکلے تو ڈرائیور نے ہمارے لیے گاری کا پچھلا دروازہ کھولا۔ پہلے ہم نے فوٹو گرافر کے ہاں جا کر تصاویر اتروائیں۔ اس نے تین دن بعد تصاویر دینے کا وعدہ کیا۔ نیتو نے کہا، آپ یہ تصاویر دینا ناتھ جی کو ہمارے کارخانے بھجوا دیں۔ فوٹو گرافر نے کہا آپ فکر نہ کریں بی بی جی، تصاویر بنتے ہی ہم آپ کے کارخانے بھجوا دیں گے۔ وہاں سے نکل کر ہم لوگ گاڑی میں بیٹھے تو نیتو نے ڈرائیور کو پولوگراؤنڈ جانے کو کہا۔ وہ بولا وہاں تو ان دنوں ناگ پنچھمی لگی ہے بی بی جی۔ ہاں ہم وہی دیکھنے جا رہے ہیں وہ بولی۔ ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے نیتو سے کہا میرا خیال ہے کہ مجھے سوٹ پہن کر ناگ پنچھمی میں نہیں جانا چاہیے۔ نیتو کی بجائے ڈرائیور بولا، صاب آپ کیا کہتے ہیں وہاں تو بڑی بڑی ہستیاں، پردھان منتری، سنت اور پجاری آتے ہیں۔ آپ کو بالکل محسوس نہیں ہوگا کہ آپ کا لباس دوسروں کی نسبت زیادہ قیمتی ہے۔

پولوگراؤنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی پجاریوں کا رش اس بات کی دلیل تھا کہ پجاری دُور دُور سے جوق در جوق یہاں ناگ دیوتا کی ایک جھلک دیکھنے کو آتے ہیں۔ ان کے اعتقاد کے مطابق ناگ دیوتا کی روح پنچھمی کے میلے میں کسی بھی شیش ناگ کے روپ میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہر شیش ناگ کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور ناگ کے چرنوں میں رکھے ہوئے کشکول میں سپیرے کو کچھ دان کرتے ہیں۔ اس پنچھمی میں کئی شمان، سپیرے، جوگی، منتری، اوتار اور پجاری منا سا دیوی کے درشن کو بھی آتے ہیں۔ ناگنوں کے آگے پھول نچھاور کرتے اور مناسہ کے درشن کی پرارتھنا کرنے کے بعد پھول اور روپے دان کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد کے مطابق مناسہ دیوی کسی بھی

شیش ناگ کے روپ میں موجود ہے۔ ہر تین سو سال بعد ناگ دیوتا اور مناسہ دیوی انسان کے روپ میں آ کر ایک دوسرے سے ملن کرتے ہیں۔ اس لیے ناگ پنچھمی کے دنوں میں شیش ناگ اور شیش ناگنیں زائرین کی توجہ کا مرکز ہوتی ہیں۔ نہ جانے کتنے جوگی، اوتار، شمان، سنت اور منتری، مناسہ دیوی کی صرف ایک جھلک کی خاطر اپنا پورا جیون تیاگ دیتے ہیں۔ ویسے آج تک کسی نے ناگ دیوتا اور مناسہ دیوی کا ملن نہ آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی کانوں سے سننے کا دعویٰ کیا ہے۔

سڑک پر رش کی وجہ سے ہم نے ڈرائیور کو پولوگراؤنڈ سے کافی پہلے گاڑی روکنے کو کہا۔ میں نے اپنا کوٹ اور ٹائی اتار کر گاڑی میں رکھے تو نیتو نے اپنا دوپٹہ بھی گاڑی میں چھوڑ دیا۔ ہم نے ڈرائیور سے ایک مقررہ مقام پر انتظار کرنے کو کہا اور آگے پیدل روانہ ہوئے۔ ڈرائیور کی بات درست تھی۔ ناگ پنچھمی کی جانب جانے والی بھیڑ میں ہر قماش کے لوگ اپنی اپنی مستی میں مست ناگ دیوتا اور مناسہ دیوی کی چرن چھونے کی دھن میں بے تابی سے بڑھ رہے تھے۔ ہم بھی لوگوں کے کندھوں، ہاتھوں اور قدموں کے دھکے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھیڑ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بڑھنے لگے۔ لوگوں کے اتنے ہجوم اور شور میں بات کرنا ناممکن تھا۔ اس کے باوجود میں نے نیتو سے کہا، میں اس بھیڑ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا اس لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے آپ میرا ہاتھ مت چھوڑیں۔ اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لے جا کر ہنستے ہوئے زور سے کہا، اب تو میں آپ کا ہاتھ مر کر بھی نہیں چھوڑوں گی۔ سڑک سے پولوگراؤنڈ میں داخل ہوئے تو رش میں کافی کمی آ گئی تھی۔ ابتدا میں آلو چھولے، سموسے، پکوڑے والے، پھل والے، پھولوں والے اور ناگ پنچھمی کی یادگاریں بیچنے والے اپنی اپنی ریڑیاں، چھابڑیاں اور خیمے سجائے پنچھمی میں داخل ہونے والے لوگوں کو بلا بلا کر اپنا اپنا کاروبار چمکانے میں مصروف تھے۔ کچھ آگے جا کر سپیرے اپنی اپنی پٹاریاں کھولے بین بجاتے ہوئے پجاریوں کو اپنے اپنے سانپوں کی جانب متوجہ کرنے میں مصروف تھے۔ کسی سپیرے کی پٹاری میں پھول تھے اور کسی کی پٹاری ابھی تک خالی تھی۔ پجاری اپنے اپنے مطلب کے سانپ کے پاس رکتے، کچھ پھول رکھتے، پھر سپیرے کو کچھ دان کرتے اس کے بعد ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتے اور چپ چاپ آگے بڑھ جاتے۔

ہم ایک بین بجاتے ہوئے سپیرے کے سامنے رُکے تو نیتو نے مجھ سے پوچھا، آپ بھی تو سپیرے ہیں۔ کیا آپ بین بجانا جانتے ہیں؟ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔ میں آپ کو بین بجاتے ہوئے سننا چاہتی ہوں، اس نے کہا۔ ابھی تو میرے پاس بین نہیں ہے، پھر کبھی سہی، میں نے جواب دیا۔ اس سپیرے سے مانگ کر میری خاطر کچھ دیر کو بجا کر دکھائیں پلیز۔ اس نے سپیرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا تو میں نے جواب دیا، اچھا کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر یہ سپیرا مجھے اپنی بین بجانے کی اجازت دیتا ہے تو میں آپ کے لیے چند لمحوں کے لیے بین بجائے دیتا ہوں۔ پھر میں نے سپیرے سے پوچھا، کیا میں تمہاری بین بجا سکتا ہوں؟ وہ بین بجانا بند کر مجھے اوپر سے نیچے غور سے دیکھتا ہوا بولا، بچہ لوگ تو جھن جھنے بجاتے ہیں۔ بین بچہ لوگوں کے بجانے کی چیز نہیں ہے۔ میں نے دس کا ایک نوٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا، یہ بین بجانے کا کرایہ ہے۔ بس کچھ دیر کے لیے بجانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اچھا ٹھیک ہے تم بھی اپنا شوق پورا کر لو بابو، اس نے دس کا نوٹ لے کر بین میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

سپیرے کے پاس ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ پتھر پر اتنی جگہ تھی کہ نیتو اور میں اس پر آسانی سے بیٹھ گئے۔ بین ہاتھوں میں لے کر میں نے نیتو کو مخاطب ہو کر کہا، بین اور میرا بچپن سے ایک روحانی تعلق ہے۔ کبھی کبھار بین بجاتے وقت مجھے وقت کا احساس بالکل نہیں رہتا۔ جب مجھے بس کروانا ہو، میرا کندھا اپنے ہاتھ سے دبا دینا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی آنکھیں موند کے بین بجانا شروع کی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا اور مجھے نہیں معلوم میں کب تک بین بجاتا رہا۔ اچانک مجھے ایسے لگا جیسے مجھ پر آسمانی بجلی گری ہو۔ بجلی کے اس جھٹکے سے بین میرے منہ سے نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی ماحول ایک عجیب سی سوندھی خوشبو میں بس گیا۔ آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ایک ناقابلِ یقین اور دیدنی منظر تھا۔

''ڈالی سکل''

ایک تحقیق کے دوران یہ بات علم میں آئی ہے کہ انسان کے آباو اجداد کا تعلق افریقہ سے نہیں بلکہ ایشیا سے تھا۔ 1978ء میں چین کے صوبے شانژی کے علاقے سے برآمد ہونے والی انسانی کھوپڑی کے DNA کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ انسانی کھوپڑی دو لاکھ ساٹھ ہزار سال پرانی ہے جسے Dali Skull کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کھوپڑی انسانی ارتقا کی نئی تاریخ رقم کر سکتی ہے۔ ماہرین کے مطابق دو لاکھ سال قبل انسانوں کے ایک گروپ نے ایشیا سے یورپ کو ملانے والے علاقے کی جانب ہجرت کی جہاں سے ان لوگوں میں ایشیائی خدوخال نمایاں ہوئے۔ ازاں بعد یہ لوگ افریقہ کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے ہوموسیپئر کا ارتقا عمل میں آیا۔ ان علاقوں سے برآمد ہونے والے فاسلز اور انسانوں کے DNA سے ثابت ہوتا ہے کہ آج کا انسان اس واحد گروپ کی نسل ہے جو ایک لاکھ بیس ہزار سال پہلے افریقہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گیا۔

☆

دل کے دریچوں کی مکیں

رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

آپ کو حق ہے ہم سے دریافت کریں کہ ہم نے ابتداء میں ہی مرزا غالب کا شعر درج کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ مگر ٹھہریے شعر کی بابت تفصیل میں جانے سے قبل یہ بتلانا ضروری ہے کہ ابتداء سے ہمارا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو ہزاروں خواہشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کا ایک اور شعر اُمڈ اُمڈ کر ذہن میں آ رہا ہے۔

''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے''

اور سچ تو یہ ہے کہ کئی بار دم نکلتے نکلتے بچا بھی ہے۔ اب میرے اور آپا جمیلہ شبنم کے رشتے کو ہی لے لیجیے۔ نہ جانے کب ان سے رابطہ ہوا اور کیسے دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری اپنی آپا ہو گئیں۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ آپا نے مجھے زیادہ چاہا ہے یا میں اُنہیں زیادہ پسند کرتی ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اُن کی چاہت میں شرابور ہوں۔

کچھ لوگ پہلی نظر، پہلی ملاقات، پہلے رابطے، پہلی گفتگو ہی سے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ یہ دل کی دنیا بھی عجیب ہے کبھی کبھی یہ دل کسی سے دو پل کی ملاقات، مختصر سی گفتگو کے بعد ایک انجان، اجنبی شخص سے خود بہ خود اٹوٹ رشتہ قائم کر لیتا ہے اور کبھی کبھی قریبی خون کے رشتے بھی اک عمر گزرنے کے باوجود اپنے نہیں ہوتے۔ ایسی ہی ایک انجانی اجنبی پھر بھی میری اپنی ہیں آپا جمیلہ شبنم۔ سراپا محبت، اُن کے ہر لفظ میں شفقت کی چاشنی ٹپکتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ ہی بتائیے ایسے رشتوں میں زمینی فاصلے، دُوریاں کیا معنی رکھتی ہیں؟

احمد فراز برمحل یاد آئے ہیں:

آنکھ سے دُور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اب بھلا بتائیے جو دل میں اُتر جائے انہیں آنکھوں کے سامنے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپا جیسی شخصیت کی مالک کے لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جو دل میں اُتر جائے وہ کہیں بھی رہیں، ملے یا نہ ملے، وہ دل سے نہیں اُترتے۔ آپا کو میں کبھی ملی نہیں، کبھی اُن کے روبرو نہیں ہوئی، پھر بھی ہر بار بات کرنے کے بعد وہ مجھے اور زیادہ اپنی اور قریب تر محسوس ہوئیں۔

آپا سے میرا تعارف ''چہارسُو'' کی معرفت ہوا۔ اُن کی تحریروں میں بکھرے مختلف رنگوں نے مجھے اُن کا دلدادہ بنا دیا۔ سنجیدہ مضامین لکھتی ہیں تو قارئین کے درد کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہیں طنز و مزاح لکھتی ہیں تو گہری بات بھی ہلکے پھلکے انداز میں اپنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ شاعری میں بھی طبع آزمائی کر لیتی ہیں۔ اُن کی طبیعت میں بسی ظرافت ہو نثر ہو شاعری ہو سب میں خوب نظر آتی ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ، فوجی کا محبت نامہ، بھتیجے کا نوحہ، حجاز کا سفر نامہ کس کس چیز کا ذکر کروں۔ جملے تراشتی ہیں کہ پڑھ کر سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ لاجواب، آفرین کہنے کو جی کرتا ہے۔

میری کہانیاں بھی اُن کے دل کو چھوتی ضرور ہوں گی جس کا ذکر اکثر چہارسو کے ''رس رابطے'' میں موجود ہوتا ہے۔ پھر میرا افسانوی مجموعہ جب اُن کے ہاتھوں میں پہنچا تو انہوں نے میرا دامن دعاؤں، خلوص اور شفقت سے بھر دیا۔ فون پر پہلی بار جب اُن کی دھیمے لہجے میں آواز سنی تو اُن دیکھا سراپا خیالوں میں اُبھر آیا۔ ایک ایک لفظ سے ٹپکتے محبت کے قطرے میرے دل میں گوہر بن کر جمع ہوتے گئے۔ ان کی باتوں میں اگر پیار کی شیرینی گھُلی تھی تو سرحد کی پابندیوں کا ملال بھی تھا۔ رفتہ رفتہ رابطے بڑھتے گئے اور جیسے جیسے وہ میرے قریب آتی گئیں اُن کی نکھری شخصیت اُبھر کر سامنے آتی گئی۔ آگ میں جل کر ہی سونا کُندن بنتا ہے۔ یہ کُندن جیسی زندگی کن مراحل سے گزری، یہ جاننے کی جستجو بھی بڑھتی گئی۔ جہاں چاہ وہاں راہ۔ کچھ ادبی دوستوں نے اس تشنگی کو کم کر دیا تو باقی کی کسر ایک پُرانے رسالے میں ان کے انٹرویو کی کاپی ہاتھ لگتے ہی پوری ہو گئی۔

صاحب اگر آپ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ بظاہر دکھنے والی شانت ندی کے اندر کتنے طوفان کتنے تلاطم چھپے ہیں، تو اُن کی زندگی کی کتاب کے کچھ پنّے پلٹ کر دیکھتے ہیں۔

راجہ سکندر خان اور بی بی زینت النساء کے گھر پھُل گراں میں ۱۹۳۲ء میں چھٹی اولاد نے جنم لیا تو اُس ننھی بچی کا نام جمیلہ شبنم رکھا۔ جمیلہ شبنم نے پانچویں جماعت تک گاؤں میں ہی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں پولیس افسر ریاض احمد سے شادی ہو گئی اور سال بعد ہی بیوی کے ساتھ ساتھ ایک بچی کی ماں بھی بن گئیں۔ ایک روز اُنہیں یہ جان کر بڑا صدمہ پہنچا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ ریاض احمد پہلے سے ہی شادی شدہ تھے اور اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اُن سے شادی کی تھی۔ انہیں شوہر کی یہ حرکت اتنی ناگوار گزری کہ وہ بچی کو گود میں لئے گھر چھوڑ آئیں۔ بڑی بہن کے ساتھ رہنے لگیں اور پھر سے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۹۵۸ء میں دسویں جماعت کے امتحان میں ٹاپ کیا۔ زندگی ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک بار پھر ریاض احمد کے والد سمجھا بجھا کر بچی کو والد کی سرپرستی اور شفقت کا واسطہ دے کر گھر واپس لے آئے۔ اولاد اور گھر پر یوار کی خاطر عورت صدیوں سے سمجھوتہ کرتی آئی ہے۔ اپنی انا کا گلا گھونٹتی آئی ہے۔ انہوں نے بھی یہ ہی کیا۔ ایک بار پھر اولاد کی خاطر اپنے اصول، اپنی غیرت طاق پر رکھ دوبارہ گرہستی شروع کی۔ گھر کی بغیہ لہلانے لگی۔ دو اور پھول آنگن میں کھِل

گئے۔ پہلے بیٹی اور پھر بیٹے نے انہیں پہلے سے زیادہ مصروف کر دیا۔ زندگی آرام سے بچوں کی پرورش اور گھر سنوارنے میں بسر ہو رہی تھی کہ تقدیر کی آندھی نے ایک بار پھر اُن کا نشیمن اجاڑ دیا۔ جہلم میں سیلاب آنے کی وجہ سے شوہر نے انہیں تینوں بچوں سمیت اُن کی ہم شیرہ کے پاس بھیج دیا۔ سیلاب آیا اور گزر گیا مگر جاتے جاتے اُن کی گھر گرہستی بہالے گیا۔ شوہر کی پہلی بیوی نے خط لکھ کر کہہ دیا کہ:

''اپنا سامان لے جاؤ۔ دوبارہ ادھر آنے کی ضرورت نہیں''

خط کا نشتر اتنا گہرا نہ تھا جتنا شوہر کی خاموشی۔ نہ وہ لینے آئے اور نہ وہ واپس گئیں۔ غیرت نے انہیں واپس جانے سے روک دیا۔

زندگی ایک تلخ حقیقت ہے جسے سب اپنے اپنے طریقے، اپنے حوصلے، اپنے زاویے سے بسر کرتے ہیں۔ معین حسن جذبی کا شعر یاد آ گیا:

یہی زندگی مصیبت یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

اب کی بار سوال تین تین زندگیوں کو سنبھالنے، سنوارنے، نکھارنے کا تھا۔ اس ذمہ داری نے نیا حوصلہ نیا عزم دیا۔ پھر انہوں نے کبھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نئے سرے سے زندگی کی شروعات کی۔ دونوں چھوٹے بچوں کو نانی کے پاس چھوڑا اور بڑی بیٹی کو اُس کی خالہ کے پاس چھوڑ خود لاہور میں مدرسہ البنات کے ہاسٹل میں رہ کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کے خاندان کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کے بچے بٹوارے سے قبل بھی کونوینٹ میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ڈگری ملتے ہی بطور اُستانی ملازم ہو گئیں۔ خودداری نے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا عزم دیا۔ پاؤں پر کھڑے ہونے کے ساتھ خود اعتمادی بھی اُن کی شخصیت کا اہم حصہ بن گئی۔

ماں کی قربانی اور محنت رنگ لائی۔ تینوں بچے تعلیم یافتہ، کامیاب اور مہذب زندگی گزار رہے ہیں۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں اور وہ بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

خودداری، خود اعتمادی، غیرت مندی کے ساتھ ساتھ ایک اور پہلو اُن کی شخصیت کا تب سامنے آیا جب ۲۰۰۲ء میں وہ کینسر جیسی نامراد بیماری میں مبتلا ہوئیں۔ طوفانوں سے کھیلنے کی عادت تو اُنہیں شروع سے ہی تھی۔ وہ ہمت نہیں ہاریں اور اس بیماری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کینسر کو شکست دے دی۔ ان کی (Will Power) کو دیکھتے ہوئے اس ہسپتال نے انہیں Good Will Ambassador منتخب کر لیا۔

مشرقی بودوباش کی خاتون ہونے کے باوجود آپا انتہائی روشن دل، روشن دماغ، روشن نظر، سلیقہ شعار، باوقار شخصیت کی مالک ہیں۔ ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھتی ہیں۔ بھید بھاؤ، اونچ نیچ اور تنگ نظری اُن کے پاس سے نہیں گزری۔ حسِ ظرافت تو آپ کو قدرت نے منوں، ٹنوں کے حساب سے دی ہے۔ مڈل یا میٹرک کے امتحان کے دوران آپا نے اردو کا پرچہ بنایا تو اُس میں لفظ ''بھاگنے'' کو جملے میں استعمال کرنا تھا۔ ایک لڑکی نے جملہ یوں بنایا ''فرزانہ اپنے ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی'' آپ نے لڑکی سے کہا بے شک تمہارا جملہ تکنیکی طور پر ٹھیک ہے مگر تمہاری سوچ بہت خراب ہے لہٰذا میں تمہیں صفر دوں گی۔ ایک دن باتوں باتوں میں ایک چیڑ قناتی ادیب کا ذکر کرتے ہوئے بڑی سادگی سے بولیں اس کے چہرے پر اتنی پھٹکار کیوں ہے۔ پھر ایک روز منیرہ شمیم نے بتایا کہ ایک دعوت سے واپسی پر جب منیرہ آپا کو چھوڑنے اُن کے گھر گئی تو آپا بولیں ''اب تم کیسے جاؤ گی'' منیرہ نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''جیسے آئی ہوں'' آپا نے ترکی بہ ترکی کہا ''نا بابا نا! جوان جہان لڑکی کو اکیلے بھیجنے کو من نہیں کرتا'' اُس روز سے ہم سب دوست منیرہ کو جوان جہان لڑکی کہہ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

آج کل کا دور دکھاوے اور ملمع سازی کا ہے مگر آپا کی سادگی دیکھئے باتوں باتوں میں بولیں میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ یہ سننا تھا میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو گئی۔ خود کو سمیٹتے ہوئے میں نے کہا ''وہ کیسے'' بولیں ''شوہر بھی پولیس والا بیٹا بھی پولیس والا۔ اگر کسی کے گھر میں خاکی وردی آ جائے اُس کا لب ولہجہ تو کیا گردن بھی اکڑ جاتی ہے یہاں ڈی ایس پی کی بیگم اور ڈپٹی کمشنر کی ماں ہونے پر سیاپا ڈالا جا رہا ہے۔''

ڈپٹی کمشنر صاحب بھی ایسے کہ ماں نے جب کہا کہ ''میں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے کبھی توڑ کر بیر نہ کھانا زمین پر گرے ہوں تو اُٹھا کر کھا لینا۔ فرمانبردار بیٹے نے سر نیچے کئے جواب میں کہا ''ماں جی آپ کی دہشت دل پہ ایسی بیٹھی کہ میں نے تو زمین پر گرے بیروں کی جانب بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔''

جب بھی کسی اہل قلم دوست یا عزیز کی غم یا خوشی کی اطلاع ملتی ہے خاموشی سے اپنے مخصوص ٹیکسی ڈرائیور کو فون کر کے بلاتی ہیں اور موقع کی مناسبت سے لد پھند کے منٹوں میں ہوا ہو جاتی ہیں۔ قریبی لوگوں کا کہنا ہے کہ جب فصل کے یا پنشن کے پیسے آتے ہیں تو خبر گیری کے بہانے جا کر پورا کا پورا بٹوا خالی کر آتی ہیں۔

ایک نصیحت ہم آپ کو ضرور کرنا چاہیں گے۔ کبھی بھول کر بھی آپا کو دعوت پر مدعو مت کیجیے گا جیسے ہی آپ اُنہیں نوطہ دیں گے وہ آنے والے دیگر دوستوں کے نام آپ سے ضرور دریافت کریں گی۔ فون رکھتے ہی ہر دوست کی پسند سامنے رکھتے ہوئے کھانے پکانا شروع کر دیں گی۔ دعوت والے دن آپ کے انواع واقسام کے کھانے میز پر سجے رہ جائیں گے اور آپا کسی کو کڑھی، کسی کو سرسوں کا ساگ، کسی کو ماش کی تڑکے والی دال تو کسی کو اپنے ہاتھ کی بنی مٹھائی پیش کر کے خوشی سے پھولے نہ سمائیں گی۔ اب آپ ہی بتلایئے جس شخص کو اس دنیا میں فرشتہ مل جائے اُسے انسانوں کی کیا ضرورت ہے۔

بڑھتی عمر (ڈھلتی نہیں کہوں گی) کے ساتھ آپا کا جسم چاہے ناتواں ہو گیا ہے مگر دل سے وہ ابھی بھی جوان ہیں۔ ہر عمر کے شخص کے ساتھ اُس کی ہم عمر بن جاتی ہیں۔ انہیں رشتے بنانے ہی نہیں رشتے نبھانے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ ایک بار جس نے رشتہ جوڑ لیا پھر تا عمر نبھاتی ہیں۔ نئے رشتے چاہے کتنے ہی بن

جائیں پُرانے مراسم بھولتی نہیں۔گاہے بگاہے فون پر حال چال دریافت کرتی رہتی ہیں۔اور صاحب میں تو دو ہم عمر خواتین کے بیچ وچولے کا کام بھی کر لیتی ہوں۔ اب پوچھئے وہ کیسے؟ تو یہ بھی بتادوں کہ میری ماں کی طرح آپا کی قوتِ سماعت بھی کمزور ہوگئی ہے لہٰذا دونوں آپس میں بات کرنے کے بجائے مجھے خدمت گزاری کا موقعہ دیتی ہیں۔ادھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر پہچانے کا فرض بخوبی نبھا لیتی ہوں۔انسان بھی کتنا لالچی ہے جب فون پر بات ہوجاتی ہے تو ملنے کی خواہش جاگ جاتی ہے۔مگر پھر وہی سرحدوں کی مجبوریاں لاچاریاں آڑے آجاتی ہیں۔ پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ انسانوں کی بنائی ہوئیں سرحدیں اتنی بے رحم اور جان لیوا ہوسکتی ہیں۔خود کو کبھی اتنا لاچار، بے بس اور مجبور بھی نہیں سمجھا تھا۔

ملک کے بٹوارے کے سبب اپنوں سے بچھڑ جانے کا کرب، وہ دہشت، وہ وحشت ،وہ ظلم کی داستاں، وہ سیاہ راتوں کی کہانیاں، وہ تاریک راہوں کا سفر، گمشدگی کا عالم ان سب سے جڑے سینکڑوں قصے بزرگوں کی زبانی سُنے تھے تو کچھ کتابوں میں پڑھے تھے جنہیں پڑھ کر آنکھیں کئی بار نم ہوئی تھیں۔ دل میں ٹیس اُٹھی تھی۔کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ خواہش کی کتنی کونپلیں دل میں پھوٹی تھیں کہ کاش کوئی معجزہ ہوجائے ٹوٹے رشتے پھر جُڑ جائیں، بٹے ہوئے دو گھر پھر ایک ہوجائیں۔یہ ''تیرے میرے'' کا کھیل تمام ہوجائے اور ''ہم'' کی بنیاد پڑ جائے۔بنا کسی روک ٹوک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آجاسکیں، اپنوں سے مل سکیں جو سرحدوں میں بٹ گئے ہیں۔کاش ایسا ہوسکتا کاش ایسا ہوجائے۔ میرے جیسے بہت سے لوگ ایسی خواہشیں دل میں پال لیتے ہیں مگر چہارسو ایک ایسا ادارہ ہے جو اس سوچ کو عملی جامہ پہناتا ہے۔چہارسو نے چاروں سمت اپنے پنکھ پھیلا کر حلقہ احباب کا ہالہ وسیع کر لیا ہے۔دنیا بھر کے ادیبوں کو جوڑنے، اُن میں محبت کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑی تیزی سے کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ چہارسو کے ذریعے ہی مجھے بشریٰ رحمٰن، عذرا اصغر، منیرہ شمیم، رومانہ رومی، طاہرہ اقبال، سیمیں کرن، سلمیٰ اعوان، ڈاکٹر فیروز عالم، گلزار جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد ،حنیف باوا، پروین شیر، آغا گل جیسی ادبی شخصیات سے دوستی کا موقع ملا۔اگر چہارسو سے نہ جُڑتی تو جمیلہ آپا کی شفقت اُن کی محبت سے محروم رہ جاتی۔

فاصلے چاہیں کتنے بھی ہوں دلوں میں دُوریاں نہیں ہونی چاہئیں۔ کبھی ملنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے، سب کی سلامتی کی ٹھنڈی ہوائیں آتی رہنی چاہیے۔دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اپنوں کو شاداب و آباد رکھے۔ میری جمیلہ آپا کو صحت یاب رکھے، اُن کی عمر دراز کرے اور وہ اسی طرح اپنی محبت اور شفقت کے پھول ہم پر برساتی رہیں (آمین)

صاحب آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ ہم مجبور تو ہوسکتے ہیں مایوس نہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔بقول فیض احمد فیض:

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

- بقیہ -

بالجبر

''تمہارے شوہر کا منہ کس طرف تھا۔۔۔؟''

''میری طرف۔۔۔''شوگن نے فوری جواب دیا وہ مسکرا رہا تھا۔

''تم نے اس کو فوری دبوچ لیا تھا نا۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے مجھے شوہر سمجھے اور خود بیوی کا رول ادا کرے۔۔۔''

''رابرٹ نے کیا جواب دیا۔۔۔''

''وہ بخوشی رضامند ہوگیا اور کہنے لگا۔۔۔''

''چلو۔۔۔ایک بار یہ بھی سہی۔۔۔''

اور میں اس جواب سے بہت خوش ہوا اور میں نے اس کو پیار کیا۔۔۔اور''

''تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم یہ بیان حلفیہ دے رہے ہو۔۔۔'' وکیل نے اس کو یاد دلایا۔

''ہاں۔۔۔یاد ہے''

''تم کو واپس اپنی جگہ جانے کی اجازت ہے۔۔۔''جج نے حکم دیا۔

شوگن مسکراتا ہوا اپنی جگہ واپس آ گیا۔

''ایک گھنٹے کا وقفہ کیا جاتا ہے۔۔۔''جج نے کہا

''وقفے کے بعد جیوری اپنا فیصلہ سنائیں گے۔۔۔''

اس نے چوبی ہتھوڑا بورڈ پر مارا اور واپس اپنے چیمبر میں میں چلا گیا۔جیوری کے نمائندے بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔

ایک گھنٹے بعد عدالت دوبارہ اسی طرح منعقد ہوئی، جج نے جیوری کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا تم لوگ فیصلے پر پہنچ گئے ہو۔۔۔؟''

''ہاں یور آنر۔۔۔''

''مسٹر فورمین۔۔۔تم فیصلہ سناؤ''

جیوری کا فورمین اٹھ کر کھڑا ہوا اور ایک ورق پر لکھا ہوا فیصلہ پڑھا۔

''فریقین میں سے دونوں حسب موقع ایک دوسرے کو خوش کرتے رہے ہیں، اس لیے بالجبر کا قانون نافذ نہیں ہوتا۔۔۔ مدعی رابرٹ اور مدعا علیہ شوگن کا رشتۂ ازدواج منسوخ کر دیا جائے۔۔۔اور مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

جج نے جیوری کے فیصلے کے مطابق ہی اپنا فیصلہ اور حکم صادر کیا۔

☆

''وصل اور ہجر''

فرح کامران (امریکہ)

ہم نے کیا آپ سے محبت کی — شہر کے شہر نے عداوت کی
وصل اور ہجر کی وہ پہلی شب — ہائے کیا رات تھی قیامت کی
فیصلہ کر لیا تھا جب تم نے — کیا ضرورت تھی اس عدالت کی
وقت رخصت بھی خوب روشن تھی — چاند پر اک لکیر وحشت کی
کب تلک تم ہمیں ستاؤ گے — کیا کوئی حد ہے اس عنایت کی
رُخ سے ظالم کے آج پھر ہم نے — نوچ ڈالی نقاب عزت کی
چھن گئے اپنے بال و پر ہم سے — یہ سزا پائی ہم نے ہجرت کی
ایک دن ہم نے سر جھکایا تھا — اور پھر عمر بھر بغاوت کی

○

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

ایک سورج جو نہاں وسعتِ افلاک میں ہے — روشنی اُس کی ہر اک سمت بُتِ خاک میں ہے
خواب کے شہر میں بکھرے ہیں اجالوں کے ہجوم — آج کی رات سجی تاروں کی پوشاک میں ہے
دیکھئے مجھ کو مرے فکر کے آئینے میں — میری تصویر مرے خامۂ بے باک میں ہے
کُل کسی وقت بھی ہوسکتا ہے سانسوں کا چراغ — موت اے زندگی ہر لمحہ تری تاک میں ہے
فکر میں اپنی وہ رکھتا ہے مقام لاہوت — ہے وہ مجذوب جو بیٹھا خس و خاشاک میں ہے
اُس میں پوشیدہ ہر اک شے کے فسانے ہیں مراقؔ — اک ستارہ جو ازل سے مرے ادراک میں ہے

○

احسان قادر (لاہور)

تمہارے شہر کی ہر شے سے پیار کرتے ہیں — خس و غبار پہ بھی دل نثار کرتے ہیں
عطا تمہاری ہیں سب ہجر و وصل کے لمحے — سو دانہ دانہ انہیں ہم شمار کرتے ہیں
عروجِ ذات فقط عجز و انکسار میں ہیں — پسند عجز کو پروردگار کرتے ہیں
سپاہِ ہجر کو دل سے نکال کر اب ہم — نئے وصال سے دل ہم کنار کرتے ہیں
یہ درد میرے لئے سود مند ٹھہرا ہے — اسی لئے تو یہی کاروبار کرتے ہیں
جو کم نگاہی پہ میری ہیں معترض سن لیں — ہم ایک جست میں صدیوں کو پار کرتے ہیں
میں دیکھ آیا ہوں ساری کرامتیں ان کی — وہ دشت لائقِ رشکِ بہار کرتے ہیں
نگار خانۂ حیرت کو دیکھ کر ہم لوگ — نئے جہانوں کی رہ اختیار کرتے ہیں

○

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا، بھارت)

گلی کوچے اگر بازار ہونگے
بہت کم لوگ عزت دار ہونگے

پرندے دھوپ سے بیزار ہونگے
کہیں تو پیڑ سایہ دار ہونگے

وہاں یہ سوچ کے جانا پڑے گا
کئی چینل ، کئی اخبار ہونگے

فلک سے اب نہیں آئے گا کوئی
زمیں پر ہی نئے اوتار ہونگے

گھٹن کا رونا کیوں روتے ہو بھائی
مکانوں میں در و دیوار ہونگے

وطن سے جو نہیں کرتے محبّت
دماغی طور پر بیمار ہونگے

کنارہ کب نظر آئیگا جاوید
سفینے کب ہمارے پار ہونگے

○

عارف شفیق

(کراچی)

شہر میں اک دشت کا منظر بلاتا ہے مجھے
شام ہوتی ہے تو میرا گھر بلاتا ہے مجھے

سوچتا رہتا ہوں جانے کیا میں بیٹھا رات بھر
نرم نیندوں سے بھرا بستر بلاتا ہے مجھے

دیکھنا سیکھا ہے میں نے جب سے دیواروں کے پار
ہر حسیں منظر کا پس منظر بلاتا ہے مجھے

جب بھی چھپ کر بیٹھتا ہوں ذات کے اندر کبھی
دکھ کسی انسان کا باہر بلاتا ہے مجھے

ماں یہ لگتا ہے کہ تو اب بھی یہیں موجود ہے
تیرے لہجے میں کوئی اکثر بلاتا ہے مجھے

گونجتی ہے کربلا میں یہ صدا عباسؓ کی
ظالمو ٹھہرو مرا اصغرؓ بلاتا ہے مجھے

اپنی مٹی کو بکھرتے دیکھتا ہوں خواب میں
صبح میری قبر کا پتھر بلاتا ہے مجھے

جس کی صبحیں نور کی ہیں جس کی شامیں نور کی
جانے کب سے نور کا وہ در بلاتا ہے مجھے

نیند گہری سو رہا ہوں اوڑھ کر سورج کا خواب
چاند عارف کس لیے چھت پر بلاتا ہے مجھے

○

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

خلوصِ اہلِ دنیا آزما کر دیکھ لیتے ہیں
تعلق کچھ زمانے سے بڑھا کر دیکھ لیتے ہیں

غمِ دنیا کو غم اپنا بنا کر دیکھ لیتے ہیں
یہ مرہم اپنے زخموں پر لگا کر دیکھ لیتے ہیں

ستمگر کے خلاف اُٹھ کر یہاں اب کون بولے گا
زباں پر چپ کا پہرہ ہم بیٹھا کر دیکھ لیتے ہیں

سُنا ہے سچا منصف ہے ضمیرِ حضرتِ انساں
چلو ہم اس عدالت میں بھی جا کر دیکھ لیتے ہیں

سُنا ہے تب سکوں ہوگا گزر جائے گا جب طوفاں
چلو ہم وحشتِ دل کو بڑھا کر دیکھ لیتے ہیں

سُنا ہے زہر ہی خود زہر کا تریاق ہوتا ہے
اُسے کچھ اور غصہ ہم دلا کر دیکھ لیتے ہیں

○

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

حقیقت کو بُھلا کر دل فسانے ڈھونڈنا چاہے
بچھڑ کر تم سے جینے کے بہانے ڈھونڈنا چاہے

کبھی ہم نے بھی خوابوں کے سرابوں میں سفر رکھا
کبھی ہم نے بھی چاہت کے خزانے ڈھونڈنا چاہے

کمی آ ہی گئی آخر تمہاری بھی جفاؤں میں
تھکا ہارا پرندہ بھی ٹھکانے ڈھونڈنا چاہے

سکت بازو میں باقی ہے نہ کوئی تیر ترکش میں
شکاری کی نظر پھر بھی نشانے ڈھونڈنا چاہے

یہاں تو پل میں دنیا کی روش تبدیل ہوتی ہے
مگر وہ سادہ دل منظر پرانے ڈھونڈنا چاہے

عدیلؔ ایسی عبادت کے نہیں ہم ماننے والے
خدا کو چھوڑ کر جو آستانے ڈھونڈنا چاہے

○

زیبا سعید
(کراچی)

مسئلہ درپیش جو تھا اس کو حل میں نے کیا
ہر ادا کو آپ کی زیبا غزل میں نے کیا

گفتگوئے عشق پر پورا عمل میں نے کیا
جو کہا تھا آپ نے اس کو غزل میں نے کیا

سامنے میرے نہیں ہے کوئی بھی ایسی مثال
زیست کے فرمان پر جتنا عمل میں نے کیا

راحتیں جتنی ملیں وہ دوستوں کو سونپ دیں
اور جتنے تھے مصائب درِ بغل میں نے کیا

پیچھے مڑ کر دیکھنا ہرگز مرا مسلک نہیں
جو ارادہ بھی کیا لوگو اٹل میں نے کیا

وہ کبھی آیا نہ میرے روبرو افسوس ہے
صرف جس کی یاد میں ایک ایک پل میں نے کیا

سامنے فرہاد و مجنوں آ گئے زیبا مرے
جب کہیں نظّارۂ دشت و جبل میں نے کیا

○

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

رکھّے ہر اک قدم پہ جو مشکل کی آگہی
ملتی ہے اُس کو راہ سے منزل کی آگہی

سیکھا ہے آدمی نے کئی تجربوں کے بعد
طوفان سے ہی ملتی ہے ساحل کی آگہی

اُس کا خدا سے رابطہ ہی کچھ عجیب ہے
دنیا کہاں سمجھتی ہے سائل کی آگہی

نظروں کا اعتبار تو ہے پھر بھی میرا دل
ہے اک صحیفہ جس میں مسائل کی آگہی

دن رات جس کے پیار میں رہتی ہوں بے قرار
اُس کو نہیں ہے کیوں دلِ بسمل کی آگہی؟

یادوں کے اک ہجوم میں رہ کر پتہ چلا
تنہائی بھی تو رکھتی ہے محفل کی آگہی

خنجر کا اعتبار نہیں , وہ تو صاف ہے
لیکن ملے گی خون سے قاتل کی آگہی

مشقِ سُخن سبیلہؔ نکھارے گی فن کو اور
مطلوب ہے کچھ اور ابھی دل کی آگہی

○

نوید سروش

(میرپورخاص)

جب سزائے غمِ ہستی سے گزر جاؤں گا
میں اُجالوں کی طرح اور نکھر جاؤں گا

میں اکیلا ہی رہِ زیست میں ہوں محوِ سفر
ہم سفر کوئی ملے گا تو ٹھہر جاؤں گا

کیا مراحق نہیں، فرزندِ زمیں ہوں میں بھی
اب میں ہجرت نہ کروں گا یہیں مر جاؤں گا

بے زمینی کا ہو دکھ یا کسی غفلت کی سزا
یہ تعاقب میں رہیں گے میں جدھر جاؤں گا

جبر کے سامنے سرخم نہ کروں گا میں سروشؔ
مر کے بھی نام وفا اوج پہ کر جاؤں گا

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

اُن کو تو یہ پتہ نہیں، دن ہے کہ رات ہے
اَب جانچنا تو یہ ہے، کہ کیا واردات ہے

کچھ مسکراتے رہتے ہیں، کہتے بھی کچھ نہیں
ہے دیکھنا ہمیں تو یہ کیسی سوغات ہے

اُن سے کسی نتیجے پہ پہنچا کہاں گیا
کب سے لگے ہیں تاک میں کہ کس کی گھات ہے

جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ صرف کہنے تک ہی ہے
نوبت کبھی نہ کرنے کی آئی، کیا بات ہے

اَب تک سمجھ نہ پائے کہ ہوتی ہے جیت کیا
خوش فہمی میں گھِرے ہیں کہ دشمن کی مات ہے

سہرہ سجا تو بیٹھے ہیں، تحفہ بھی جیب میں
لیکن نہیں ہیں جانتے ، کس کی بارات ہے

وہ دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو چلے
رہتی ہے پھر خبر کہاں، کیا ذات پات ہے!

○

قیصر ضیا قیصر

(جھارکنڈ، بھارت)

ریگزاروں میں شجرکاری ضروری ہے بہت
دھوپ سے لڑنے کی تیاری ضروری ہے بہت

خواب کے حملے سے بچنا ہے محال اس کے بغیر
آنکھ کے حصے میں بیداری ضروری ہے بہت

دشت وصحرا کے سفر کی خاک آڑانے کے لئے
پاوں سے زنجیر کی یاری ضروری ہے بہت

آگ بیجیلہ بھڑکتی ہے کہاں یوں دشت میں
اے ہوا، تھوڑی سی چنگاری ضروری ہے بہت

کوئی چہرہ ہو نہ آسانی سے اس میں منعکس
آئنے میں دل کے زنگاری ضروری ہے بہت

روشنی کی منزلوں کا یوں نہیں ملتا نشاں
راہ میں پیہم سیہ کاری ضروری ہے بہت

تمغہ- شاہی یوں ہی ملتا نہیں" قیصر ضیا"
اس کی خاطر خوئے درباری ضروری ہے بہت

○

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن چوہان

(میرپورخاص)

اب تو مرے وجود کا اقرار کر ہی دو
یا پھر اے حسرتو مجھے مسمار کر ہی دو

ہر روز ایک زخم سے اکتا گیا ہوں میں
کرنا ہے مجھ کو قتل تو اک بار کر ہی دو

ایسا کرو کہ مجھ میں جواں حوصلہ رہے
امکاں کا کوئی در درِ دیوار کر ہی دو

تم کو مری غزل پہ بغاوت کا ہے گماں
مجھ کو یا قید میرے یہ افکار کر ہی دو

مجھ سے غریب کی تو یہی کائنات ہے
دیکھو مرے سپرد یہ دستار کر ہی دو

کب تک کھڑے رہو گے مری راہ میں حبیبؔ
لب پر جو آ گیا ہے وہ اظہار کر ہی دو

○

فیاض احسن

(مہاراشٹر، بھارت)

رات نے کیسے مرا سارا بدن گرما دیا
میں نے سورج کو اشارہ دے کے سب سمجھا دیا

زندگی لازم نہیں ہے زندگی کے واسطے
کل مجھے سوکھے ہوئے اک پھول نے مہکا دیا

چھین لینا چاہتا تھا میرا مشکیزہ مگر
میں نے کوزے میں سمندر ہی اس دکھلا دیا

قبر کی مٹی مرا کنکال تک کھا جائیگی
زندگی تو نے مجھے لاکر کہاں پہنچا دیا

شاعری اس کا تقاضہ تو نہیں کرتی مگر
میر جی کو ایک لونڈے نے بہت بہکا دیا

○

خالد راہی

(کراچی)

سنبھل جانے کی بھی مہلت نہیں ملتی
خدا جو روٹھ جائے کوئی سہولت نہیں ملتی

آئینے میں کھڑے ٹٹولتے رہتے ہیں
اپنی ہی اب ہمیں صورت نہیں ملتی

سب اپنی خواہشوں کی قید میں جیتے ہیں
کرنے کی بچوں کو بھی شرارت نہیں ملتی

یخ بستہ جسم اور ٹھنڈے پڑتے جذبے
ساتھ ہو کر بھی تعلق کو حرارت نہیں ملتی

اتنی نوازشیں ہیں میرے رب کی راہی
مانگنے کی اب کوئی ضرورت نہیں ملتی

○

اردو نوشت میں غیر اردو الفاظ

(اردو رسم الخط کا جائزہ)

حسن منظر
(کراچی)

انگریزی الفاظ کے اردو میں لکھے جانے کا مسئلہ محض اتنا نہیں ہے کہ جہاں اُو کی آواز ہو اُسے الف کی آواز نہ بنایا جائے، پڑھنے بولنے والوں کا تلفظ خود بخود درست ہوگا اور ایک چھوٹے انگلش آشنا طبقے کو بڑے ناآشنا طبقے پر ہنسنے کا موقع نہیں ملے گا، زیادہ مشکل مسئلہ حروف صحیح کی ادائیگی کا ہے جہاں وہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوں کہ درمیان میں نہ زبر ہو، نہ زیر، نہ پیش اور بدقسمتی سے وہ لفظ کے شروع میں آجائیں تو لفظ کی منھ سے ادائیگی دقّت بن جائے۔ یہ مسئلہ خاص خاص حروف کے جمگھٹوں Consonant clusters (مصمتی خوشون) کا ہے، سب کا نہیں۔

ٹی (T) کے بعد آر (R) بلا تکلف زبان سے ادا ہوسکتا ہے اور سی (C) کے بعد (R) بھی لیکن ایس (S) کے بعد کے (K)، ایم (M)، این (N) یا (T)؟ یہ معاملہ بدمزگی پیدا کرنے کا ہے اور ہمارے انگریزی دانوں میں جو بالطبع نکتہ چین ہوں، باعث نزاع بن جاتا ہے۔ جب یہ 'بیماری' ہماری سوسائٹی میں ہے تو اس سے نظر کیوں چرائی جائے۔ میں نے عالموں، ادیبوں تک کو ان الفاظ کی منہ اور قلم سے ادائیگی پر ایک دوسرے کی ہنسی اڑاتے دیکھا ہے، پیٹھ پیچھے اور روبرو۔ بلکہ اپنی تحریر میں بھی۔ لیکن کبھی ایک بار بھی کسی کو غور کرتے نہیں دیکھا کہ ایسا ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ مسئلہ دو گروپس کی لسانی پہچان کا حصّہ بنا ہوا ہے گویا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ بحث کرنے والوں میں سے انگریزی ایک کی بھی مادری زبان نہیں ہوتی ہے۔

ایک اردو ہی نہیں حروف صحیح کے ایسے جمگھٹوں سے جب وہ لفظ کے شروع میں آتے ہیں دوسری زبانیں بھی دوچار ہیں۔ اکثر نے ان کے حل بھی تلاش کر لیے ہیں مثلاً ترکی اور ہندی لیکن اسکرپٹ کے معاملے میں روایت ہماری رہنما رہی ہے ضرورت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کی زبان پر یہ اعتراض غور کریں تو اردو لکھائی کی کوتاہیوں کا ایک حصہ ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔ یہ جائزہ اُن کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان پہلوؤں کی طرف جدھر ترمیم اور ترقی ممکن ہے۔

آغاز کے لیے: ضرورت اس بات کی ہے کہ غور کیا جائے کہ جب کسی بھی زبان کے لفظ کسی دوسری زبان کی نوشت میں وارد ہوتے ہیں تو نئی زبان میں کس شکل میں بول چال کا حصہ بنتے ہیں اور کس طرح لکھے جاتے ہیں۔ اردو میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے اور اُن میں سے اکثر کو سوسائٹی اپنا چکی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ غیر الفاظ کی اردو میں آمد ایک انگریزی ہی سے نہیں دوسری زبانوں سے بھی ہے۔ یہ عمل ہماری پھیلتی ہوئی معاشرت کی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ ان بدیسی الفاظ کی جگہ عربی لغات کو کھپانے کی کوشش بھی بارہا کی گئی ہے لیکن عام آدمی کی زبان پر وٹامن کی جگہ حیاتین نہ لے سکا اور نہ سیل کی جگہ خلیہ۔ حتیٰ کہ Authority کا عربی بدل مقتدرہ بھی بس لکھے جانے/ چھپنے تک محدود رہا۔ اہمیت کا پہلو یہ ہے کہ کیا ہم جانتے ہیں کہ جو الفاظ دوسری زبانوں سے اُردو میں وارد ہوئے ہیں ایا وہ صحیح طرح لکھے اور بولے جا رہے ہیں۔ لوگوں کی زبان پر بار تو نہیں ہیں، غلط معنوں میں تو استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔

ہماری طرح عربی کو بھی بدیشی الفاظ کو اپنے تن میں جگہ دینی پڑی ہے لیکن انہیں لکھنے اور بولنے میں وہاں والوں کو ہم سے زیادہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وجہ اس کی شاید یہ ہے کہ اسکرپٹ میں ایک بے اہمیت تبدیلی (انگریزی حرف وی (V) کے لیے تین نقطوں والی ف کا اضافہ) کے بعد وہ مزید کسی تبدیلی یا اضافے کو غیر ضروری سمجھے ہوئے ہیں۔

معاملہ ایک زبان سے دوسری زبان کے سفر میں ہر جگہ اسکرپٹ (نوشت) کی محدودیت کا ہے۔ اردو نوشت بھی انگریزی اور دوسری زبانوں سے آنے والے لفظوں کے لیے ناکافی ہے۔ ایسی غالباً کسی زبان کی نوشت نہیں ہے جس میں تمام زبانوں کے الفاظ باآسانی کھپائے جاسکیں۔ اور وہ بھی بغیر کسی قسم کی ترمیم کے۔

انگریزی حروف صحیح کے یہ جمگھٹے جس طرح ہمارے یہاں سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں اُن کے برتنے والوں کو تین گروپس میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جو دو ایسے حروف صحیح Consonants کے جوڑ سے شروع ہونے والے لفظوں کو اس طرح زبان سے ادا کرتے ہیں جس طرح وہ جن کی زبان سے وہ اردو میں آئے ہیں۔ یعنی درست تلفظ۔

۲۔ جو دو ایسے حروف صحیح (مصمتوں Consonants) سے پہلے اپنی آسانی کے لیے قدرتی طور سے کوئی حرف علّت (مصوتہ Vowel) عائد کرتے ہیں۔

۳۔ وہ جو ایسی ہی آسانی کے لیے پہلے دو حرف صحیح کے جمگھٹے کے درمیان حرف علت یا اس کی علامت کا استعمال خود بخود کرتے ہیں۔

نمبر ایک گروپ اپنی علیحدہ شناخت رکھتا ہے۔ ایسے گھرانوں، ایسی درس گاہوں کے افراد جہاں انگریزی زبان حاوی ہے۔

نمبر ۲۔ اور ۳۔ گروپ جو دیسی ماحول کے پروردہ ہیں۔

بدیشی زبانوں کے ایسے الفاظ سے میرا واسطہ اُردو سے باہر کے علاقوں میں بھی رہا ہے جو شروع دو یا تین ایسے حروف صحیح سے ہوتے ہیں جو مل کر

ایک صوتیہ بن گئے ہیں یعنی Consonant Clusters اور جن کی زبان سے ادائیگی اُن کے لیے دشوار ہوتی ہے جن کی زبان کے وہ لفظ نہیں ہیں۔ نتیجے میں ان لفظوں کی شکل بگڑ جاتی ہے، کبھی کبھی اس حد تک کہ اصلی لفظ اپنی پہچان ہی کھو بیٹھتا ہے۔

غیر زبان کے یہ جمگھٹے اردو ''حروف صحیح کے خوشوں'' سے اپنی ساخت میں مختلف ہوتے ہیں۔ صدر، صبح، ختم میں دوسرے حرف پر جزم لگانے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے (گو زبان پر اکثر کے جزم کی جگہ زبر ہوتا ہے) مگر دوسری زبانوں کے الفاظ میں ایک جزم سے زیادہ کچھ اور درکار ہوتا ہے۔

اس گفتگو میں بار بار آنے والے چند لفظوں کی وضاحت ضروری ہے:

حرف صحیح: اسم صوتیہ، Consonant، مصمتے، وینجن جسے ادا کرتے ہوئے سانس رکتا ہے اور بغیر کسی حرف علت کی مدد کے آواز نہیں دیتے ہیں۔ وہ حرف علت، حرف صحیح سے پہلے آئے یا بعد میں اس کا وہاں ہونا بہت سوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ غور کریں تو پتہ چلتا ہے خود انگریزی کے نیچے دیئے ہوئے حروف تہجی اپنی آواز کے لیے حروف علت کے محتاج ہیں۔

A	E	F	H	I	L	M	N	O	R	S	X
e	i	e	e	a	e	e	e		a	e	e

(اردو کے بعض علاقوں میں جہاں ایم (M) اور این (N) نہیں کہا جاتا ہے یہ یَم اور یَن حروف میم اور مین بن جاتے ہیں)

ہندی میں حروف صحیح وینجن کہلاتے ہیں۔ وہ حروف جن میں سُور (آواز) نہ ہو F.W.Fellon نے انگلش اُردو ڈکشنری میں اس لفظ کو پینجن لکھا ہے۔

حرف علت: مصوتہ، vowel۔ اُن حروف میں سے کوئی جو حروف علت کی نمائندگی کرتے ہیں vowel point، اعراب، ماترائیں، حرکات، گتی۔

حروفِ صحیح کا جمگھٹ: Consonant Cluster

Digraph: ایک آواز پیدا کرنے والا دو حروف کا جوڑا، Trigraph تین حروف جو مل کر ایک صوت کی علامت ہوں۔

حروف کے جمگھٹوں Consonant Cluster کی تعریف یوں ہو سکتی ہے: ایسے حروف صحیح کا ایک کے بعد ایک آنا جن کی آواز یکجا ہو کر ایک مخلوط شکل میں زبان سے ادا ہوتی ہے مثلاً String (ڈوری)، اور Schizophrenia (ایک دماغی مرض) اور ان کے درمیان نہ کوئی حرف علت ہوتا ہے نہ ایک کو دوسرے سے ملانے کے لیے کسی حرکت سے کام لیا جاتا ہے۔

ایک دوسری صفت ان جمگھٹوں کی یہ ہے کہ St اور Sp کی طرح اگر لفظ کے شروع میں ہوں تو جس کی زبان کا وہ لفظ نہیں ہے اس کے لیے دقّت پیدا کر دیتے ہیں (آخر کو ایس (S) ان حروف میں سے ہے جو خود اپنی ادائیگی کے لیے ای (E) کی علت کا طلبگار ہے) لفظ کے آخر یا درمیان میں ہوں تو مضائقہ نہیں۔ اب کس کو یہ جوڑ milch, mask, Christ, rest, clasp اور first کو بولنے میں کھلتے ہیں! نہ ہی درمیان میں: Moscow، history, monkey, king اور master۔ شاید اس وجہ سے کہ جمگھٹوں کے لفظ کے درمیان موجودگی اُردو میں پہلے سے موجود ہے: مُشک، زِیست، مَست، ہستی، ماسٹر۔ ہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کیا لفظ کے آخر یا درمیان میں آنے والے یہ جمگھٹے اپنے سے پہلے ایک حرکت صوت لئے ہوئے ہیں؟ وہ نہ ہوں تو ش ک اور س ت کی ادائیگی دشوار ہو جائے۔

جب ذکر Schizophrenia کا آ گیا ہے تو اس کے بارے میں بھی کچھ کہتا چلوں تو کیا حرج ہے۔ ٹینشن Tension، اور ڈپریشن Depression کی طرح یہ لفظ بھی اب عوام کے لیے غیر مانوس نہیں رہا ہے۔ لفظ شروع ہوا ہے Sch کے جمگھٹے Trigraph سے اور بنیاد اس کی Schism/Skizm ہے یعنی کسی چیز کا بیچ سے ٹوٹنا، دولخت ہونا، تقسیم ہو جانا۔ اس مرض میں خیالات، جذبات اور اُن کی ہم آہنگی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ بات چیت، ہنسنا رونا ایک دوسرے سے ربط کھو بیٹھتے ہیں اور گفتگو بظاہر بے معنی ہو جاتی ہے۔ Sch ایک مشکل جمگھٹا ہے نہ اس سے پہلے کوئی حرف علت ہے نہ تینوں حروف کے درمیان۔ ادائیگی کو آسان بنانے کے لیے ایک طرح سے فطرت اُردو اور اس کی پڑوسن زبانوں کے آڑے آئی اور Sch کے بعد ee کے اضافے نے مشکل کو آسان کر دیا۔ اب زیادہ کے منہ پر شیزوفرینیا ہوتا ہے اور لکھا بھی جاتا ہے۔ یہ تلفظ باعث نزاع نہ سہی اُن طلبا کے لیے باعث استہزاء ضرور بن جاتا ہے جو یہاں سے مغربی ممالک مزید تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔

جن حروف صحیح کے جمگھٹوں Consonant Cluster کی بات ہو رہی ہے ان کی مثال یہاں دینا ضروری ہے۔ انگریزی سے اردو نوشت میں اگر کسی لفظ میں حرف صحیح ایس (S) کے بعد کوئی حرف علت ہے تو اُس کی زبان سے درست ادائیگی کون سی بڑی بات ہے۔ Soul (روح) ہی کو لیجیے، پھر Sole (پاپوش کا تلا)، Serum (خون کا ایک جزو) Salt (نمک)، Sublime (ارفع)، Sister (بہن) وغیرہ سب بآسانی اردو بولنے والے کے منہ سے ادا ہوتے ہیں، بلکہ وہ لفظ تک جن میں ایس (S) کے فوراً بعد ایچ (H) بغیر کسی درمیانی حرف علت کے آ جاتا ہے۔ اس اتصال سے ش کی آواز پیدا ہوتی ہے۔۔۔ ایک Digraph جیسے Sheep (بھیڑ) اور Short (مختصر) لیکن یہ آسانی Storm (طوفان)، Scarlet (سُرخ) جیسے الفاظ کی ادائیگی کے وقت دغا دے جاتی ہے۔ صرف ہمیں ہی نہیں اسپین اور پرتگال والوں کو بھی۔ وہ ایس (S) اور ٹی (T) کے جمگھٹوں کو لگتا ہے جوں کا توں پڑھنے سے کتراتے ہیں اور زبان سے ادا بھی نہیں کر پاتے کیونکہ حروف صحیح کا یہ جوڑا اُن کی بولی کا حصہ نہیں ہے۔ وہ Street کو estreet اور Start کو estart کہتے ہیں اور میرا خیال ہے ایسا کرتے ہوئے شرمندگی بھی محسوس نہیں

کرتے ہیں۔ کیونکہ کہ اپنی زبان کے بارے میں انہیں کسی قسم کا احساس کمتری نہیں ہے کہ وہ انگلش سے کسی طرح کم ہے۔ ایسے تمام انگریزی الفاظ کے پہلے وہ ای (E) کا اضافہ کرتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ غالباً اُن کی زبانوں میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو ایس (S) سے شروع ہوتا ہو اور اس کی ردیف میں کوئی صوتیہ Consonant بیٹھا ہو۔ جن اسپین اور پرتگال والوں سے ہماری ملاقات یونیورسٹی جیسی جگہاؤں میں ہوتی ہے اُن کا تلفظ چونکا دینے والا نہیں ہوتا ہے۔ اور شاید میں یہ کہتے ہوئے غلطی نہیں کر رہا ہوں کہ کوئی لفظ اُردو کا بھی نہیں ہے جو س (سین) سے شروع ہوتا ہو اور اس کے عقب میں بغیر حرکت، اعراب (زبر، زیر، پیش) دوسرا حرف صحیح آجائے۔ یا ہے؟

عربی ایسے اپنائے ہوئے بیرونی لفظوں کے دو حروف صحیح کے جمگھٹے کو توڑنے کے لیے ایک مداخلتی حرف علت intrusive vowel کا استعمال کرتی ہے۔ کبھی کبھی اس مداخلت کے دلچسپ نمونے سننے میں آتے ہیں مثلاً Sixisteen (سِکسِسٹین) ۱۶ کے لیے۔

خود جسے ہم انگریزی میں Spain لکھتے ہیں وہ اُن کے یہاں Espinol (یاEspain) ہے جو اردو لکھائی میں اسپین بن گیا ہے۔ علامہ اقبال نے ''ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے'' (بال جبریل) میں اسپین کو جو ہسپانیہ لکھا ہے تو بڑی حد تک درست ہے۔ یہاں الف کی جگہ ہائے ہوز (چھوٹی ہ) نے لے لی ہے۔ اسپتال میں ہائے ہوز کی جگہ الف لے لیتا ہے۔

نیدرلینڈرز (Netherlanders) جنہیں دنیا والے ہولینڈ کے باشندے کہتے ہیں اور ان کی زبان کو ڈچ (ایک مہمل اصطلاح) جب کہ وہ خود اُسے Hollands ہولاندز کہتے ہیں، انگریزی حرف ایل (L) کو پی (P) سے بغیر درمیان میں حرکت لائے ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر اُن میں سے کوئی سالہا سال سے انگریزی زبان کی دنیا میں رہ رہا ہے اور انگریزی مادری زبان کی طرح بولتا ہے تو بھی وہ اپنی مادری زبان کی عائد کی ہوئی اس کمی کو چھپا نہیں پاتا ہے۔ جب وہ کسی قسم کی مدد کی بات کر رہا ہو اس کی Help میں Helup کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اور مجھے جب بھی ''Helup'' سننے کا اتفاق ہوا میں نے خوش ہو کر پوچھا ''جناب کی اپنی زبان ہولاندز ہے؟'' اور اس نے ہمیشہ ہنس کر کہا ''یو آر رائٹ'' یعنی پکڑے گئے۔ یہ بات اُن کے لیے باعث مذاح ہوتی ہے اور میرے لیے بھی۔

سب حروف صحیح کے جمگھٹوں سے شروع ہونے والے لفظ زبان کو نہیں پکڑتے ہیں۔ Cross کو لیجیے۔ کاف کا ہم صوتی سی (C) اور آر (R) بغیر اپنے درمیان کوئی حرف علت حائل کیے بلا تکلف زبان سے ادا ہو جاتا ہے اور اردو لکھائی میں کسی ترمیم یا اضافے کا طلبگار نہیں ہے لیکن بات جہاں Sport اور Support کی آجائے جو اُردو بول چال اور صحافت کا حصہ ہیں وہاں سوچنا پڑتا ہے کہ کیا دونوں ایک ہی طرح لکھے جا سکتے ہیں؟

پرتگال اور اسپین کے بعد دو افریقی ملکوں کا ذکر اسی ضمن میں آجائے تو اچھا ہے۔ آزاد گھانا کے صدر Kwame Nkruma (۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۲ء) اپنے یہاں والوں سے میں اُن کے نام کے دونوں حصوں کو دو مختلف طرح سے سنا کرتا تھا۔ کچھ ن (N) کو ک (K) میں اُڑسنے کے لیے بیچ میں علت کے نمائندے زبر کا سہارا لیتے (بروزن نکسیر) دوسرے این کے (Nk) کی مشکل ادائیگی کو اس جڑواں صوتیے سے پہلے الف مفتوح (اَ) لگا کر آسان کر لیتے تھے (بروزن اُنگس)۔ آخر دونوں کے منہ ہی تو تھے جو اس غیر مانوس آوازوں کے جوڑ Digraph کی ادائیگی اس طرح کر پاتے تھے۔ ہماری زبان ہی کیا پورا آلہ صوت مکمل طور سے کب ہمارے بس میں ہے! صحیح تلفظ میں Nk یک صوتی حرف ہے دو حروف نہیں اور صرف وہی اس کا صحیح تلفظ ہے جو اُس زبان کے وارث منہ سے ادا کرتے ہیں جس کا یہ اور ایسے لفظ ہیں۔

Kwami کی ادائیگی وہاں سب ہی کے (K) اور ڈبلیو (W) پر زبر کے ساتھ ادا کرتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں عَوَامی۔

نائیجیریا کے شہروں میں سے ایک Ngalakpo ہے، دوسرا Nsukka، تیسرا Ngwu۔ پہلے دو کے نام پاکستان ہندوستان والوں میں سے ایک فریق اس طرح ادا کرتا تھا۔ اَنگالکپو اور انسُکّا دوسرے فریق کی زبان سے وہی نام نگالکپو اور نسُو کا بن کر نکلتے تھے۔

تیسرے شہر Ngwu کا معاملہ مختلف ہے۔ اُسے پہلے ہی برطانوی حکومت Enugu بنا چکی تھی۔ برطانیہ والوں کے لیے بھی ng کا جمگھٹا یا مجموعہ باعث پریشانی رہا ہوگا اور اُس پریشانی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے این (N) سے پہلے ای (E) کا اضافہ کیا، پھر این (N) اور جی (G) کے درمیان یو (U) عائد کر کے لفظ کو عوام میں رائج کر دیا۔ باقی جو مشکل خاتمے پر تھی دو طرح کے واؤ wu کے صوتیے کی اس کے لیے ڈبلیو کی قربانی کافی سمجھی گئی۔ ویسے برطانیہ والے ناموں کے چولا بدلانے کا کام ہمارے یہاں بھی کر گئے ہیں۔ ڈیلہی، بومبے، ہائیڈراباڈ انہی کا عطیہ ہیں۔ پاکستان میں حیدر آباد ابھی تک Hyderabad لکھا جاتا ہے۔ شاید ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہو۔

اور یہ بھی ممکن کہ Ngwu کو Enugu بنانے کا کام پرتگیزیوں نے کیا ہو۔ وہ ایک زمانے میں اُن ملکوں سے نوجوان افریقیوں کو غلام اور کنیز بنانے کے لیے خرید کر، نہ ملیں تو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔

بہر حال یہ جمگھٹے جو ہمارے یہاں گفتگو اور نوشت میں طنز اور عیب گیری بن جاتے ہیں اُن کی ادائیگی یوروپ امریکا والوں کے لیے بھی آسان نہیں رہی ہے۔

ایک مغربی افریقہ ہی کیا اگر چند دوسری زبانوں پر بھی نظر ڈالیں تو تلفظ کی مشکلات سے وہاں بھی دوچار ہوں گے۔ سابق ویت نام کے صدر Ngo Dinh Diem، موصوف کے بھائی Ngo Dinh Nhu، ایک اور ہستی وہیں

کی Nguyen van Nhung۔شکر ہے یہ اسمائے گرامی اب ہمیں بھولتے جارہے ہیں۔چین کا دریا Yangtze Kiang اور پہلے صدر ماؤزے دونگ ہمارے ذہن میں تازہ ہیں۔وہ دریا پہلے یانگ ٹِسی کیانگ کہلاتا تھا اور وہ عزت مآب ماؤزے ٹُنگ۔چینیوں سے میں نے سُنا ان کا نام تھا موزے دَونگ۔

شکر ہے میرا واسطہ پولش سے نہیں پڑا ورنہ اُس سلاواک زبان کے جمگھٹے ایسے ہیں کہ زبان سے نبٹائے نہیں نبٹتے۔ خود زبان ہی کا نام Polszczyna ہے۔

اُن ویت نامیوں کے نام وہاں والے جس طرح بھی لیتے ہوں ہمارے لوگوں میں اُن کے نام کے دو ورشن (روپ) سننے میں آتے تھے:

۱۔ نگو،نہو،نگوین اور نھُنگ اور ۲۔اَنگو،اَنہو اور اَنگوین

رہا Nguyen اس کے ng کے جوڑ کو جس طرح بھی لکھا اور زبان سے ادا کیا جائے وہ اُردو کی نوشت میں ایک لفظ Nguyen بن کر نہیں اُبھرتا ہے کیوں کہ ایسے بیشتر ٹکڑوں میں لکھے جانے والے لفظ نہ انگریزی کی طرح بغیر مختصر کیے، جوں کے توں، جوڑ کر لکھے جاسکتے ہیں نہ ہندی کی طرح اُن کے حروف کو سر پر لکیر کھینچ کر ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے سے بندھے ہیں۔شِر و ریکھا۔

بلامصوتہ اتصال (vowelless) حروف جیسے ng, nk, sp, sch کی اصوات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے یہ سب اپنی اپنی بولیوں میں واحد حرف صحیح کی آوازیں ہیں۔جن کے لیے اُن کی لکھائی میں مخصوص حرفِ ہجہ بھی ہوں گے، دو یا تین حروف صحیح نہیں جن کا جدا جدا زبان سے ادا کرنا ہم پر فرض ہو۔ ہمارا قصور ہے تو بس اتنا کہ اُن کے لیے بغیر کسی واحد حرف صحیح کی اختراع کے ہم انہیں اپنے موجود گنجینۂ حروف میں کھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمام نامانوس آوازوں کے لیے نئے حروف کا اختراع کرنا کسی بھی زبان میں شاید ہی کبھی ممکن ہو۔جو حروف موجود ہیں اُن میں کسی حد تک ترمیم ممکن ہے۔

اب ایک اہم اور دلچسپ بات جو میرے مشاہدے میں آئی ہے اس کا ذکر کررہا ہوں:

اُردو اور اس کی پڑوسن زبانوں کے بولنے والے افراد جو انگلش الفاظ جن کا آغاز زیرِ نظر مشکل جمگھٹوں سے ہوا اُنہیں مذکورہ بالا دو طریقوں میں سے جس طرح ادا کرتے ہیں وہ دوسری غیر زبانوں کے ایسے الفاظ بھی اسی طرح ادا کرتے ہیں۔اگر انہوں نے انگلش جمگھٹوں کو توڑنے میں پہلے دو حروف صحیح کے درمیان کوئی حرف علت حائل کر کے یہ کام سرانجام دیا ہے تو اُس غیر زبان کی مشکل کو بھی اسی طرح حل کریں گے۔اگر الف کے سابقے کے ساتھ تو نئی جگہ بھی وہی کام آئے گا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔شاید اس کے پیچھے مادری زبان کارفرما ہوتی ہے۔مثال کے طور پر دو شہروں کے نام کا تلفظ لیجیے:

Stalingrad (رُوس) اور Nkongsamba (کیمیرون) جو گروپ Stand کو الف کے سابقے کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ ان دونوں کو بھی الف کے سابقے کے ساتھ ادا کرے گا۔جو Spleen (تلی) میں Sp کے جمگھٹے کے درمیان یو (u) کی علّت سے مدد لیتا ہے اُسے Sata اور Nakong کہنے میں زبر (َ) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔اور یہ بھی کہ ان دونوں گروپس میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کی زبان سے الف اور زبر تقریباً خاموش ادا ہوتے ہیں۔خرابی اگر ہے تو ان جمگھٹوں میں ہے بولنے والوں میں نہیں۔

موضوع سے گریز تو نہیں کر رہا ہوں لیکن چاہتا ہوں ایک نظر ہندی لکھاوٹ (اسکرپٹ) پر بھی ڈال لی جائے کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ یہ وینجنک یا بینجنک جھنڈ Consonant Cluster کس شکل میں نمودار ہوئے اور ہندی والوں نے انگریزی الفاظ کو ہندی خط میں لانے کے لیے کیا حل ڈھونڈا۔میں بات کو صرف سین (س) اور تے (ت) کے جمگھٹے تک محدود رکھوں گا۔

استری، اشنان، استھائی، استھاپن اور اسپرش وغیرہ اکثر سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔حقیقت میں اُردو روپ میں آنے پر سب خاموش الف سے شروع ہوتے ہیں لیکن سب ہی میں الف پر کوئی نہ کوئی عیاں یا چھپی حرکت لگی ہوتی ہے۔اردو میں ہر جگہ ادیب اور غیر ادیب استری اور استھائی لکھتے آئے ہیں۔۱۸۷۹ء کی The Medical Hall Press, Banaras کی مطبوعہ نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری میں S.W.Fallon نے استری کو ہندی لکھائی میں بھی ''اِی'' سے شروع کیا ہے۔اِستری جس طرح اُس دور میں یہ لفظ سننے اور لکھنے میں آتا ہوگا۔اس سے کیا غرض کہ وہ استری کپڑوں کو ہموار کرنے والی ہے یا مرد کو، ہجے دونوں کی یہی ہے۔

کلیر ینڈن پریس، اوکسفرڈ کی ۱۸۸۴ء کی اردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش ڈکشنری میں John T.Platts نے بھی اسی ہجے کو برقرار رکھا۔

۱۸۹۸ء رام نارائن لال پریس، الٰہ آباد سے چھپنے والی ڈکشنری میں ''اِی'' کی آواز گم ہو چکی تھی جیسے اسی لفظ کو مشنری J.D.Bate نے اپنی ۱۹۱۸ء میں انڈین پریس، الٰہ آباد سے چھپنے والی ڈکشنری میں اس طرح لکھا ہے کہ سا، تا سے پیوست ہے اور را ہندی رسم الخط میں خود تا کے پیٹ میں سمایا ہوا ہے۔ تری کی صوت جو بذات خود تا اور را کا جمگھٹا ہے اور دونوں ویجن (حرف) مل کر ایک نئی نہ سہی ایک انوکھی آواز پیدا کر رہے ہیں۔ہندی لکھائی میں جس کمی کو محسوس کیا گیا تھا وہ وقت کے ساتھ دور ہوتی گئی۔

راجہ راجیسور راؤ اصغر (ہندی اردو لغت ۱۹۳۸ء) نے اُن لفظوں کو جن میں یہ جمگھٹا نظر آتا ہے بغیر ہندی آ (الف) کے سابقے کے درج کیا ہے۔ مثال کے طور پر سُتھاپَت (رکھا ہوا)، سُتھاپَن (بیٹھانا)، سُنان (نہانا)، سُتھان (مقام) اور سُتھائی (ٹکنے والا) اور ہر جگہ سین کے ساتھ یہ خصوصیت برتی ہے کہ اُس پر جزم ہے۔(استری کے معاملے میں انہوں نے الف کے سابقے کو خیر باد نہیں کیا)۔

فادر کامل بُلکے نے (۱۹۸۳ء) اپنی انگلش ہندی ڈکشنری میں جہاں ذکر عورت کا کیا ہے اُسے سا اور تا کے جمگھٹے کے ساتھ لکھا ہے لیکن کپڑوں کے بل اور سلوٹیں نکالنے والی کو اِی کی آواز کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔

اردو ادیب باقاعدگی سے استری اور استھائی لکھتے رہے ہیں اور خوش قسمتی سے اس معاملے میں انہوں نے الف کے سابقے کے ہونے نہ ہونے کو ایک دوسرے کی علاقائی پہچان نہیں بنایا۔ ناواقفیت کی اپنی نعمتیں ہیں جن سے اکثر زیادہ علمی سوچ بچار رکھنے والے محروم نظر آتے ہیں۔

چلتے چلتے عرض کرتا ہوں استھائی (ستھائی) کا لفظ میں نے اردو فلموں کے اسکرپٹ میں بھی پڑھا ہے اور وہاں جو معنی اس کے لیے جاتے ہیں وہ ابتدائی (تعارفی) موسیقی کے ہوتے ہیں۔

استھائی کسی میوزیکل کمپوزیشن یا گانے کی پہچان والا حصہ ہوتا ہے جو پورے گانے یا راگ میں لوٹ لوٹ کر آتا ہے main theme، انگلش نظم کا refrain ہمارے یہاں ٹیپ کا مصرعہ اور اس کے ساتھ کی موسیقی۔

یہاں ایک اور بات ہندی لکھائی سے متعلق ہو جائے جس کا تھوڑا ذکر پہلے بھی آیا ہے۔ ہندی تحریر میں ہر لفظ میں شامل حروف کو چھپنے میں اُن کے اوپر ایک لکیر کھینچ کر جوڑ دیا جاتا ہے۔۔ شِرو ریکھا۔ حروف کے سروں کی لکیر۔ حروف اپنی اکائی قائم رکھتے ہیں اور مل کر ایک لفظ بنتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو حروف ادھوری شکل میں، ایک دوسرے سے ملا کر بھی لکھے جاتے ہیں، جس طرح دُشٹ (سنگدل) میں آدھا شا بلا تردد بغیر کسی حرکت کے ٹا میں مدغم ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی تبدیلی لانا اُردو اور اس کی ساتھی زبانوں میں کب ممکن ہے جہاں اکثریت اُن حروف کی ہے جو آدھے لکھے جاتے ہیں۔ کچھ اپنے سے پہلے حرف سے جڑے، کچھ بعد میں آنے والے سے، زیادہ تر دونوں طرف سے اور کچھ یکا اور تنہا نظر آتے ہیں۔ یوں لفظ کبھی دو ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے، کبھی تین چار میں، بچے یا اُن سے بڑے جو اردو پڑھنے میں رواں نہ ہوں جب ایک لفظ کے ٹکڑے کو دوسرے سے جوڑ بیٹھتے ہیں تو کبھی اُن کی ہنسی اڑتی ہے اور وہ کھسیانے ہو جاتے ہیں۔ کبھی استاد اگر جفا پیشہ ہو، عرف عام میں مرکھنا، تو مار بیٹھتا ہے۔ جس میں لفظ کے ٹکڑے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے تھے۔ یہی ہندی میں بھی ہوتا مگر وہاں شرو ریکھا ایک لفظ کے حروف کو باندھ کر رکھتی ہے۔ لکھنے میں اس ریکھا کی ضرورت نہیں رہتی ہے: رواں خط میں لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔

حروف پر کوئی لائین کھینچ کر اُنہیں ایک دوسرے سے جوڑنا اردو میں ممکن نہیں ہے لیکن اس مسئلے کا حل شاید اردو خطِ شکستہ میں ڈھونڈا جا سکتا ہے جس میں لفظ کے جز و ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں، اس کے کتنے ہی اسلوب تھے، جن میں سے کسی ایک کو نستعلیق کمپیوٹرائزڈ پرنٹنگ میں ممکن ہے کبھی ڈھالا جا سکے۔ موجودہ نوشت میں اردو طباعت پڑھنے میں تبدیلی کی طلب گار ہے ورنہ پڑھنے والے ویسی ہی غلطی کرتے رہیں گے جو اس مصرعے کو کسی پڑھنے والے نے کی ہوگی:

''پوچھا جو رو کے یار نے ناسخ کے حال کو'' (ہنس کر کہا رقیب شقی نے گذر گئے)

بات کو جاری رکھنے کے لیے آیئے کچھ استفادہ عربی سے کیا جائے۔ یوں بھی اردو سے اس کا لسانی رشتہ ہے۔

کہیں میرے پڑھنے میں آیا تھا کہ وہ الف خاموش جو عربی کے بعض لفظوں کے بعد آتا ہے یا دو کے درمیان، کیا اس سے اردو میں انگریزی الفاظ کے دو حروف صحیح کے جمگھٹے کی ادائیگی درست اور آسان بنائی جا سکتی ہے۔ جب وہ لفظ کے شروع میں ہوں۔ یعنی الف خاموش بھی رہے اور اپنے بعد آنے والے دو حروف صحیح کے جمگھٹے کے پہلے حرف کی بغیر کسی حرکت کی منت اٹھائے ادائیگی میں معاون ہو۔ ظاہر ہے اگر ایسا ہو تو اُن حروف کے درمیان کسی مداخلت کرنے والی حرکت کی ضرورت بھی نہ رہے۔

میری عربی کی صلاحیت نہایت محدود ہے پھر بھی یہاں ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دیکھوں وہاں کس کس مقام پر خاموش الف کارفرما نظر آتا ہے۔ (یہ کوئی مکمل فہرست نہیں ہے)

عربی میں الف کو ساکن بتایا جاتا ہے۔ مَا اور لَا میں اگر آواز ہے تو وہ زبر (َ) کی ہے، خود الف خاموش ہے۔

جس لفظ (اسم) کے آخری حرف پر دو زبر (ً) ہیں اس کے بعد جو الف آتا ہے پڑھا نہیں جاتا ہے۔ مسجداً، سدّاً (دیوار)۔ مثلاً میں یہ دو زبر (تنوین) لام پر ہیں۔ گو اکثر نظر آئے آخری حرف الف پر۔

ایک اور الف خاموش وہ ہے جو فعل جمع حاضر کے آخیر میں لکھا جاتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا: اِفْعَلُوْا (تم سب مرد یہ کام کرو) لَا تَسْمَعُوْا (تم مت کان دھرو)۔

فعل ماضی میں غائب جمع کے لیے لفظ کے بعد الف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ فَعَلُوا۔ اور یہ الف بھی بے آواز ہوتا ہے۔

ایک اور صورت وہ ہے جو شمسی حروف کے لکھنے میں نظر آتی ہے۔ جہاں ال موجود تو ہوتا ہے پڑھا نہیں جاتا۔

بالکل کا الف آج کل نئے لکھنے والوں کے زیر عتاب ہے حالانکہ اَلکُل کا حصہ ہے (کل کے ساتھ)۔ لفظ سماعت سے ہم واقف ہیں۔ جہاں قرآن مجید میں (سورۃ الجن ۷۲:۱) اَنَّہُ اسْتَمَعَ (یہ کہ وہ۔۔۔ سنا) آتا ہے وہاں بھی دونوں لفظوں کے مابین الف خاموش موجود ہے اور اس کے بعد سین (س) اور تے (ت) کے حروف صحیح کا ایک ساتھ آنا ہے اور اُن حروف کی جدا جدا ادائیگی میں مطلق دقت نہیں ہوتی ہے۔ تَوْبَۃً نَّصُوْحاً کو اردو نے جس طرح اپنایا ہے وہ توبتہ النصوح ہے۔

علامتوں کو اردو خیر باد کہہ چکی ہے۔ اگر نہ کیا ہوتا تو خاموش الف کو سین سے شروع ہونے والے حروف صحیح کے جمگھٹوں کی ادائیگی کا کام سپرد کیا جا

سکتا تھا تا کہ جڑواں مصمتوں کی آوازیں، وہ کسی بھی زبان سے اردو میں آئے ہوں، صحیح طرح ادا ہوسکیں۔۔۔دونوں حروف کی صدا علیحدہ علیحدہ بغیر مابین کے حرف علت کی علت کے۔

یہاں اپنی بات کی تقویت کے لیے ایک حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں:

''اردو کی علمی کتابوں، نیز اعلیٰ سطح کے لیے لکھی گئی درسی کتابوں میں اعراب وعلامات کا استعمال شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن اردو رسمِ خط میں ان کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔''

اردو کی لسانی تشکیل: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

چلتے چلتے آیئے دیکھتے ہیں عربی رسمِ خط جیسی دوسری زبانوں میں ایسے صوتی جھگھٹوں سے شروع ہونے والے ایک نام کو کس طرح لکھا جاتا ہے:

عربی میں Scotland اُسکتلندا ہے، فارسی میں اسکا تلند، موجودہ (لاطینی حروف کی) ترکی نوشت میں Iskocya جس کے حروف کی صوتی ادائیگی کی تفصیل یوں ہے:

i as in feet, S as in Sand, K as in cat, O as in no, C as in chat,y as in you and a as in father

بالترتیب: ای، سین، کاف، او، چے، ی، اَ،

ادارۂ نشریات بزبانھائی خارجی مسکو ۱۹۷۸ء کی کتاب ''مارکسیسم و مسئلہ ملی'' کے مصنف کا نام گو راور صفحۂ اوّل ''پری۔استالین'' چھپا ہے۔موصوف کا نام ان کی تمام تصانیف کے اردو، فارسی ترجمے پر اسی طرح چھپتا تھا۔عربی ترجمہ کبھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

ملیشیا کی زبان ''میلے'' میں بھی ایس کے بعد Ch (یا k کے) کو لانا مشکل تھا انہوں نے اس دِقّت سے نجات پانے کے لیے ایس (s) اور کے (k) کے درمیان intrusive vowel ای (e) کو حائل کیا اور لفظ بن گیا Sekolah۔جس طرح وہاں لکھا اور زبان سے ادا کیا جاتا ہے۔

اگر اردو نوشت کی موجودہ بساط غیر زبانوں کے الفاظ کے صحیح اظہار کے لیے ناکافی ہے بالخصوص وہ جو Consonant Cluster (sp, st وغیرہ) سے شروع ہوتے ہیں تو لکھنے اور زبان سے ادائیگی کا یہ فرق رہے گا اور یہ فرق نظر انداز کیے جانے کے لائق ہے نہ کہ عیب گیری کے۔

ہندی کے صوتیات کے عالموں (بھاشاوگیانوں) نے انگریزی اور اردو، فارسی، عربی سے آنے والے لفظوں کے لیے ہندی لکھائی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔جن نئے حروف کی ضرورت تھی ان کے لیے پرانے حروف/ علامتوں کو نئے سانچوں میں ڈھالا گیا اور وہ رائج ہوئے۔کوما اور ڈوکٹر کو ہندی اسکرپٹ میں لکھنے کے لیے اب صوت کی شکل نہیں بگاڑنی پڑتی، نہ ظفر کو جفر اور قلم کو کلم لکھنا پڑتا ہے۔

اختتام پر میں خاص طور سے ہندی اسکرپٹ میں لائی گئی اُن تبدیلیوں کا ذکر کررہا ہوں جو قرآن مجید کے اصل عربی متن کو ہندی لکھائی میں منتقلی کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

ہندوستان کی ۱۹۴۷ء کے بعد کی نسلوں میں بیشتر وہ ہیں جو اردو اسکرپٹ سے ناواقف ہیں اور انہیں عربی پڑھنے میں وہ آسانی نہیں ہے جو اردو سے واقف لوگوں کو تھی۔ Transliteration لفظوں کو جوں کے توں عربی سے ہندی قالب میں ڈھالنا بغیر موجود ہندی حروف اور علامتوں میں تبدیلی لائے ممکن نہ تھا۔ پہلے جس سہل طریقے سے کا، گا، جا پر ایک نقطے کے اضافے سے ق، غ اور ز کی کمی پوری کی گئی تھی وہ سہولت ث، س، ص، ع، ح اور ہ وغیرہ کے لیے کام میں نہیں آئی۔ ساتھ ہی ایک نئی علامت کی اختراع بھی ضروری تھی۔ پدم شری نند کمار اوستھی کے قرآن مجید کے ترجمے اور عربی متن (Text) کی بعینہٖ ہندی میں نقل دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کتنا بڑا کام مرحوم کر گئے ہیں۔

حوالہ: قرآن شریف، ناشر لکھنؤ کتاب گھر، اس میں ''غور طلب بات'' کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے:

''احقر کی بیس سال کی مسلسل محنت کے حصول میں قرآن شریف کا موجودہ ہندی ایڈیشن سنہ ۱۹۶۹ء میں تیار ہوا تھا۔''

قرآن مجید کے عربی متن کے اس جوں کے توں ہندی لکھائی میں منتقل کرنے میں (نقل نویسی) جو تبدیلیاں کلاسیکل ہندی اسکرپٹ میں لائی گئیں قابل ستائش صد بار ہیں اور اس لائق کہ ہمیں ابھارتی ہیں کہ ہم بھی اردو کلاسیکل نوشت کو موجودہ دور کی ضرورت کے لیے ناکافی سمجھ کر اس میں ضروری اضافے اور ترمیم کریں۔

ان گنت انگریزی الفاظ اردو کا حصہ ہیں، لکھے اور بولے جاتے ہیں اور کتنے ہی دوسری زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ان سب کو اردو نوشت میں قابل عزت جگہ دینا یہ کام ہمارے ذمے عرصہ سے ہے گو اس سے ہم اعراض برتتے رہے ہیں۔

ترکی کو لاطینی (لیٹن) حروف میں منتقل کرنا درست تھا یا نہیں اس سے غرض نہیں ہے اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کام کو بجالانے کے لیے لیٹن حروف میں ترمیم ضروری تھی اور کی گئی۔

ایک ہی لفظ کے جملہ حروف کو ملا کر نہ لکھنے سے کتنے ہی لطیفے وجود میں آئے اور کتنے اردو پڑھنا سیکھنے والوں کو شرمندگی اٹھانی پڑی اور بچوں کو مار۔

ہم غیر زبانوں کے الفاظ، اپنی زبان کا خزانہ ناکافی ہونے کی وجہ سے اپنا تو لیتے ہیں لیکن لگتا ہے ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کرتے۔اس سے کیا غرض کہ دوسری زبان والے اردو، فارسی، عربی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں!

☆

ڈایالیسس (حصہ دوم)

ڈاکٹر فیروز عالم
(امریکہ)

اگر اس بات کی بلاشبہ تشخیص ہوجائے کہ گردے مستقل اور مکمل طور پر ناکارہ ہوچکے ہیں تو مریض کی زندگی جاری رہنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو اسے ایک صحت مند گردے کی پیوندکاری کی جائے جو اسے کوئی قریبی رشتہ دار یا کسی اتفاقی حادثے کا شکار فرد عطیہ کرسکتا ہے یا پھر اسے با قاعدگی سے ڈایالیسس کے ذریعے علاج کی سہولت مہیا کی جائے۔ کسی وجہ سے ڈایالیسس کا نام سنتے ہی مریض اور اسکے لواحقین نہ صرف بہت زیادہ پریشان ہوجاتے ہیں بلکہ وہ ڈایالیسس کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتے ہیں مریض کا یہ ردعمل ترقی یافتہ ممالک میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس مضمون میں ان غلط مفروضوں کا بھی سدباب کیا جائیگا۔

ڈایالیسس کیا ہے؟

ڈایالیسس کے لفظی معنی ''علیحدہ کرنا'' یا جدا کرنا ہے۔ چونکہ گردے کے ناکارہ ہونے کے بعد تمام تر مسائل کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ مریض کے خون میں ایسے مضر مادّے اور نمکیات جمع ہوجاتے ہیں جو انسانی زندگی کے لئے مہلک ہیں اس لئے ڈایالیسس وہ طریقہ علاج ہے جس سے خون سے ان مادّوں کو علیحدہ یا جدا کیا جاسکے۔ یہ مشین کے ذریعہ بھی کیا جاتا ہے اور پیٹ میں ایک پلاسٹک کی نالی ڈال کر محلول کے تبادلے سے بھی۔ اس کی ایجاد اور اسکو عملی طور پر کارآمد بنانے میں تقریباً ایک صدی کی تحقیق اور تجربات شامل ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر تاریخ طب سے گہری دلچسپی ہے مگر یہ موضوع ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ پھر بھی کچھ مختصراً اس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ڈایالیسس کا بنیادی اصول یا کلیہ کیا ہے اسے ہم ایک عام مثال سے سمجھانے کی کوشش کرینگے۔ طبعیات کا اصول ہے کہ اگر دو ایسے محلولوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے جن میں سے ایک میں شکر ہے اور دوسرے میں شکر موجود نہیں اور ان دونوں کو جدا کرنے کے لئے صرف ایک باریک جھلی ہو تو کچھ دیر بعد شکر ایک محلول سے نکل کر دوسرے محلول میں داخل ہوجائیگی تا آنکہ دونوں محلولوں میں شکر کی مقدار یکساں نہ ہوجائے۔ یہ سوچتے ہوئے اس بات کا تصور کیا گیا کہ اگر فاسد خون کو کسی ایسے محلول سے ملایا جائے جو خالص ہو اور جس میں وہ مادّے نہیں تو فاسد مادّے خون سے رس رس کر اس محلول میں شامل ہوجائینگے اور یہ طریقہ بار بار کیا جائے تو خون ان مادّوں سے پاک ہوجائیگا۔

اگرچہ آج ڈایالیسس کی جو ترقی یافتہ شکل ہے اس میں بہت سے لوگوں کا حصہ ہے مگر ہالینڈ کے ڈاکٹر ولیم کولف کو بابائے ڈیالیسس مانا جاتا ہے۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران بڑے دکھ سے یہ مشاہدہ کیا کہ نوجوان سپاہی زخمی ہونے کی وجہ سے گردوں کے فیل ہونے کا شکار ہوجاتے تھے اگرچہ انکے زخم بھرنے اور کچھ ماہ میں انکے صحت یاب ہونے کے بہت اچھے امکانات ہوتے تھے مگر انکے گردوں کی ناکردگی دو سے تین ہفتوں میں انکی موت کا سبب ہوجاتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس عارضی عرصے میں کسی مصنوعی طریقے سے انکے خون کی صفائی کی جاسکے تو انکے گردے اور اسکے ساتھ وہ مریض بھی صحت یاب ہوجائینگے۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ علاج گردے کے دائمی مریضوں کے لئے بھی قابل عمل بنالیا گیا جس میں ڈاکٹر ''سیمی نو'' (cimino) کے فسچولہ اور ڈاکٹر ''سکربنز'' (scribner) کے شنٹ نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ امریکی کانگریس نے ۱۹۷۲ میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ڈایالیسس ایک بیحد مہنگا علاج ہے یہ قانون پاس کیا کہ ہر اس شخص کو جسے ڈیالیسس کی ضرورت ہے حکومت کے خرچے پر ڈیالیسس فراہم کی جائیگی جس سے ڈایالیسس عام ہوئی۔ امریکا میں اس قانون کا اطلاق بلا امتیاز رنگ و نسل، عمر، سماجی مرتبہ اور ملکی شہریت کے کیا جاتا ہے۔ حتی کہ غیر ملکی اور غیر قانونی تارکین وطن کو بھی اسکی سہولت مل جاتی ہے۔ مشین کے ذریعہ خون کی صفائی کو ''ہیمو ڈایالیسس'' (HEMODIALYSIS) اور پیٹ کی جھلی کے ذریعہ اس طریقہ علاج کو ''پیری ٹونیل ڈایالیسس'' (PERITONEAL DIALYSIS) کہتے ہیں۔ چند وجوہات کی بنا پر تمام دنیا میں مشینی طریقہ زیادہ عام ہے۔

ڈایالیسس کا عمل

ڈایالیسس کی مشین میں یوں تو بہت سی گھڑیاں اور ڈائل لگے ہوتے ہیں مگر اس کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ مریض کے جسم کی ایک بڑی رگ سے ایک پمپ کے ذریعہ خون کھینچتی ہے اور اسے ایک خاص آلے سے (جسے ''مصنوعی گردہ'' یا ڈایالائزر کہتے ہیں) گذار کر واپس مریض کے جسم میں لوٹا دیتی ہے۔ ڈائی لائزر میں بال کے برابر لاکھوں نلکیاں ہوتی ہیں جن سے مریض کا خون گذرتا ہے۔ دوسری طرف ایک دوسرا پمپ ایک خاص قسم کے محلول کو کشید کر کے ڈائی لائزر میں خون کی مخالف سمت میں پمپ کرتا ہے۔ جب خون اور یہ محلول ایک دوسرے کے مقابل سے گذرتے ہیں تو صرف ایک بیحد باریک جھلی ان کو جدا کرتی ہے۔ اس دوران خون میں حل شدہ مضر مادّے خون سے رس کر اس محلول میں شامل ہوجاتے ہیں اور صاف خون مریض کے جسم میں واپس داخل ہوجاتا ہے۔ آلودہ محلول زائع کر دیا جاتا ہے۔ باقی گھڑیاں اور ڈائل اس بات کی جانچ کرتے رہتے ہیں کہ اس پورے سسٹم میں ہوا داخل نہ ہو اور کہیں خون کے سرخ ذرّات نہ رسنا شروع ہوجائیں۔ یہ ڈائل مختلف قسم کے پریشر کو بھی مانیٹر کرتے ہیں۔

مریض کی تیاری

گردے کا ماہر طبیب مریض کا ماہانہ معائنہ کرتے ہوئے اس بات کا

اندازہ کر لیتا ہے کہ ڈایالیسس کی ضرورت کب پڑ یگی۔اس سے قبل مریض کو خاص قسم کی غذا تجویز کی جاتی ہے جس میں چند غذائی اجزا جیسے پنیر، دودھ، نمک اور ایسے پھل اور سبزیاں جن میں پوٹاشیم کی زیادتی ہو، کی ممانیت ہوتی ہے۔ پوٹاشیم، کیلے، ٹماٹر، نارنگی اور خربوزے میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ جب گردے کا فعل بہت زیادہ کم ہو جاتا ہے تو جسم خون بنانا بند کر دیتا ہے اور اسکی افزائش دوبارہ جاری کرنے کے لئے ایسے مریضوں کو جو ڈایالیسس کے قریب ہوں ہفتہ وار ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔کوشش کی جاتی ہے کہ اس دور میں بھی مریض تقریباً نارمل صحت میں رہے اور اسکی جسمانی قوت اور توانائی برقرار رہے۔

ہر مریض، حتی کہ امریکہ میں بھی مریضوں کی ایک بڑی تعداد یہ سن کر کہ اب انکی ڈایالیسس شروع ہونے والی ہے بڑی شدت سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ان پر خوف ودہشت، ناامیدی، لاچارگی، جھنجلاہٹ اور غصہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل نارمل ری ایکشن ہے۔ اسکی ایک وجہ تو وہ قدرتی جبلت ہے کہ اس بات سے واقف ہونے کہ باوجود کہ انہیں شروع ہی میں یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ایک دن انکی ڈایالیسس شروع ہوگی ہر مریض اس امید کا دامن نہیں چھوڑتا کہ شاید ہمارے ساتھ ایسا نہ ہو اور کوئی معجزہ ایسا ہو جائے کہ ہمارے گردے خراب ہی صحیح، مگر اس کے باوجود یہ اتنا کام کرتے رہیں کہ ہمیں ڈایالیسس کی ضرورت نہ پڑے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ڈایالیسس سے انکے طرز زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی آجاتی ہے۔ڈایالیسس کے طبیب اور اسکی پوری ٹیم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس مشکل دور میں مریض کو جذباتی سہارا دیں اس کے خوف اور وسوسوں کو سنجیدگی سے سنیں اور مختلف طریقوں اور ذریعوں سے اسکا حوصلہ بڑھائیں اسکے ہر سوال کا صبر اور ہمدردی سے جوب دیں اور اسے ایسے مریضوں سے ملوائیں جو سالوں سے اس طریقہ علاج سے نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ایک با مقصد اور بھرپور زندگی گذار رہے ہیں۔

اے وی فسچولہ A-V Fistula

ڈایالیسس کی تیاری میں سب سے اہم کام ڈایالیسس کے لئے ''ایکسس'' ACCESS قائم کرنا ہے۔ چونکہ ڈایالیسس میں مشین تقریباً چار سو ملی لیٹر خون فی منٹ جسم سے کھینچتی ہے اس لئے جسم کی عام رگیں اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔اس لئے ڈایالیسس سے کئی ماہ پہلے بائیں بازو میں کلائی اور کہنی کے درمیان ایک معمولی سا آپریشن کر کے شریان (سرخ رگ) کو ایک ورید (نیلی رگ) سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اسے ''اے وی فسچولہ'' کہتے ہیں۔اس کی وجہ سے خون شریان سے، جہاں خون بہت پریشر سے گردش کرتا ہے، ورید میں بہنا شروع ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ یہ رگ پھول کر بڑی ہو جاتی ہے۔اس طرح ایک تو اس رگ میں سوئی ڈالنا آسان ہو جاتا ہے دوسرے اس میں خون کا بہاؤ اس قدر تیز ہوتا ہے کہ مشین کی مطلوبہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ کچھ مریضوں میں انکی اپنی رگیں اتنی باریک ہوتی ہیں کہ یہ سرجری ممکن نہیں ہوتی انکے لئے ایک پلاسٹک کی نلی اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی ہے اسے ''اے وی گرافٹ یا شنٹ'' کہتے ہیں۔فسچولہ نسبتاً دیرپا اور بہتر ہوتا ہے۔

اگر صحیح وقت پر یہ ایکسس تیار نہیں کی جائے اور مریض کو فوری ڈایالیسس کی ضرورت پڑ جائے تو ایک دوسرے قسم کی نالی ہنسلی کی ہڈی کے نیچے ایک بڑی رگ میں ڈالنی پڑتی ہے یہ احسن طریقہ نہیں اس لئے مریض کے اپنے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ کئی ماہ پہلے فسچولہ بنوانے کے لئے رضامند ہو جائے۔

ڈایالیسس کلنک

ڈایالیسس کی کلینک ایک بڑی عمارت میں جو اسی مقصد کے لئے تعمیر کی جاتی ہے واقع ہوتی ہے۔اس میں ایک وقت میں بیس سے تیس مریضوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔اسے اسٹیشن کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر ایک ڈایالیسس مشین، پانی کی نلکیاں، ایک آرام دہ کرسی، ٹیلیوژن اور آکسیجن کا بندوبست ہوتا ہے۔ڈایالیسس کا عملہ اور لوگوں کے علاوہ، امراض گردے کے ماہر ڈاکٹر، نرسیں، ٹیکنیشن، سوشل ورکر اور غذائیات کی ماہر خاتون پر مشتمل ہوتا ہے۔اس میں سوشل ورکر اور غذائی ماہر کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔غذائی ماہر مستقل طور پر مریض کی رہنمائی کرتی ہے اور سوشل ورکر مریض کو پیش آنے والے دوسرے مسائل کے حل کے علاوہ اسے نفسیاتی سہارا دیتی ہے۔۔کلنک میں تین شفٹیں ہوتی ہیں اور ہر مریض کو تین سے چار گھنٹے مشینی عمل سے گذرنا ہوتا ہے۔کلنک کا رابطہ گردے کی تبدیلی کے میڈیکل سینٹر سے بھی رہتا ہے کیونکہ ایسے مریض جو بہتر صحت کے حامل ہوں انکے لئے گردے کی تبدیلی ایک بہتر طریقہ علاج ہے۔اسی طرح ڈایالیسس کا عملہ سرجن سے بھی قریبی تعلق رکھتا ہے کیونکہ اگر ڈایالیس کا شنٹ بند ہو جائے تو اسکو فوراً کھولا جاسکے۔غرض یہ ایک کل جماعتی کام ہے جس میں ہر شخص کا رول خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کچھ اہم سوال جو مریض کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔

س۔کیا ڈایالیسس تکلیف دہ عمل ہے۔

ج۔ڈایالیسس بالکل تکلیف دہ عمل نہیں۔ڈایالیسس کے عمل کے دوران زیادہ تر مریض سوتے ہوئے اپنا وقت گذارتے ہیں۔ کچھ مریض کتاب پڑھنے یا ٹیلی وژن دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔میرا ایک مریض مصور تھا اور وہ ان تین گھنٹوں کے دوران اپنی پینٹنگ مکمل کرتا تھا۔

س۔ کیا ڈایالیسس کے دوران کچھ ناپسندیدہ علامات بھی ہوسکتی ہیں

ج۔ جی ہاں۔کچھ مریض ڈایالیسس کے دوران عضلات (پٹھوں) کے تناؤ اور اینٹھن کی شکایت کرتے ہیں یہ بہت تکلیف دہ اور ناگوار تجربہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ گردے کے مریض یا تو بالکل پیشاب خارج نہیں کرتے ہیں یا بہت ہی قلیل مقدار میں خارج کرتے ہیں اسلئے مشین پانی کی مقدار کو اعتدال پر رکھنے کے لئے جسم سے فاضل نمک اور پانی کشید کرتی ہے اور اسکی وجہ سے ہاتھ پیروں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب مریض

ڈیالیسس کے دوران زیادہ پانی پی کر اپنا وزن ضرورت سے زیادہ بڑھا کر آئے۔اگر ڈایالیسس کے درمیانی وقفے میں مریض پانی پینے میں احتیاط کرے اور وزن صرف دو سے ڈھائی کلو تک بڑھے تو یہ علامت نہیں ہوتی۔اس علامت کے ظاہر ہوتے ہی عملہ اسکا آسانی سے تدارک کر لیتا ہے۔اگر اس پر بھی کسی مریض کو بار بار اسکی شکایت ہو تو اسکے وزن کو ایڈجسٹ کرنے کے علاوہ کچھ دوائیں بھی تجویز کی جاسکتی ہیں۔اسکے ساتھ ہی یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ کبھی کبھی ہی ہوتا ہے اور ایک ہفتے کے دوران سو مریضوں میں صرف دو چار ہی اسکی شکایت کرتے ہیں۔

اسکے علاوہ ڈایالیسس کے دوران بلڈ پریشر شدید طور پر کم ہوسکتا ہے اور مریض کو چکر یا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے کی علامات ہوسکتی ہیں۔یہ بھی ضرورت سے زیادہ پانی کشید کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔اسکا بھی فوراً نوٹس لیا جاتا ہے اور اسکا علاج آسانی سے ہوجاتا ہے۔

ایک عام شکایت کچھ مریضوں کو یہ ہوتی ہے کہ ڈایالیسس کے بعد انہیں کمزوری یا تھکن کا احساس ہوتا ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ ڈایالیسس جسم کی کیمیائی ساخت میں ڈرامائی تبدیلی کا سبب ہوتی ہے۔اسکے علاوہ دماغ میں بھی کچھ کیمیائی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ڈایالیسس مشین پانی اور مضر مادّوں کے علاوہ کچھ فائدہ مند حل شدہ مادّے بھی کھینچ لیتی ہے جس کی وجہ سے وقتی طور پر مریض تھکن اور کمزوری محسوس کرتا ہے۔

س۔ ڈایالیسس کا عمل اس قدر طویل اور ہفتے میں کئی بار کیوں ہوتا ہے۔

ج۔ ڈیالیسس ان مریضوں کی کی جاتی ہے جنکے گردے ہمیشہ کے لئے خراب ہوچکے ہوں۔انسانی گردے ہر لمحے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں یعنی دن میں چوبیس گھنٹے اور ہفتے میں ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) گھنٹے۔ڈایالیسس کے علاج کی ہفتے میں صرف ساڑھے تین گھنٹے کی تین نشستیں ہوتی ہیں یعنی ایک سو اڑسٹھ گھنٹے کے مقابلے میں ڈایالیسس کو صرف ساڑھے دس گھنٹے خون صاف کرنے کا موقعہ ملتا۔اس سے ظاہر ہے کہ یہ عمل مریض کے لئے ایک سستا سودا ہے۔پھر بھی کوششیں جاری ہیں کہ اس وقفے کو مزید کم کیا جاسکے۔جب ۱۹۷۰ء میں میں زیر تربیت تھا تو ڈایالیسس کی ایک نشست دس گھنٹے کی ہوتی تھی اب صرف ساڑھے تین گھنٹے کی ہوتی ہے

س۔ پھر لوگ ڈایالیسس سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔

ج۔ یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈایالیسس کے متعلق لوگوں میں معلومات کی بیحد کمی ہے۔دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈیالیسس کے زیادہ تر مریض ایسے ہیں جو گردے کے علاوہ دوسرے خطرناک امراض جیسے ذیابیطس، فالج، دل کی کمزوری اور دوران خون میں رکاوٹ میں مبتلاء ہوتے ہیں اور جب وہ ڈایالیسس کے لئے آتے ہیں تو معذوری اور کمزوری کی حالت میں ہوتے ہیں۔انہیں دیکھ کر ایک عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسکی وجہ ڈایالیسس ہے۔حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈیالیسس کی وجہ سے تو وہ زندہ ہیں ورنہ انکے یہ دیگر امراض ان کے خاتمے کا سبب ہوجاتے۔ایک ایسا فرد جو گردوں کی ناکامی کے علاوہ اچھی جسمانی حالت میں ہو ڈایالیسس پر کئی دہائیاں ایک نارمل اور بامقصد زندگی گذار سکتا ہے۔میرا ایک مریض کالج میں پروفیسر ہے اور دوسرا ایک بنک میں اسسٹنٹ منیجر۔اس مضمون کے شروع میں جس خاتون کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیس سال سے بامقصد زندگی گذار رہی ہے۔شاید ۱۹۹۳ء میں پاکستان سے ایک بہت پڑھا لکھا کنبہ آیا۔چند ہی دن بعد انکا ۲۳ سالہ لڑکا مجھے دکھانے آیا۔اسکو معمولی شکایات تھیں مگر ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ اسکے گردے مستقبل میں بہت جلد خراب ہونے والے ہیں۔میں بہت دکھی ہوا اور بڑی حد تک مجھ میں اسے اور اسکے والدین کو یہ خبر دینے کی ہمت نہ ہوئی مگر بہر حال علاج کے لئے اسے بتانا بھی ضروری تھا۔پڑھی لکھی فیملی تھی انہوں نے اس حقیقت کو قبول کیا اور پابندی سے علاج کروایا۔آج چوبیس سال بعد بھی وہ زندہ ہے اسکی دو پیاری پیاری بچیاں ہیں اور وہ بنک میں کام کر رہا ہے۔اگرچہ اب وہ دوسرے شہر میں ہے مگر اب بھی وہ کبھی کبھی مجھ سے رابطہ کر لیتا ہے۔موجودہ دور میں جن چند طریق علاج کو معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے وہ ڈایالیسس ہے۔

س۔ کیا ڈیالیسس کلنک میں کام کرنے والے عملے کو کوئی خطرہ ہے

ج۔ جی ہاں۔چونکہ ڈایالیسس کے دوران تمام تر واسطہ خون ہی سے ہوتا ہے اور خون کی آلودگی سے کئی قسم کی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں اس لئے عملے کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس کے دوران سوئی چبھنے یا دوسری طرح مریض کے خون سے آلودگی کی صورت میں کارکن کو خطرناک بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔ان میں ہیپاٹائیٹس اور ایڈز شامل ہیں۔یہ امراض مریضوں کو بھی لگ سکتے ہیں۔اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلینک میں سخت ترین حفاظتی اقدامات کئے جاتے ہیں مگر اسکی صحیح روک تھام انفرادی طور پر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے۔

س۔ کیا فسچولہ یا شنٹ تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

ج۔ شنٹ یا فسچولہ کی سرجری بہت معمولی ہے۔جب یہ مکمل طور پر ٹھیک ہوجاتا ہے تو اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ڈایالیسس شروع ہونے پر اس میں سوئی داخل کرنے پر معمولی تکلیف ہوتی ہے جسے تقریباً سب ہی مریض آرام سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن اگر یہ تکلیف بھی قابل قبول نہ ہو تو جلد پر کریم لگا کر یا اس میں سن کرنے والی دوا سے کام لیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ اس میں کوئی مسئلہ نہیں سوائے اس کے کہ مریض کو اسمیں سے ایک مشینی قسم کی گھر گھر کی آواز آتی ہے مگر اس کا کوئی نقصان نہیں بلکہ یہ اسکی علامت ہے کہ فسچولہ صحیح کام کر رہا ہے۔

آخیر میں یہ کہ اگرچہ ڈایالیسس مریض کی زندگی میں ایک ڈرامائی تبدیلی کا سبب ہوتی ہے مگر اس کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ زندگی کا تحفہ لیکر آتی ہے ہفتے میں تین دفعہ ڈایالیسس کلنک میں حاضر ہونا مہنگا سودا نہیں۔

☆

''ضربِ قلم''

زنجیر ہے پیروں میں

(وطنِ عزیز کی معروضی صورتِ حال پر)

یونس شرر
(نیویارک)

اب کون کرے گا جاں، اس دل کی مسیحائی
روشن ہے سرِ بالیں، اک عمر کی تنہائی

ہے چاک بہت سینہ مہلت نہ کرفو کی ہے
جو آنکھ سے ٹپکے ہے وہ بوند لہُو کی ہے
بہتی ہوئی آنکھوں سے، یہ آگ کھُو کی ہے
میخانے سے گلیوں تک، خواہش یہ سبُو کی ہے

اس صحنِ گلستاں میں، پھر فصلِ سکوں آئے
کچھ شورِ عنادل ہو، موسم پہ جنوں آئے

مہکیں یہ گلی گوچے، مستی میں ہوا بھی ہو
ترے حسن کے چرچے ہوں، کچھ تجھ سے گلہ بھی ہو
سرکش سی ہوائیں ہوں، مرنے کا مزا بھی ہو
مقتل سے گزرنے کی پہلی سی فضا بھی ہو

لب بستہ فضاؤں میں، اس دل کی گرہ کھولیں
منہ بند شگوفوں سے ہم راز ہوں، کچھ بولیں

ترا عکس رخِ جاناں، جب آئینہ رُو ہو گا
ہر مئے کے پیالے میں اس دل کا لہُو ہو گا

اس دل کے لہُو سے ہی خلقت کا وضو ہوگا
دامانِ سیہ کاراں ، خنجر بہ گلُو ہوگا

جب رزق کے زندانی اس قید سے چھوٹے گے
مظلوم جھپٹ کر پھر ظالم ہی پہ ٹوٹیں گے
مسند کے مجاور سے زر و مال بھی لوٹیں گے
یہ پیر کے چھالے ہیں آخر کو تو پھوٹیں گے

شوریدہ سروں کے پھر انبار لگے ہوں گے
گمنام سی قبروں پر، کچھ پھول چڑھے ہوں گے

پھر بہرِ سماعت یہ دربار رجوع ہوگا
تائید ستم کا یوں بازار شروع ہوگا
اس دردِ وضو سے ہی سجدہ و رکوع ہوگا
ہم خاک نشینوں کا انجام طلوع ہوگا

اِک آگ ہے سینہ میں، شمشیر بکف چاہیے
زنجیر ہے پیروں میں، زنجیر بکف چاہیے

تعزیرِ سیاست کے، سب رنگ جدا ہوں گے
سرِ شاخِ چمن کچھ گل مصروفِ دعا ہوں گے
اس دید و طلب میں ہم، پھر حرفِ ہوا ہوں گے
دن بھر کی نمازوں کے سجدے بھی ادا ہوں گے

منصف کو خیر تو ہو، لفظوں کا بھرم کیا ہے
حاکم پہ اثر تو ہو، یہ ضربِ قلم کیا ہے

○

عبدالوہاب البیاتی کے ساتھ ایک شام

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

ہر گلی کوچے میں لاش اپنی اٹھائے
رات آتے ہی کسی اک بالاخانے پر
جہاں سائے
برہنہ تن کو ڈھانپے ناچتے ہیں
یا کہیں اک پارک میں
یا پھر کسی نکڑ پہ واقع
قہوہ خانے کے دھوئیں میں
دفن کر آتے ہو خود کو
اپنے چہرے کو چھپائے
شرم کے مارے
خدا اور عائشہ و لارا و عِشتار سے

سلسلہ یہ عشق کا
لاانتہا
کوئی آتا ہے مگر
ہر بار جانے کے لئے

ہے کدھر راہِ نجات
طٰہٰ اور یٰسین کے دکھ کی امیں
الطّواسینِ گنہ گارانِ ہست و بودِ ذات
قرض تھا حلاج پر کیا تیغِ خوں آشام کا؟
دردِ دل کیا جانہ پائے گا کبھی خیام کا؟
راز کیا اب بھی ہے پوشیدہ ابوتمّام کا؟
کون جانے گا غمِ حاوی خلیل
ہانپتا صحرا ہے اور دریائے نیل

○

الطّواسین۔ منصور حلاج کی تصنیف، خیام (وفات: ۱۱۲۳)۔ فارسی زبان کا مشہور شاعر، ریاضی داں، اور ماہر فلکیات، خلیل حاوی (۱۹۲۵۔۱۹۸۲) عربی زبان کا ممتاز شاعر جس نے لبنان پر اسرائیلی حملے کے بعد خودکشی کر لی۔ ابوتمّام (۷۸۸ ۔ ۸۴۶)۔ عباسی عہد کا عظیم شاعرِ عشتار۔ بابلی اساطیر میں عشق اور زرخیزی کی دیوی عائشہ اور لارا۔ عبدالوہاب البیاتی کی نظموں کے دو نسوانی کردار۔

احسنِ تقویم

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

جنت میں ٹھکانہ تھا جس کا وہ ذرۂ خاکی میں ہی ہوں
کیا شان تھی میرے باوا کی، میں کس عالم سے آیا ہوں

مسجود ملائک میں ہی تھا، مخلوقِ جہاں کا رہبر تھا
جس شان سے مجھ میں روح پھونکی، اس شان کا وارث میں ہی ہوں

جنت کے پہلے مکینوں سے سردارِ ملائک ملتا تھا
جس خاک سے وہ ملعون ہوا، اس خاک کا پُتلا میں ہی ہوں

ملعون میرا حاسد ٹھہرا اور کان میں اک سرگوشی کی
دھوکے سے نکالا اُس نے جسے وہ آدمِ خاکی میں ہی ہوں

مخلوقِ جہاں میں افضل تر، تقویم میں احسن میں ٹھہرا
سب کام کٹھن جس کو سونپے وہ بندۂ عاجز میں ہی ہوں

جو کام و فرائض مجھ کو ملے آسان نہیں کرنا ہر دم
پر بن دیکھے اس جنت کا سنسار میں داعی میں ہی ہوں

یہ رب کی عنایت ہو گی اگر میں پار کروں دشوار سفر
وہ راہ کہ جس کے بدلے میں جنت کا طالب میں ہی ہوں

گر پہنچ گیا پھر جنت میں تو کیا کہنے اے روحِ ریاضؔ
جس عہدِ الست[1] کا پاس کیا اس عہد کا وارث میں ہی ہوں

○

۱۔ (الاعراف: ۱۷۲) عالمِ ارواح میں خالقِ کائنات نے جملہ اولادِ آدم سے ''عہدِ الست'' لیا اور فرمایا ''کیا میں تمہارا رب نہیں؟'' سب نے عرض کیا ''ہاں۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں'' چنانچہ ہر انسان کی سرشت میں اللہ کے وجود کا احساس اور اقرار موجود ہے۔

روشنی کا سفر

پرویز شہریار
(دہلی، بھارت)

تم نہیں سمجھو گی
تم کیا جانو!
باجرے کے دانے شیشی میں جب بھرنے لگتے ہیں
بوجھل ہو کے عجب آہنگ سے وہ بجنے لگتے ہیں
اُس ساعت، مرد کی کیفیت
اُس سانپ کی سی ہو جاتی ہے
جو اپنی کینچلی اُتارنے کی خاطر
خود کو تنگ پتھریلی راہوں سے گزارتا ہے
خاردار جھاڑیوں سے اُلجھتا ہے
بدن پر جا بجا خراشیں پڑ جاتی ہیں
حتیٰ کہ جسم پر نیل کے دھبّے سے پڑنے لگتے ہیں
تب کہیں جا کے
اپنی کینچلی اُتارنے میں وہ کامیاب ہو پاتا ہے
نیم خوابیدہ نیم بیدار
حواس کے سہارے
تاریک سرنگوں سے گزرنا
جس کے اختتام پر روشنی کی کرنیں ہوں رقصاں
کتنا انبساط انگیز ہوتا ہے وہ لمحہ
کتنا جاں فزا ہوتا ہے وہ سماں
تم کیا جانو!

تنگ پتھریلی راہوں سے دیوانہ وار گزرنے کا کرب
خاردار جھاڑیوں سے مجذوبانہ اُلجھنے کا حظ
بدن پر جا بجا خراشیں پڑ جانے کا مستانہ درد
تم نہیں سمجھو گی

کہتے ہیں
مرد اور گھوڑے
کبھی ہوتے نہیں بوڑھے
گھوڑا کتنا بھی کبر سنی کو پہنچ جائے
ہنہنانا تا ضرور ہے
مرد بھی اپنے ہمزاد کی افزائش کا بہانہ
بنا تا ضرور ہے
لیکن تم کیا جانو یہ سب!
کہتے ہیں تخریب میں ہیں پوشیدہ تعمیر کے مراحل
اماوس میں نہاں ہوتے ہیں
پورنیماشی کے منازل
تخلیق کے کرب بنا ممکن نہیں
روشنی کا سفر
لیکن یہ سب تم نہیں سمجھو گی
تم کیا جانو!

○

''دسمبر''

شگفتہ نازلی (لاہور)

کہیں کیا تم کو۔۔۔
تم تو اجنبی بن کے۔۔۔
ہوئے جاتے ہو اب رخصت۔۔۔
کہا بھی کچھ تو کیا ہوگا۔۔۔
کہ وہ وقت وداع ہوگا۔۔۔
کہی بھی اَن کہی ہوگی، سُنی بھی اَن سُنی ہوگی۔۔۔
فقط بیتے لمحوں کی سرسراہٹ پتوں سی ہوگی۔۔۔
اُنہی لمحوں کے دھاگے میں پروئی یادوں کی جھلمل۔۔۔
عجب نمناک سی مسکاں ہو جیسے۔۔۔
کہیں پیچھے کی جانب لے چلے گی۔۔۔
مگر کوئی سرا پائیں تو کیسے۔۔۔
تو پھر اگلے برس آؤ تو ڈھونڈیں۔۔۔
کوئی تو سلسلہ ہم پھر سے کھوجیں۔۔۔!

○

اندیشہ

تسنیم کوثر (لاہور)

ہمیں تم سے ملے اب تو نجانے کتنے جگ بیتے
تمہیں بھی گردشِ حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا
کئی چہرے دلِ نازک پہ اپنوں سے لگے ہوں گے
وفا کی راہ میں شاید کئی دھوکے ملے ہوں گے
لکیروں نے عجب اک جال چہرے پر بنا ہوگا
زمانے بھر کی فکروں نے تمہیں کمھلا دیا ہوگا
تمہاری سرمئی آنکھوں پہ اب عینک دھری ہوگی
میری تصویر بھی تو اس میں دھندلی پڑ گئی ہوگی
اچانک آئینے میں جب سے میں نے خود کو دیکھا ہے
اسی پل سے یہ اندیشہ سا میرے دل میں اٹکا ہے
تمہیں بھی گردشِ حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا

○

دوہے

سیفی سرونجی
(بھارت)

اس کا ارادہ نیک ہے اس کا منشا ٹھیک
مرجائے جو بھوک سے مانگے کبھی نہ بھیک

ہر دم تیری یاد ہے ہر دم تیری کھوج
دانا پانی کچھ نہیں نہ ہے کوئی بھوج

نفرت مہکے شہر میں نکلا گھر سے آج
گلیوں گلیوں ہر جگہ سر پر رکھے تاج

جب بھی آیا وہ ادھر گلشن میں ہر بار
خوشبو پھیلی ہر جگہ بکھرے رنگ ہزار

بخشی تو نے اے خدا مجھکو وہ رفتار
کاغذ کی میں ناؤ لئے کرلوں دریا پار

○

شام ہوگئی ہے

جاوید صدیق بھٹی (لاہور)

یادوں کے سرد لمحے
دل کو جلا رہے ہیں
جھرنوں کے تیز ریلے
طوفاں اُٹھا رہے ہیں
برہا کی تیز آندھی
محشر اُٹھا رہی ہے
جینے کی ساری کوشش
ناکام ہوگئی ہے
راہی ہے جنگلوں میں
اور شام ہوگئی ہے

○

''زندہ باد اے وطن''

مشاہد حسین ہاشمی
(میر پور، آزاد کشمیر)

۱۹۴۷ء میں جب دیگر مہاجرین سرزمینِ پاک کا رخ کر رہے تھے تب ایک انیس سالہ نوجوان امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آیا۔ یہ نوجوان ادبی حلقوں میں مقبول ہو رہا تھا اور شعری دنیا میں اسے وقعت بھی حاصل ہو رہی تھی۔ مشاعروں میں اس کی موجودگی کو جزوِ لاینفک سمجھا جاتا اور گل دستۂ دادو تحسین بھی پیش کیا جاتا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک کا دور اس کی شاعری کا دورِ اقتدار تھا۔ اس وقت کے بڑے شاعروں امین گیلانی، لطیف خلیل، ظہیر کاشمیری اور احمد راہی سے اس نوجوان شاعر کے مراسم تھے۔ جس جذبے نے اسے پاکستان ہجرت پر مجبور کیا، اسی جذبے نے اس سے پاکستان کا قومی ترانہ بھی لکھوایا مگر اس وقت کی حکومتِ پاکستان کے منظورِ نظر نہ ہو سکا۔ فلمی دنیا میں بھی اس شاعر کو عروج حاصل تھا اور اس دور کی فلموں کے گیت اس کی شاعری کے بغیر بے ہنگم تصور کیے جاتے تھے۔ شومیِ تقدیر کہ وقت کے تاریک لمحوں کو اس کی خوشی ایک آنکھ نہ بھائی اور اس کی دوستی ایک ایسے فوٹو گرافر سے ہو گئی جس کی فطرتِ ثانیہ چرس اور افیون کا استعمال تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ ''صحبتِ صالح ترا صالح کند، صحبتِ طالح ترا طالح کند'' اردو شاعری کا ایک درخشندہ ستارہ جس کا نام ساغر صدیقی تھا، چمکنے کے بجائے قعرِ مذلت میں گرتا چلا گیا اور اپنی شعری صلاحیتوں کو کسی قدر ماؤف کر لیا۔

مرورِ ایام کے ساتھ ساغر کی وقعت کم ہوتی گئی اور وہ اپنے آپ کو سمیٹتا چلا گیا۔ وہ افیون کا استعمال کرنے لگا تھا اور اس کا ٹھکانا حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے متصل سڑکوں پر ہم مشرب دوستوں کی محفل ہوا کرتا تھا۔ معاشی حالت ابتر ہو گئی اور نکبت نے چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔ اب ساغر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ ایسے میں اردو کے کچھ نام نہاد اور ضمیر فروش شعرا چند چونیوں، انجکشنوں اور دیسی شراب کی ایک آدھ بوتل کے عوض اس کی گراں قدر غزلیں خریدتے، مشاعرے پڑھتے اور قبولِ عام حاصل کرتے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ساغر اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانا چاہتا تھا مگر زندگی کی رنگینیاں اس سے بھاگتی رہیں۔

یہاں ساغر کے اس کردار کا تذکرہ مقصود ہے جس پر آج بھی روحِ ساغر جھوم رہی ہو گی۔ بدن پر چیتھڑے اوڑھے ساغر صدیقی سے ہر گز یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اُس نے وطنِ عزیز کی محبت و مودت میں اوجِ کمال حاصل کر لیا ہے۔ ایک صاحبِ عقل یہ جان کر حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ایک پراگندہ شخص جو دنیا کی لطافتوں سے گریزاں ہے، وہ وطنِ عزیز پاکستان کے لئے ایک لطیف جذبہ رکھتا ہے۔ ساغر کی نظم ''میرے وطن'' خصوصی طور پر پاکستان کے ساتھ اس کی الفت اور لگاوٹ کی ترجمان ہے۔

جانِ فردوس ہیں تیرے کوہ و دمن
زندہ باد اے وطن! زندہ باد اے وطن
تجھ پہ صدقے ہے تن، تجھ پہ قرباں ہے من
زندہ باد اے وطن! زندہ باد اے وطن
تیرے کانٹے بھی ہیں مجھ کو غنچۂ دہن
زندہ باد اے وطن! زندہ باد اے وطن

اس نظم میں ساغر ارضِ پاک کی خوب صورت منظر کشی کرتے ہوئے اس کے دریاؤں، وادیوں، دیہاتوں اور شہروں کی تزئین و آرائش کا جائزہ اپنے قلم سے لیتا ہے۔ ساغر صحابہ و صوفیہ کرام کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی تقلید کا درس دیتا ہے اور سرزمینِ پاک میں اسلامی روایات کا نفاذ چاہتا ہے۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں شہادت اور ۱۹۵۷ء میں نشانِ حیدر حاصل کرنے والے کیپٹن سرور شہید کے اس ناقابلِ فراموش کارنامے پر ساغر نے ''سرور شہید'' کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں شہید کے مرقدِ انور کا بے مثال نقشہ کھینچا ہے۔

جگمگاتی ہے تقدس کی بہار
دیکھتا کیا ہوں فرشتوں کی قطار
یک بیک اک قبر پر آ کر رکے
فاتحہ پڑھنے کو تعظیماً جھکے
آسمانوں سے مجھے آئی نوید
زندہ باد اے مدفنِ سرور شہید

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بزدل دشمن نے اپنی بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے شب خون مارا تو پوری پاکستانی قوم نے یک جہت اور یک زبان ہو کر دشمن کی للکار کا بھرپور جواب دیا۔ تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنی اپنی بساط کے مطابق پاکستان سے محبت کا ثبوت دیا۔ گلوکاروں نے جہاں پاک فوج کے بہادر جوانوں کا لہو گرمایا، وہاں شعرا اور ادبا نے اپنی قلم کی رَو سے انھیں جنت کی سیر کروائی۔ شعرا میں جہاں احمد ندیم قاسمی، مسرور انور، صوفی تبسم، ناصر کاظمی، رئیس امروہوی اور جمیل الدین عالی اپنی خدمات پیش کر رہے تھے تو ایسے میں ساغر کہاں پیچھے رہ سکتا تھا، چناں چہ ساغر نے بھی پاک فوج کی عظمت کو سلام پیش کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی اور اپنی شاعری کو ان کے تذکروں سے مزیّن کیا۔

جیو سرفروشو! جیو جاں نثارو
جبینِ وطن کے چمکتے ستارو

ملی ہے تمہیں شہرتِ جاودانہ
شجاعت کی دنیا میں تم ہو یگانہ
روایاتِ اسلام کے شاہ پارو
جیو سرفروشو! جیو جاں نثارو
وطن کی حقیقت کے پروردگارو
جیو سرفروشو! جیو جاں نثارو

ساغرؔ نے پاک فوج کے شیر دل جوانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کرتے ہوئے مختلف تلمیحات کا سہارا لیا۔اس نے جا بہ جا اپنی شاعری میں توحید و رسالت، صحابہ کرام اور معروف مسلم فاتحین کا ذکر کر کے برسرِ پیکار پاک فوج کے مجاہدین کو اسلام کی تاب ناک رفعتوں کی ضَو سے نوازا۔

انتخابِ آرزو ہیں فتح و نصرت کے چراغ
ہیں فروزاں خونِ دل سے ملک و ملت کے چراغ
پھر بنامِ طارق و خالد ذرا روشن کریں
ظلمتوں کی آندھیوں میں عزم و ہمت کے چراغ

ساغرؔ نے محض پاک فوج کے نڈر جوانوں کی حوصلہ افزائی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شہادت کے رتبۂ جلیل پر متمکن ہونے والے شہدا کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا جو پاکستان کی ادبی تاریخ کے صفحات پر تا ابد جلی حروف سے لکھا جاتا رہے گا۔جنگِ ستمبر کے ہیرو عزیز بھٹی کی شہادت کے موقع پر ساغر نے ایک نظم شہید کے بیٹے کی شانِ فرزندی کی نذر کی۔

پھول گلشن میں کھلیں تیری لطافت کے لئے
مسکرائے چاندنی تیری محبت کے لئے
اے کہ فرزندِ شجاعت، غنچۂ فصلِ بہار
تیرے ہونٹوں کی ہنسی محسن ہو فطرت کے لئے

میجر عزیز بھٹی شہید کی قربانی بلاشبہ تاریخِ پاکستان کا نا قابلِ فراموش واقعہ ہے جس نے رہتی دنیا تک پاک فوج کی شجاعت اور سطوت کے جھنڈے گاڑ دیے۔اب ساغرؔ جیسا محبِ وطن کیوں کر عزیز بھٹی شہید کو ہدیۂ عقیدت پیش کیے بغیر رہتا؟ ساغرؔ نے اپنی قلمی لطافت سے شہید کی تربت کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ شہید بھی عش عش کر اٹھیں ہوں گے۔

یہ مزارِ عزیز بھٹی ہے
اس پہ رحمت سدا برستی ہے
ذرہ ذرہ ہے سجدہ گاہِ وفا
خاک مرقد تجلیوں کی ردا
حور و غلماں دعائیں پڑھتے ہیں
باغِ جنت کے پھول چڑھتے ہیں

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے وہ گم نام شہدا جنھوں نے سرحدِ پر وطنِ عزیز کے ایک ایک انچ کے تحفظ کے لئے اپنی جان دینے سے گریز نہ کیا، ساغرؔ پوری توانائی کے ساتھ ان کی اس عظیم قربانی کا پرچار کرتا نظر آتا ہے۔

چھ ستمبر کے شہید/ فتح و نصرت کی نوید/ پردۂ عثمان تم/ تم عمر کا ولولہ/ اور علی کا غلغلہ/ تم ہو شمشیرِ حسین/ تم ہو تفسیرِ حسین/ راستے فردوس کے/ تم نے روشن کر دیے

یوں تو ساغرؔ کی دنیا لاہور کی سڑکوں، کسی چائے والے کی گرم انگیٹھی یا نشہ کرنے والوں کے جم گھٹوں پر مشتمل تھی مگر ساغرؔ کی شخصیت کے گرد پاکستان سے محبت کا ہالہ تھا۔جب پاکستان کے قیام کو تیئیس سال مکمل ہوئے تب ساغرؔ نے ایک نظم ''پاکستان کے تیئیس سال'' لکھی، جس میں اس نے اپنی روح کے تپیدہ جذبات کا اظہار کیا۔ان جذبات میں یاس و حرمان کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

بیت چکے ہیں تیئیس سال
گونگا ماضی اندھا حال
اجڑے پنچھی ٹوٹی ڈال
پھیلے ہیں انجانے جال
بیت چکے ہیں تیئیس سال
عزم سے خالی ہے دستور
جہد و عمل کی منزل دور
شمعِ قیادت ہے بے نور
گلشن میں پھولوں کا کال
بیت چکے ہیں تیئیس سال

عمومی طور پر مرفوع القلم تصور کیے گئے ساغرؔ کے قالب میں جب تک روح رہی تب تک اس کا جسم پاکستان کی محبت میں تڑپتا رہا۔یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی رعنائیوں نے ساغرؔ سے منہ موڑے رکھا مگر اس نے اپنی ذات تسخیر کر لی تھی۔امارت و شہرت ساغرؔ کو مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔دنیا کی ہنگامہ پرور مصروفیات سے کنارہ کشی نے ساغرؔ میں انانیت کوٹ کوٹ کے بھر دی تھی کہ اسے اسلام اور پاکستان کے بعد ہر چیز ہیچ معلوم ہونے لگی۔زندگی کی حقیقت کو پا لینے اور وطن سے محبت کے جذبے کو اوجِ کمال تک پہنچانے کے بعد ساغرؔ نے ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں اور ملکِ عدم کا راہی ہوا۔میں سمجھتا ہوں کہ ساغرؔ کی روح عالمِ برزخ میں اترائی پھر رہی ہوگی کیوں کہ ساغرؔ ان لوگوں جیسا نہیں جنھوں نے چند ڈالروں اور شہرت کی خاطر وطنِ عزیز کی عزت داؤ پر لگا دی بل کہ زچ ہونے کے باوجود ساغرؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے پاکستان سے محبت کا مسلم ثبوت دیا۔میانی صاحب قبرستان میں ساغرؔ کا مرقد فاتحہ خوانی کا مستحق ہے۔

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

قلب ماہیت کا اسرار

پروفیسر آصف ہمایوں
(لاہور)

قدیم ادب کی تاریخ میں قلب ماہیت کی اولین مثال دیوتاؤں کی قلب ماہیت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ سومیری اساطیری ادب جو قریباً ڈھائی ہزار سے چار ہزار سال قبل مسیح کے عرصے پر محیط ہے۔ دیوتاؤں کی قلب ماہیت کی مثالیں ہمارے سامنے لاتا ہے۔ یوں قصہ کہانی میں انسانوں کی قلب ماہیت کی تاریخ بہت بعد میں رقم ہوئی۔

موجودہ صدی میں غیر ملکی زبانوں کے ادب میں ''نظریہ وجودیت'' سے متاثر تحریروں میں بھی ہمیں قلب ماہیت سے متعلق موضوعات ملتے ہیں۔ سامنے کی مثال فرانز کافکا کی Metrmorphosis ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں افسانے کے پس منظر میں ''قلب ماہیت'' کی نمایاں مثال انتظار حسین کے افسانوں کے کردار ہیں۔ انتظار حسین کے بہت سے افسانے جو بقول ڈاکٹر انوار احمد اساطیری اور داستانوی پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ اشرافیہ کو ارزل میں بدلتے اور اسے بتدریج کمزور ہوتا دکھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر انتظار حسین کی کتاب ''آخری آدمی'' میں ''زرد کتا''، ''کایا کلپ'' اور ''سوئیاں'' ایسے افسانے ہیں جن میں اشرف کو ارزل بننے، آئینے سے ڈرنے اور جانوروں کی سطح پر اترنے والے ہجوم میں انسانیت کی کمزور پڑتی پکار کو دکھایا گیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

''الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔'' (آخری آدمی ___ صفحہ:۸)

''مجھے مہکتے ہوئے مزعفر اور صندل کی تختی اور گول پیالے کا خیال ستانے لگتا ہے اور زرد کتا کہتا ہے کہ جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے۔'' (زرد کتا ___ صفحہ:۳۴)

''اس نے قلعہ کی اونچی فصیلوں کو دیکھا، اپنے ضعف و ناتوانی پر غور کیا۔ دیو کی گھن گرج کو دھیان میں لایا اور اس کا دل اندر پنکھے کی مثال ہلنے لگا تو پھر بالکل مکھی بن جا کہ نہ قلعہ کوئی معنی رکھے نہ دیو کا کوئی خوف رہے کہ دیو مکھیوں سے خوف محسوس نہیں کرتے۔'' (کایا کلپ ___ صفحہ:۱۰۰) [اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، ڈاکٹر انوار احمد ص:۴۱۳]

جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں بھی قلب ماہیت ایک موضوع ہے اور میں قدرے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انتظار حسین کے بعد جمیل نے ہی اس موضوع کی جامعیت کو صحیح طور پر محسوس کیا ہے۔ ماہیت کی تبدیلی جسمانی اور فکری دونوں سطح پر ممکن ہے۔ اگر ہم دیومالائی طرز کی کہانیوں پر ایک نظر ڈالیں تو ہمارے لیے یہ جاننا چنداں مشکل نہیں کہ ان کہانیوں کے کئی کردار شہزادے اور شہزادیاں محض جنوں اور دیوؤں کے جادو کے اثر سے ہی اپنی ماہیت تبدیل کر لیتے ہیں۔ ان قصوں میں جادو کے اثرات کے برعکس پیر کہنہ سال کی روحانی قوت ان شہزادے اور شہزادیوں کو جو کم تر زندگی میں یا پتھروں میں تبدیل ہو چکے ہیں واپس اپنی اصلی حالت میں لے آتی ہے۔ دیومالائی طرز کے ان قصے کہانیوں میں نیکی اور بدی کی قوتوں کا آپس میں برسرپیکار رہنا اور اس کے نتیجے میں بدی کی قوت کے غالب آنے یا شکست کھانے کی صورت میں کہانی کے بعض کرداروں کا پہلے اپنی اصلی صورت کھو دینا اور بعد ازاں اپنی اصل صورت اختیار کرنا دراصل ایک جسمانی سطح کا عمل اور ردعمل ہے۔ فکری سطح پر ماہیت کے تبدیل ہونے کی شاید دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کی فکر کم تر زندگی جیسے: بکھی، مچھر، بندر، کنکھجورے وغیرہ کی فکر یا جبلت کی سطح پر آ ٹھہرے۔ دوسرے یہ کہ انسان اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے اپنے قلب کو کم تر زندگی کے قالب میں ڈھلتا ہوا محسوس کرے۔ بہت سے فلسفے قالب کی تبدیلی کی ان تینوں صورتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں مقصود ان فلسفوں پر گفتگو نہیں۔ لہٰذا مثال کے لیے دو ایک کا حوالہ دینا ہی کافی ہے۔ اس ضمن میں آسمانی اور الوہی کتابوں کے مطابق انسان افضل بھی ہے اور خسارے میں بھی۔ ہندو فلسفہ اواگون کے مطابق زندگی اپنے اعمال کے مطابق اپنے اگلے جنم میں اپنی ماہیت تبدیل کرتی یا اختیار کرتی ہے۔ ڈارون کے فلسفہ حیاتیات کے مطابق زندگی اپنی زیریں سطح سے اپنی بالائی سطح کی طرف ارتقاپذیر ہے۔

جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں قلب ماہیت کا موضوع مندرجہ بالا رجحانات اور فلسفوں کے Antithesis, Thesis اور Synthesis کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ آیئے جمیل احمد عدیل کے افسانے ''تارعنکبوت'' میں ایک مکھی کی دوسری مکھی سے ہونے والی گفتگو سنتے ہیں:

''لیکن میرے غلیظ وجود کے اندر ابھی بھی انسان موجود ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اتنے بڑے جثے کو ایک ننھی منی مکھی کے وجود میں مقید کر دیا گیا ہے۔ جہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں ان مکروہ پروں کو توڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہوں مگر یہ پر اتنے مضبوط ہیں کہ میرے اندر کا انسان اس حصار کو توڑ نہیں سکتا''۔

دیکھیے کتنا جاندار مکالمہ ہے۔ مشاہدہ کی آنکھ نے قلب ماہیت کو وہ شکل عطا کی ہے کہ جس میں کم تر زندگی اپنے برتر حوالے سے تاحال آزاد نہیں۔ کم تر وجود اپنے کم تر منصب کے باوجود اپنے برتر حوالے کو ایک محدود میں مقید دیکھ کر اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اپنے اندر اپنے برتر حوالے کی آزادی کا خواہاں ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ جمیل لفظوں کی کاریگری سے زندگی کی شکلیں بدل بدل کر دیکھنے کی مشقت کیوں کر رہا ہے؟ یہ بھی نہیں کہ وہ زندگی کو لفظوں کی ٹیلی سکوپ سے محض چھوٹا یا بڑا کر کے دیکھے کہ جس عمل کی مثال ہمیں "Jonathan Swift" کی طنز سے بھرپور شہرہ آفاق تصنیف Guliver's Travels میں ملتی ہے۔ جس میں Guliver Swift کو کبھی انگوٹھے کے برابر قد والے بالشتیوں

کے ملک Lilliput میں گھومتا پھرتا دکھاتا ہے اور کبھی ریاست Broboing nag میں کہ جہاں خود Guliver اپنے آپ کو بلند قامت لوگوں میں ایک بالشتیہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور ادھر ہم جب ''موم کی مریم'' کے مصنف کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں زندگی کو اس کے قد کاٹھ کے علاوہ اس کی شکلیں بدلتے ہوئے بھی دیکھتا نظر آتا ہے۔ میں آپ کو اس کے افسانہ ''سیاہ پہاڑ'' کی چند لائنیں سناتا ہوں:

''ہم سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ لیکن ہم دوست بھی ہیں کیونکہ ہم سب ایک جیسے ہیں۔ ہم سب کے چہرے مسخ ہو چکے ہیں۔ ہمارے وجود انسانوں کے سے نہیں رہے۔ مگر ہم انسان ہیں۔ یہ دیکھو! ایک نے ان میں سے اپنی قبا اٹھائی اس کے باریک قیمتی لباس میں ایک سیاہ رنگ کے کتے کا جسم تھا''۔

''افسانہ ''زیرآب'' سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سانپ، شیر، بھیڑیے آزادانہ گھوم رہے تھے کہ بعض بچے سانپوں کے مونہوں میں ہاتھ دیے ہوئے تھے اور بعض لڑکیاں بے خطر شیروں کے دانت گن رہی تھیں۔ بھیڑیے بکریوں کی حفاظت پر مامور تھے۔''

پھر ایک جگہ یہ منظر سامنے آتا ہے:

''ایک بہت بڑا گدھا تیز تیز چلتا ہوا غیظ وغضب میں اپنی سانسوں کے ساتھ شعلے اور دھواں پھینکتا ہوا پاس سے گزر رہا تھا۔'' (زیرآب)

اور پھر ایک اور منظر:

ہنسنے والوں کی موجودگی کی وجہ سے تعفن کا احساس ہو رہا تھا اور وہ تکلم کرتے تو مینڈکوں کی مانند جانوران کے منہ سے جھڑتے''۔ (زیرآب)

آپ نے دیکھا افسانہ نگار کو انسان کتے، چوہے، مینڈک، چھپکلی، مچھر، سانپ، کنکھجورے، گدھے اور بھیڑیے وغیرہ وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتا نظر آ رہا ہے۔ جمیل احمد عدیل کے افسانوں کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے اپنے لاشعور میں اچھائی اور برائی کی پیمائش کا کوئی پیمانہ ترازو کر رکھا ہے۔ جس کی رو سے کم تر زندگی گزارنے والے بھی انسان ہیں مگر اب اپنی کسی بدعملی کی وجہ سے عرصہ سزا میں ہیں۔ انسان اس کے نزدیک ا، ب، ج کا ہی نام نہیں ایک رویے کا بھی نام ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار سے نمو پاتا ہے۔ ان اقدار سے روگردانی کرنے والے اپنے منصب سے گر کر کم تر زندگی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ افسانہ ''تار عنکبوت'' میں ایک مکھی کا ماضی دراصل ایک بیوروکریٹ کا حال ہے۔ یہ بیوروکریٹ اپنے تمام تر اختیارات کے باوجود ذرائع ابلاغ پر قابض اپنے دوست دانشوروں کو جھوٹ مہیا کرتا رہتا ہے۔ اور یہ دوست دانشور اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اس جھوٹ کے ذریعے ایک ایسے تجسس میں مبتلا کر دیا گیا ہے جس کے بعد کوئی ''انکشاف'' نہیں بلکہ ابہام 'تار عنکبوت' کی طرح ایک جالا بنتا چلا جاتا ہے۔ انکشاف جو ایک بشارت کا درواکرتا ہے ایک سچ کا بھی درواکرتا ہے۔ بعض قوتیں انکشاف کے راستے ابہام کی رکاوٹوں سے روکے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک انکشاف کی بشارت کا سندیسہ آسمانوں میں ان دیکھے مخرج سے نمو پاتا ہے۔ یوں جمیل حیرت شک اور یقین کی ایک ایسی Triangle کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کا ہر زاویہ برابر ہے۔

جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں انسانیت کی جن اعلیٰ اقدار سے انسان افضل قرار پاتا ہے۔ ان میں چند ایک کلیدی حیثیت کی حامل ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اعتراف گناہ کے دیپ اپنے ہاتھوں پر روشن کر رکھے ہیں انہیں روشنی کے علاوہ پہچان کی وہ کشتی بھی میسر آ جاتی ہے جس کا ملاح انہیں منزلِ مراد کے ساحل کی طرف لے جاتا ہے۔ افسانہ ''زیرآب'' ہمیں ایک ایسے ہی مسافر، کشتی اور ملاح سے متعارف کراتا ہے۔ جو اپنی پہچان کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دنیا کے قدیم ترین سامری ادب میں بھی ہم ایک ایسی ہی داستان سے متعارف ہوتے ہیں۔ جس میں ایک دیوتا کی قلب ماہیت ہوتی ہے جس کا نام ان مل ہے۔ جو اپنی ماہیت کے تین ادوار ''دروازے کے آدمی''، ''دریائے ظلمات کے آدمی'' اور ''کشتی کے آدمی'' کی تجسیم اختیار کرتا ہے۔۔۔ بقول ابن حنیف یونانیوں سے بھی صدہا برس پیشتر سومیریوں کے ہاں عالم ظلمات میں ایک ایسے دریا کی موجودگی کا نظریہ پایا جاتا تھا جو دریا انسانوں کو نگل لیتا تھا اور جسے مرنے والوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ نہ صرف یہ دریا ہی تھا بلکہ سومیریوں کے نزدیک اس دریا میں ایک کشتی بھی تھی اور اس کا ایک ملاح بھی تھا۔ یہ ملاح اپنی اس کشتی میں ان لوگوں کو اپنا دریا عبور کراتا تھا۔ جو مرنے کے بعد ظلمات تک پہنچتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں یہی سومیری نظریہ اور عقیدہ پورے مشرق قریب اور بحیرہ روم کے ملکوں میں پھیل گیا۔ یونان والے ظلمات کے اس دریا کو اسکائیکس اور ملاح کو چیرون کہتے تھے۔

جمیل احمد عدیل کے نزدیک سچ اور گناہ دو الگ الگ کروں میں آباد ہیں لیکن باہم مربوط ہیں۔ ان دونوں کروں کو جدا کرنے والی وہ روشنی ہے جو گناہ کے اعتراف سے پھوٹتی ہے۔ دوسری بڑی قدر اس کے نزدیک صبر کی دولت ہے جو دکھ میں مبتلا ہوتا ہے اس کے لیے دو راستے ہیں:

''ایک یاس کی جانب مڑنے والا اور دوسرا اسرار کی وادی سے انکشاف کے مرغزار میں میں لے جانے والا۔ اختیار انتخاب دے کر سوچنے والے کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ کسی ایک طرف چلے جاؤ یہاں رکو نہیں! کرب کی دھند کو راز کی روشنی سے چیر کر انکشافات کا حیرت انگیز منظر نامہ دیکھو اور یاد رکھو یہیں تمہیں صبر کا انمول تن مل جائے گا''!!

اور یوں جمیل احمد عدیل کے افسانوں کے بیشتر کردار ہمیں روشنی اور اندھیرے کا کھیل کھیلتے نظر آتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ روشنی اور اندھیرا باہم دست و گریباں دکھائی دیتا ہے۔ متضاد رنگ باہم جمع ہوتے اور بچھڑتے ہیں۔ وہ بدہیئت زندگی کے اژدھام میں کسی نہ کسی باوقار انسان کے وجود کا منتظر اور قائل نظر آتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ اپنے افسانے کے غیاب میں رہ کر سیاہ پانی پر کشتی چلاتا ہے تو اکثر سفر کے لیے سفید رنگ کی کشتی منتخب کرتا ہے۔

وکرم صاحب

شمیم حنفی (بھارت)

"آج کل" کا دفتر اُس وقت تک اپنی الگ پہچان بنا چکا تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی لوگ اس کی باگ ڈور سنبھال چکے تھے۔ جوش صاحب، دیویندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، غرض کہ اپنے اپنے وقت میں ایک ادیب کے طور پر مانے ہوئے لوگ۔

مَیں نے نند کشور وکرم صاحب کو بھی پٹیالہ ہاؤس کے اسی دفتر میں پہلی بار دیکھا۔ اُس وقت تک اُردو کی ادبی صحافت بھی ایک نئے دَور میں داخل ہو چکی تھی۔ پہلے "آج کل" کا دفتر اپنے مدیر کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اب اسے پبلیکیشنز ڈویژن سے نکلنے والے اُردو ہندی کے کچھ معروف ادبی ماہناموں کے دفتر کے طور پر جانا جانے لگا۔ مدیر کی شخصیت پیچھے چلی گئی تھی۔ رسالہ آگے نکل آیا تھا۔

شہباز حسین اُردو "آج کل" کے مدیر تھے اور وکرم صاحب معاون مدیر۔ دونوں کی ہستیاں نک سک سے درست۔ کڑھی ہوئی شخصیتیں، انداز واطوار میں ایک شائستہ متانت اور رکھ رکھاؤ کی کیفیت۔ وہی حال دفتر کا۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی۔ وکرم صاحب اُن دنوں بھی ویسے ہی جاذبِ نظر، جامہ زیب، خوش لباس، صاف ستھرے نظر آتے تھے جیسے کہ آج دکھائی دیتے ہیں۔ چاق و چوبند وہ پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ گنتی کے ایسے لوگوں میں ہیں جو کبھی دو دِلے نہیں ہوتے۔ جو کچھ بھی کر رہے ہوں، ہر کام پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ حیرانی تو اس بات کی ہے کہ آج جب وہ اپنی عمر کی نویں دہائی پار کرنے والے ہیں، کبھی نہ تو سست نظر آئے ہیں، نہ اُن کا دھیان بٹا ہوا نظر آتا ہے، ہمیشہ مستعد، چوکس اور پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف۔ اپنے آپ کو خود سنبھالے رہتے ہیں۔ اُنہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی کار بھی خود ہی چلاتے ہیں۔ عمر کی نویں دہائی میں مَیں نے اپنے صرف ایک اور دوست انتظار حسین کو کار ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھا۔ مگر انتقال سے چار پانچ برس پہلے انہوں نے بھی اپنی گاڑی کی کمان ایک ڈرائیور کے سپرد کر دی تھی۔

وکرم صاحب کو جاننے والوں میں مجھے ابھی تک ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا، جو اُن کے نمایاں ترین وصف کا قائل اور اس پر حیران نہ ہو۔ یہ وصف اُن کے بھولے پن کے ساتھ ایک خاص قسم کی مستعدی اور خود اعتمادی کا۔ وکرم صاحب نے دنیا کا تجربہ بہتوں سے زیادہ حاصل کیا ہے۔ بہ طورِ خاص اپنی وضع کے لوگوں میں، لیکن اُن کے چہرے بشرے، عادات واطوار میں کسی طرح کی چالاکی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ ہمارے زمانے کی "دنیا طلبی" اور اُس سے منسلک خود کو دوسروں سے آگے لے جانے کی جان لیوا طلب سے حیران کن حد تک آزاد ہیں۔ مَیں نے ابھی تک اُن کا گھر نہیں دیکھا اور مجھے اُن کے رہن سہن کا انداز کا ذرا بھی علم نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ایک خاصی مطمئن اور آسودہ حال زندگی گزارتے ہوں گے۔ نفاست پسندی اور سلیقہ مندی اُن کے آؤ بھاو سے ٹپکتی ہے۔ جو شخص اپنے آداب واطوار، حلیے اور لباس سے اتنا سنبھلا ہوا نظر آتا ہو، وہ اپنے گرد وپیش میں کسی طرح کا پھوہڑ پن بھلا کیوں برداشت کرے گا۔ لیکن وکرم صاحب میں تحمل اور دل جمعی کی خوبیاں بھی اتنی نمایاں ہیں کہ اپنی ترجیحات کے نام پر کسی کا دل کبھی نہ دُکھائیں گے۔

مَیں نے انہیں کسی سے بھی ناخوشگوار موڈ کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ انہیں کسی بھی سطح پر تلخ و تند باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ اجنبیوں میں وہ عموماً لیے دیے رہتے ہیں اور غیر ضروری گفتگو سے ہمیشہ دُور رہتے ہیں۔ انہوں نے دنیا جہان کے ادیبوں کی خیر خبر لے ڈالی لیکن کبھی اپنے ہُنر کا بکھان نہیں کیا۔ نہ کبھی ڈون کی لی۔ اُن کی کہانیوں اور سوانحی ناول میں بھی خود نمائی کا شائبہ تک نہیں۔ ادب کے جس تصور کو انہوں نے ہمیشہ عزیز رکھا، اپنے شاید سب سے قریبی دوست دیویندر اِسر کے ساتھ زندگی اور ادب کے جن تجربوں سے، آزمائشوں سے گزرے، اُن کا ذکر بھی بالعموم نہیں کرتے۔ لیکن انسان دوستی اور عام مجلسی اخلاقیات کے جن ضابطوں کو انہوں نے عمر بھر نبھایا ہے، اُن کی طرف بھی اشارہ کرنے میں انہیں تکلف ہوتا ہے۔

بہ ظاہر وکرم صاحب اپنے آپ پر قانع، اپنے کاموں کے سلسلے میں کسی کا سہارہ ڈھونڈنے سے گریزاں اور راضی بہ رضا قسم کے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے 'عالمی اُردو ادب' کی شکل میں اُردو کے ادبی معاشرے کو جو تحفہ دیا ہے، اپنی نوعیت کے لحاظ سے وہ بہت منفرد بلکہ بے مثال ہے۔ اس غیر رسمی مجلّے کے بعض خصوصی شمارے تو ایسے ہیں کہ ایک زمانے تک حوالے کی ایک مستقل کتاب کے طور پر دیکھے جائیں گے۔ اور عام تشنگانِ علم سے قطع نظر، زبان وادب کے اساتذہ اور طلباء کی پیاس بجھائیں گے۔ کسی بھی موضوع پر مواد کی تلاش، دریافت اور ترتیب کے ساتھ ساتھ کم سے کم وقت میں اس کی پیشکش کا جیسا سلیقہ وکرم صاب رکھتے ہیں، دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ اس معاملے میں بھی اُن کا رویّہ دراصل "قاری اساس" ہے۔ وہ اردو زبان وادب میں اختصاص رکھنے والوں سے زیادہ توجہ ادب کے عام قاری کی ضرورت اور ذوق پر صرف کرتے ہیں۔ اپنی پسند ناپسند سے زیادہ اہمیت قاری کے ذہنی اور جذباتی مطالبات کو دیتے ہیں۔ وکرم صاحب ان محدودے چند مدیران میں شمار کئے جاسکتے ہیں جنہوں نے ادب اور زبان کے تیزی سے سکڑتے اور سمٹتے ہوئے دائرے کو اُردو کے لیے خطرے کی ایک گھنٹی، ایک تنبیہ یا وارننگ کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عوامی ادب یا مقبول عام ادب کو وہ مہتم بالشان ادب اور خواص کے ادب کا رقیب، حریف اور مقابل نہیں سمجھتے۔ پوری ادبی روایت کو، اہم اور غیر اہم یا معروف اور نام آور کی بحث سے بے نیاز ہو کر، ایک سلسلے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اسی لیے، عالمی اُردو ادب کا ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک تاریخی حیثیت کا حامل بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور خوش وقتی کے لیے پڑھے جانے والے ادبی مواد کے طور پر بھی اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ خدمت ہر لحاظ سے غیر معمولی ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصّہ

ناصر حسین

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ناصر حسین کا نام لیتے ہی مجھے اُنکی فلم کا یہ مکھڑا یاد آتا ہے۔''یوں تو ہم نے لاکھ حسین دیکھے ہیں۔تم سا نہیں دیکھا''۔ناصر حسین ایک لاجواب انسان تھا۔ وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔3فروری 1931 کو بھوپال میں جنم لینے والے ناصر حسین نے کچی عمر میں اپنا کیریئر شروع کیا۔وہ سب سے پہلے آغا جانی کشمیری کے ساتھ جڑ گئے جن کا اُن دنوں کافی غلغلہ تھا۔آغا جانی کے ایک اور شاگرد تھے جن کا نام علی رضا تھا جس نے محبوب خان کی فلمیں لکھ کر خوب نام کمایا۔ناصر حسین نے فلم رائٹنگ کی باریکیاں آغا جانی کشمیری سے سیکھ لیں اور سترہ سال کی عمر میں وہ فلستان کے ساتھ جڑ گیا۔فلستان میں اُسے اے۔آر۔کاردار کے ساتھ بطور معاون ہدایت کار کام کرنے کا موقع ملا۔فلستان کے روح رواں ششادھر مکھرجی نے اُسکی تخلیقی صلاحیتوں کو بہت جلد پہچانا اور اُسے اپنی فلمیں لکھنے کا موقع عطا کیا۔اُسنے فلستان کی کئی فلمیں لکھیں۔سب سے پہلے جس فلم نے اُسے شہرت سے ہمکنار کر دیا وہ تھی فلم''انارکلی''جو1953 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچائی۔اس فلم کے مرکزی کردار میں پردیپ کمار اور بینا رائے تھے۔ اس کا مدہوش کرنے والا سنگیت سی رامچندر کا تھا۔اس فلم سے لتا منگیشکر کا ڈنکا چار دانگ بجنے لگا تھا۔اس فلم کی کامیابی کے بعد ناصر حسین کی لکھی ایک اور فلم''منیم جی''1955 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کی ہدایت سبودھ مکھرجی نے دی تھی۔اس فلم نے بھی چاروں اور کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔اس فلم کے مکھیہ اداکاروں میں دیوآنند، ٹلنی جیونت اور پران تھے۔اس فلم کی سحر انگیز موسیقی ایس۔ڈی۔برمن نے ترتیب دی تھی۔1957 میں ناصر حسین کی لکھی ایک اور فلم ''پٹنگ گیسٹ''نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔اس فلم میں فلستان کا پسندیدہ اداکار دیوآنند، نوتن اور شوبھا کھوٹے کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔اس فلم کو بھی ایس ڈی برمن نے اپنی خوبصورت اور مدہوش کرنے والی دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔

اس فلم کی ریلیز کے بعد فلستان اسٹوڈیو پر نحوست کے بادل چھا گئے۔ششادھر مکھرجی جو کہ اشوک کمار کے بہنوئی تھے اور فلستان کے روح رواں تھے، فلستان سے الگ ہو گئے اور اُسنے سالے اشوک کمار اور اپنے چھوٹے بھائی سبودھ مکھرجی کیساتھ مل کر بمبئی ٹاکیز کی نیو ڈال دی۔ناصر حسین ششادھر مکھرجی کے ساتھ چلا آیا۔ششادھر مکھرجی اُسکی وفاداری سے اتنا خوش تھا کہ اُسنے اُسے پہلی فلم ڈائرکٹ کرنے کا موقع عطا کیا۔یہ فلم تھی''تم سا نہیں دیکھا''۔ششادھر مکھرجی ایک محدود بجٹ میں فلمیں بنانے کا فارمولہ آزمانا چاہتے تھے۔ناصر حسین دیوآنند کے ساتھ دو کامیاب فلمیں بطور رائٹر کر چکا تھا اسلئے دونوں میں کافی تال میل پیدا ہو گیا تھا۔ناصر حسین چاہتا تھا کہ دیوآنند اُسکی فلم میں کام کرے مگر دیوآنند کے ساتھ مسلہ یہ تھا کہ وہ کئی فلمیں سائن کر چکا تھا ایسے میں وہ ناصر حسین کی فلم کرنے سے قاصر تھا۔ناصر حسین بہت دنوں تک ہیرو کی تگ وتاز میں لگا رہا۔اُسے کوئی من موافق ہیرو مل ہی نہیں رہا تھا۔ ایک دن ششادھر مکھرجی نے ناصر حسین کو اپنے آفس میں طلب کیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُس نے فلم کے لئے کوئی ہیرو فائنل کیا کہ نہیں۔ناصر حسین نے نفی میں جواب دیا۔ششادھر مکھرجی نے ناصر حسین سے کہا۔''تم شمی کپور کو ٹرائی کیوں نہیں کرتے؟''۔ شمی کپور کا نام سن کر ناصر حسین دنگ رہ گیا۔ششادھر مکھرجی جیسا جید پروڈیوسر اُسے ایک ایسے ہیرو کو لینے کی سفارش کر رہا تھا جو کہ سی گریڈ فلموں میں کام کر رہا تھا اور جسکی امیج ایک لور بوائے کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ناصر حسین نے ششادھر مکھرجی سے کہا کہ اپنی فلم ایک رومانٹک فلم ہے۔شمی کپور کی امیج لور بوائے کی نہیں ہے۔وہ رومانٹک ہیرو لگے گا نہیں۔ جواب میں ششادھر مکھرجی نے کہا۔تم اُس سے ایک بار ملو۔اُسکو اپنی مونچھیں صاف کرنے کو بولو۔پھر اُسے ایک ڈائرکٹر کی نظر سے آنکو۔ہوسکتا ہے وہ تمہارے کردار میں فٹ بیٹھ جائے۔ناصر حسین نے ایسا کرنے کے لئے حامی بھر لی۔

اگلے روز وہ شمی کپور سے ملا اور اُس سے باتوں ہی باتوں میں فلم کا تذکرہ کیا۔وہ ششادھر مکھرجی کے کہنے کے مطابق شمی کپور سے کئی مرتبہ ملا۔اُسنے اُسے اپنی مونچھیں صاف کرنے پر آمادہ کر لیا۔مونچھیں منڈھوانے کے بعد اُسکی شخصیت ہی بدل گئی۔وہ بڑا دلکش لگنے لگا۔دھیرے دھیرے ناصر حسین کو لگنے لگا کہ شمی کپور اس رول میں فٹ بیٹھ جائے گا۔فلم شروع ہوئی۔اس فلم کی ہیروئن ایتا تھی۔اس فلم کو او۔پی۔نیر نے سنگیت سے آراستہ کیا تھا اور گانے مجروح سلطانپوری نے تحریر کئے تھے۔۔اس فلم کی کہانی اسکرین پلے اور مکالمے ناصر حسین کے زور قلم سے نکلے تھے۔یہ فلم 1957 میں پردہ سیمیں کی زینت بنی۔اس فلم نے ایسی دھوم مچائی کہ شمی کپور راتوں رات اسٹار بن گیا۔ناصر حسین نے بھی بحیثیت ہدایت کار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

1959 میں ناصر حسین نے ششادھر مکھرجی کے لئے ایک اور رومانٹک فلم بنائی جس کا نام''دل دے کے دیکھو''تھا۔یہ فلم فلمالیہ کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ فلمالیہ ششادھر مکھرجی کا ہی بینر تھا۔بمبئی ٹاکیز کو بند کر کے اُسنے اپنی ذاتی کمپنی کھولی تھی جس کا نام فلمالیہ رکھا گیا تھا۔اس بینر کے تلے ناصر حسین نے ایک بار پھر شمی کپور کو سائن کیا۔اس فلم کے لئے کسی نئے چہرے کی تلاش کی گئی۔آشا پاریکھ نام کی ایک گجراتی لڑکی جسکا باپ متوسط طبقے کا ایک گجراتی تھا اور ماں مسلم نژاد تھی۔آشا اُنکی اکلوتی اولاد تھی۔ماں نے اُسے کلاسیکل ڈانس کی تربیت دلائی۔ایک اسٹیج شو میں مشہور و معروف فلمساز اور ہدایت کار بمل رائے نے اُسے ناچ پیش کرتے ہوئے دیکھا تو اُنہیں اُسکا ناچ اتنا بھا گیا کہ اپنی اگلی فلم''باپ بیٹی''میں اُسے ایک چھوٹا سا رول پیش کیا۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد وجے بھٹ نے اُسے اپنی فلم''گونج اُٹھی شہنائی''میں بطور ہیروئن سائن کیا۔چند روز کی شوٹنگ کے بعد آشا پاریکھ کو فلم سے یہ کہہ کر باہر کر دیا گیا کہ اُسمیں

ایکٹنگ کی صلاحیتوں کا فقدان ہے۔اُسکی جگہ ایتا کو لیا گیا۔ایک دن آشا پاریکھ ناصر حسین کے رابطے میں آ گئی۔ناصر حسین کو اپنی فلم ''دل دے کے دیکھو'' کے لئے آشا پاریکھ جیسی ایک چلبلی لڑکی کی تلاش تھی۔یاد رہے کہ اس فلم کو بھی ناصر حسین نے ہی لکھا تھا اور وہی اسکی ہدایت بھی دے رہے تھے۔آشا پاریکھ کو ششادھر مکھرجی کے سامنے پیش کیا گیا۔ششادھر مکھرجی نے اُسے ہیروئن کے رول کے لئے موزوں پایا اور اس طرح وہ اس فلم کی ہیروئن بن گئی۔ اس فلم کو اپنی دلفریب دھنوں سے ایک نئی موسیقارہ اوشا کھنہ نے آراستہ کیا تھا۔اس فلم نے بھی باکس آفس پر دھوم مچائی۔شمی کپور کی یہ دوسری فلم تھی جو زبردست ہٹ رہی تھی۔اس فلم کے گانے سر چڑھکر بولنے لگے تھے۔ششادھر مکھرجی کا اقبال بلندی پر تھا۔وہ مٹی پکڑے تو سونا ہو جاتا تھا۔اس فلم سے آشا پاریکھ کی فلم انڈسٹری میں طوطی بولنے لگی۔وہ راتوں رات اسٹار بن گئی۔

ناصر حسین نے ششادھر مکھرجی کو الوداع کہا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کھولی۔اپنے بینر کا نام اُسنے ''ناصر حسین فلمز'' رکھا۔اس بینر کے تلے پہلی فلم جو اُس نے پرڈیوس اور ڈائرکٹ کی اُس فلم کا نام ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' تھا۔ اس فلم کے مکھیہ اداکاروں میں دیو آنند آشا پاریکھ اور پران تھے۔اس فلم میں اُنہوں نے پریم ناتھ کے چھوٹے بھائی راجندر ناتھ کو متعارف کیا۔اس فلم کی موسیقی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 1961 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم نے بزنس کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دئے۔یہ وہ دور تھا جب دیو آنند اپنے عروج پر تھا اور شنکر جے کشن کی موسیقی کو فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

ناصر حسین کی اگلی فلم ''پھر وہی دل لایا ہوں'' تھی۔یہ فلم 1963 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے مرکزی کردار میں جوائے مکھرجی اور آشا پاریکھ تھے۔ جوائے مکھرجی اُسکے محسن ششادھر مکھرجی کا بیٹا تھا جسکی فلم ''لوان شملہ'' خوب چلی تھی۔اس فلم کی موسیقی او۔پی۔نیر نے دی تھی۔او۔پی۔نیر بھی اپنے عروج پر تھا۔اس فلم کی بیشتر شوٹنگ کشمیر کی دلفریب وادیوں میں ہوئی تھی۔اس فلم نے بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔

ناصر حسین کی فلموں کی دلچسپ بات یہ رہی کہ فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' سے لے کر ''کارواں'' تک ناصر حسین نے نو فلمیں آشا پاریکھ کے ساتھ کیں۔کہا جاتا ہے کہ آشا پاریکھ اور ناصر حسین ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ناصر حسین چونکہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور اُسکے دو بچے بھی تھے اسلئے یہ بیل منڈھے چڑھ نہ سکی۔اُسکی شادی عائشہ نامی ایک عورت سے ہوئی تھی جس سے اُسکے دو بچے ہوئے۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔بیٹا منصور خان اور بیٹی نزہت۔آشا پاریکھ اور ناصر حسین ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے مگر وہ اس رشتے کو ازدواجی رشتے میں نہ بدل سکے۔ثریا کی طرح آشا پاریکھ نے بھی ساری زندگی کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔وہ آج بھی کنواری ہی جی رہی ہے۔

1966 میں ناصر حسین کی ایک اور فلم ''تیسری منزل'' ریلیز ہوئی۔اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ یہ فلم ناصر حسین نے لکھی اور پرڈیوس کی تھی جب کہ اس فلم کے ہدایت کار وجے آنند تھے۔اس فلم کے مکھیہ اداکار شمی کپور اور آشا پاریکھ تھے۔پہلے اس فلم کے لئے دیو آنند کو سائن کیا گیا تھا۔دیو آنند ناصر حسین کی پہلی پسند تھے۔شوٹنگ سے پہلے ہی دونوں میں کسی بات کو لے کر اختلاف پیدا ہو گیا کہ دیو آنند نے فلم چھوڑ دی۔ایک بار پھر ناصر حسین شمی کپور کی شرن میں پہونچ گئے۔شمی کپور نے فلم میں کام کرنا مان لیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس فلم کے لئے دیو آنند کو پہلے سائن کیا گیا تھا۔اس فلم کے لئے ناصر حسین ایک نئے موسیقار کے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے۔شمی کپور کی پہلی پسند او۔پی۔نیر اور شنکر جے کشن ہوا کرتے تھے۔ناصر حسین کسی وجہ سے شنکر جے کشن کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔آشا بھونسلے اور او۔پی۔نیر ایک لمبے عرصے کے بعد الگ ہو گئے تھے۔آشا بھونسلے نے ایک نوجوان موسیقار کا ہاتھ تھام لیا تھا۔یہ نوجوان موسیقار تھا راہول دیو برمن۔اُسنے ناصر حسین کو اس بات کے لئے آمادہ کر لیا کہ وہ راہول کو اپنی فلموں میں موسیقی دینے کا موقع فراہم کریں۔آشا کی آواز آشا پاریکھ کو بہت زیادہ سوٹ کرتی تھی اسلئے ناصر حسین کو آشا بھونسلے کی بات ماننی پڑی۔ اُسنے شمی سے کہا کہ وہ اس بار راہول دیو برمن کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔اب شمی کپور کو آر۔ڈی۔برمن کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا کیونکہ وہ ایک اسٹار تھا اور فلمیں اُسکے نام سے چلتی تھیں۔ویسے بھی ہماری فلم انڈسٹری کا یہ چلن رہا ہے کہ ہیروئن اور سنگیت کار کا چناؤ ہیرو کی مرضی سے ہوتا ہے۔ناصر حسین نے شمی کپور کو راہول دیو برمن کی کئی دھنیں سنائیں۔پہلی ہی دھن سن کر وہ جھوم اُٹھا۔راہول دیو برمن پاس ہو گیا۔فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔فلم کی شوٹنگ شد و مد سے چل رہی تھی کہ شمی کپور کی بیوی گیتا بالی کا انتقال ہو گیا۔یہ ایسا جان گسل سانحہ تھا جس نے شمی کپور کو توڑ کے رکھ دیا۔وہ گیتا بالی سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔فلم کی شوٹنگ رک گئی۔شمی کپور اپنی پیاری بیوی کے سوگ میں ایسے ڈوب گیا کہ اُسنے باہر کی دنیا سے ناطہ ہی توڑ لیا۔''تیسری منزل'' کا سیٹ لگا ہوا تھا۔سیٹ کو بے وجہ کھڑا رکھنا خودکشی کے مترادف تھا۔اُن دنوں اسٹوڈیو کا ایک دن کا کرایہ ہزاروں روپیہ ہوتا تھا۔شمی کپور ان باتوں سے بے خبر نہ تھا اسلئے اُسنے ناصر حسین کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ یا تو سیٹ توڑ دے یا کسی اور کو لے کر یہ فلم مکمل کر لے۔ناصر حسین اور شمی کپور کی دوستی اتنی گہری اور مضبوط تھی کہ سود و زیاں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس نے چھ مہینے تک سیٹ کھڑا رکھا۔ چھ مہینے کے بعد جب شمی کپور اپنی بھابی کرشنا کپور (مسز راج کپور) کی کوششوں سے اس صدمے سے باہر آیا تو سب سے پہلے اُس نے ''تیسری منزل'' کی شوٹنگ میں حصہ لیا۔فلم جب ریلیز ہوئی تو ایک بار پھر اس فلم نے کامیابی کا پرچم لہرا دیا۔اس فلم کی موسیقی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔جہاں دیکھو لوگ ان دھنوں پر تھرکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ناصر حسین کے ساتھ راہول دیو برمن کی یہ پہلی فلم تھی۔اس فلم سے ان دونوں کا ایسا ملن ہوا کہ اُنیس برس تک وہ ناصر حسین کے ساتھ جڑا رہا اور اُسکی ہر فلم کی موسیقی راہول دیو برمن ہی ترتیب دیتے رہے۔

1967 کو ناصر حسین نے راجیش کھنہ کو لے کر ''بہاروں کے سپنے'' فلم ریلیز کی۔یہ فلم باکس آفس پر کامیاب نہ رہ سکی۔یہ وہ دور تھا جب راجیش کھنہ کے ستارے گردش میں تھے۔ناصر حسین جنہوں نے کئی گم نام ایکٹروں کو اسٹار بنا دیا تھا، راجیش کھنہ کی ڈوبتی نیا کو کنارے نہ لگا سکے۔اس فلم میں اُن کی چہیتی

ہیروئن آشا پاریکھ تھی اور اسکو راہول دیو برمن نے اپنے مدھر سنگیت سے سجایا تھا پھر بھی یہ فلم کچھ خاص نہ چلی۔

ناصر حسین نے ''بہاروں کے سپنے'' کی ناکامی کو بھلا کر ایک اور فلم کا اعلان کیا۔ اس بار اُسنے ششی کپور کو لے کر فلم ''پیار کا موسم'' شروع کی۔ ہیروئن آشا پاریکھ تھی۔ اس فلم کو اپنے مدمست سنگیت سے راہول دیو برمن نے آراستہ کیا تھا۔ یہ فلم 1969 میں ریلیز ہوئی۔ فلم سپرہٹ رہی۔ اس فلم کی کامیابی میں موسیقی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس فلم کی ایک خاص بات یہ تھی۔ اس فلم میں ششی کپور کے بچپن کا رول طاہر حسین کے تین سال کے بیٹے فیصل خان نے بخوبی نبھایا تھا۔

طاہر حسین ناصر حسین کا چھوٹا بھائی تھا جو پہلے دن سے لے کر آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ جڑا رہا۔ اُسنے ادا کاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' میں وہ راجندر ناتھ کے ساتھ نظر آیا تھا۔ وہ پروڈکشن کی ذمہ داریوں کو نبھاتا رہا۔ ناصر حسین اپنے چھوٹے بھائی کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا اسلئے اُس نے اُسے پرڈیوسر بنالیا۔ اُسنے ''کارواں'' نام کی ایک فلم کی ہدایت دی جسے سچن بھوک نے لکھا تھا اور اسکے مکھیہ اداکاروں میں جتیندر، آشا پاریکھ، ہیلن اور ارونا ایرانی تھے۔ یہ وہ دور تھا جب جتیندر کا دور دورہ تھا۔ اس فلم کا سنگیت راہول دیو برمن نے دیا تھا۔ یہ فلم 1971 میں ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر کامیاب رہی۔

ستر کی دہائی میں سلیم جاوید بطور رائٹر ہندی فلموں پر چھائے رہے۔ ہر فلمساز کی تمنا رہی کہ وہ اس جوڑی کے ساتھ کام کرے کیونکہ فلم کی کامیابی کا دوسرا نام سلیم جاوید تھا۔ صرف ایک فلم ''دھرم ایمان'' کو چھوڑ کے باقی جتنی بھی فلمیں اُنہوں نے لکھیں وہ سب کی سب بیحد کامیاب رہیں۔ ناصر حسین بذات خود ایک کامیاب رائٹر تھا پھر بھی اُسنے سلم جاوید کو اپنی نئی فلم لکھنے کے لئے کہا۔ سلیم جاوید نے ناصر صاحب کے لئے فلم ''یادوں کی برات'' لکھی جس میں پہلی مرتبہ ناصر صاحب نے دھرمیندر اور زینت امان کے ساتھ کام کیا۔ اس فلم میں اُنہوں نے اپنے بھانجے طارق کو بھی متعارف کیا۔ اس فلم کی موسیقی بھی راہول دیو برمن نے ہی دی۔ اس فلم نے بھی ناصر حسین فلمز کی کامیابی کا پرچم پورے ملک میں لہرا دیا۔ یہ فلم 1973 میں ریلیز ہوئی۔ ناصر حسین کی دیگر فلموں کی طرح یہ فلم بھی ہٹ رہی۔

ناصر حسین نے 1977 میں اپنی اگلی فلم ''ہم کسی سے کم نہیں'' ریلیز کی۔ اس فلم کے کلاکار تھے رشی کپور، ایک نئی لڑکی کاجل کرن، امجد خان اور زینت امان اس فلم کی موسیقی ناصر حسین کے چہیتے موسیقار آر۔ ڈی۔ برمن نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم ایک میوزیکل تھرلر تھی۔ اس فلم نے بھی باکس آفس پر دھوم مچائی۔ ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی یہ آخری کامیاب فلم تھی۔

اس فلم کے بعد ناصر حسین نے کئی فلمیں بنائیں جیسے 1981 میں ''زمانے کو دکھانا ہے'' جسکے مکھیہ اداکاروں میں رشی کپور، پدمنی کولھاپوری، یوگیتا بالی، قادر خان اور اسرانی تھے۔ اس فلم کا سنگیت تو لوگوں کو پسند آیا مگر فلم چلی نہیں۔ اسکے بعد ناصر حسین کی ایک اور فلم ''منزل منزل'' 1984 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے کلیدی رول میں سنی دیول اور ڈمپل کپاڈیا تھے۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر پھسڈی ثابت ہوئی۔ اس فلم کے بعد ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی آخری فلم ''زبردست'' 1985 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے فلمساز محمد ریاض تھے جو بعد میں مشیر ریاض کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس فلم کے مرکزی کردار میں سنجیو کمار، جیا پردھا اور سنی دیول تھے۔ جب کہ اس کے لیکھک سچن بھوک تھے جنہوں نے بڑی کامیاب فلمیں لکھی تھیں۔ اس فلم نے بھی پانی نہیں مانگا۔ فلم اتنی اچھی سٹار کاسٹ کے بعد بری طرح فلاپ ہوئی۔ ناصر حسین نے اپنا کرشمہ کھو دیا تھا۔ وہ کامیابی کا فارمولہ بھول گیا تھا۔

اُن کا بیٹا منصور خان جوان ہو چکا تھا۔ ناصر حسین منصور کو ایک بلند پائے کا انجینر بنانا چاہتے تھے مگر اُسکا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ کئی کالجوں سے باہر ہوگیا۔ آخر میں اُسنے باپ کے ہاتھ سے کمان لے لی اور ناصر حسین فلمز کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ وہ رومیو جیولیٹ جیسی پریم کہانی کی طرز پر ایک ہندی فلم بنانا چاہتا تھا۔ ناصر حسین نے اپنے بیٹے کے لئے ایک کہانی لکھ ڈالی۔ اس کہانی کا نام ''قیامت سے قیامت تک'' رکھا گیا۔ اپنی کئی فلموں کی ناکامی کے بعد اُن کی کاروباری ساکھ پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ اُن کی فلموں پر سرمایہ لگانے والے اب ہچکچا رہے تھے۔ ایسے میں کسی بڑے ستارے کو لے کر فلم بنانا ممکن نہ تھا اسلئے باپ کی صلاح پر بیٹے نے نئے چہروں کی تلاش شروع کر دی۔ یہاں پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا بیحد ضروری ہے۔ عامر خان ناصر حسین کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کرتا تھا ایک دن جاوید اختر سیٹ پر تشریف لائے۔ اُسنے معصوم اور شرمیلے عامر کو دیکھا تو اُسکی مسکراہٹ اُسے اتنی بھا گئی کہ اُسنے ناصر حسین سے کہا کہ اس لڑکے کی مسکراہٹ بڑی پرکشش ہے۔ اسے آگے اپنی کسی فلم میں چانس دیجئے گا۔ جاوید اختر کی یہ بات ناصر حسین کے لاشعور میں کہیں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اُسنے منصور سے کہا کہ وہ اس رول کے لئے عامر کو آزما کے دیکھے۔ منصور چونکہ خود نیا تھا اسلئے وہ عامر کے حق میں تھا کیونکہ عامر کے ساتھ کام کرتے ہوئے اُسے کوئی پریشانی نہیں ہوسکتی تھی۔ اب ایک لڑکی کی تلاش شروع ہوگئی۔ ناصر حسین نے فلم ''سلطنت'' میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا جس کا رول حالانکہ کچھ اہم نہ تھا مگر اُس لڑکی میں بلا کی سادگی اور نزاکت تھی۔ اُس لڑکی کا نام جوہی چاولہ تھا۔ فلم کے لیڈ پیر کے فائنل ہوتے ہی باقی کے کلاکار طے کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس فلم کے لئے ایک نئی جوڑی کو موسیقی دینے کا موقع دیا گیا۔ اس جوڑی کا نام آنند ملند تھا۔ یہ پرانے زمانے کے مشہور سنگیت کار چتر گپت کے صاحبزادے تھے۔ اس فلم میں ایک نئے گلوکار ادویت نارائن کو پلے بیک سنگر بننے کا چانس ملا۔ فلم کی شوٹنگ شدومد سے شروع ہوئی۔ ناصر حسین نے اس فلم کو کامیاب بنانے میں کوئی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

فلم جب بن کر تیار ہوگئی تو ڈسٹری بیوٹرس کو اس فلم کی ٹرائل دکھائی گئی۔ جو بھی ڈسٹری بیوٹر اس فلم کو دیکھتا تھا وہی بھاگ جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہیرو کو دیکھ کر فلم بکتی تھی۔ نئے چہروں کے نام پر فلم بیچنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔

ایک تو فلم میں کام کرنے والے سبھی نئے، وہ چاہے اداکار ہوں یا ہدایت کار، موسیقار ہو یا گیت کار سب کے سب ایکدم کورے اُس پر طرفہ یہ کہ ناصر حسین صاحب جو قیمت مانگ رہے تھے وہ سن کے ہی لوگوں کو چکر آتا تھا۔ کتنے ڈسٹری بیوٹر آئے اور چلے گئے۔ کئی دلال انڈسٹری میں یہ کہتے پھرے کہ ناصر حسین سٹھیا گیا ہے، ایک ایک ٹریٹری کے ستر ستر لاکھ مانگ رہا ہے۔ فلم ڈبوں میں پڑی رہی تاہم ناصر حسین کوئی بھی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ ہوا۔۔ ناصر حسین بہت برے دور سے گزر رہا تھا۔ اُنکا بال بال قرضے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر کار اُس نے یہ فلم خود ہی ریلیز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یار دوستوں نے اُسے بہتیرا سمجھایا کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں۔ کچھ لوگ تو یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے کہ بڈھے کی مت ماری گئی ہے۔ اب جو کچھ بچا ہے وہ بھی ڈوب جائے گا۔ بالآخر 1988 میں ناصر حسین نے فلم کمیشن پر ریلیز کردی۔ فلم نے فلم بینوں پر نہ جانے کیا جادو کردیا کہ وہ اس فلم پر ٹوٹ پڑے۔ فلم نے باکس آفس کے سارے ریکارڑ توڑ ڈالے۔ عامر خان اور جوہی چاولہ راتوں رات اسٹار بن گئے۔ اس فلم نے ناصر حسین کے اگلے پچھلے سارے قرضے اُتار دئے۔ جس بنگلے میں وہ رہتے تھے اُس میں رنگ وروغن ہونے لگا اور وہ ایک بار پھر کامیاب فلمسازوں کی قطار میں کھڑے ہوگئے۔

ناصر حسین بہت ہی سادگی پسند آدمی تھا۔ میرا آفس چونکہ اُن کے بنگلے کے بغل میں تھا اس لیے ہر دن میری اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔ سفید قمیض اور پتلون اُن کی پسندیدہ پوشاک تھی۔ وہ اپنے بنگلے کے گیٹ پر اکثر کھڑے نظر آتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے ہی بنگلے میں ایک ایڈیٹنگ روم کھولا تھا جہاں پر ہم اکثر جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہ کافی رومان پسند آدمی تھے۔ مرتے دم تک وہ اُسی شان سے جیتے رہے۔ 2002 کو اکھتر سال کی عمر میں اُنکا انتقال ہوگیا۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ناصر حسین ہندوستان کے مایہ ناز سپوت مولانا ابو کلام آزاد کے نواسے تھے۔ مولانا اُنکے نانا جان تھے۔ پارلیمنٹ کی سابقہ سپیکر اور سیاسی شخصیت نجمہ ہپت اللہ اُنکی کزن ہے۔ وہ اپنے پیچھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑ گئے۔ بیٹی نزہت نے اُن کی حیات میں ہی ممبئی کے ایک انجینیر انیل پال سے شادی کی تھی۔ انیل منصور کا کالج کا دوست تھا۔ وہ منصور کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ نزہت اور انیل میں پیار ہوا۔ بعد میں دونوں نے شادی کرڈالی۔ اس شادی سے اُنکا ایک بیٹا ہوا جس کا نام عمران خان ہے اور جو جوان پیڑھی کے نمائندہ اداکاروں میں گنا جاتا ہے۔ انل سے الگ ہونے کے بعد وہ کئی سال تک راج زتشی نام کے ایک کلاکار کے ساتھ اپنے میکے کے بنگلے میں ہی رہی۔ سننے میں آیا ہے کہ اُسنے اُسے بھی چھوڑ دیا۔ منصور بھی کئی کامیاب فلمیں بنانے کے بعد گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔ بیچ میں عامر نے اُسے اپنی پروڈکشن میں منسلک کرنیکی کوشش کی تھی۔ اپنے بھانجے عمران کو فلموں میں لانچ کرنے کے لئے اُس نے عامر خان پروڈکشن کے تحت ایک فلم ''جانے تو یا جانے نا'' میں عامر کے ساتھ کام کیا۔ فلم زبردست ہٹ رہی۔ اُنکے چھوٹے بھائی طاہر حسین کا بھی انتقال ہوگیا۔ اُنکا ایک منجھلا بھائی بھی تھا جس کا نام باقر حسین تھا جو دلی میں رہتا تھا اور فلم ڈسٹری بیوشن کے ساتھ منسلک تھا اُسکا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ اس وقت اس خاندان کی آن بان کو عامر خان بڑی شان سے آگے بڑھا رہا ہے۔ اُنکا بھانجا طارق گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔ فیصل بھی فعال نہیں ہے۔ بس اسوقت عامر اور عمران کے اوج موج کا دور چل رہا ہے۔

بقیہ : وکرم صاحب

وکرم صاحب نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کی اُن کی خدمت کتنی وقیع اور مفید ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے ان کی کوششوں کو لوگ پڑھنے لگے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مشرق ومغرب کے دوسرے ملکوں میں بھی اُن کی خدمات کا اُجالا پھیل رہا ہے۔ اُردو والے اُن کا احترام کرتے ہیں اور اُن کے شائع کردہ رسائل اور کتابوں کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یوں بھی وکرم صاحب ایک ساتھ دو علاقوں، دو دنیاؤں۔ مشرق ومغرب، دوشہروں..... ہندو پاک..... راولپنڈی اور دہلی کے باسی ہیں مَیں نے انہیں ان دونوں دنیاؤں میں ایک سی سہولت۔ آسودگی اور بے لوثی کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے دیکھا ہے، اُس وقت وکرم صاحب کی شریکِ حیات بھی اُن کے ساتھ تھیں۔

مگر اب..... اس ڈھنڈار شہر میں وہ اکیلے ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق رہنے، کام کرنے، اور آزادانہ اپنے وقت کا گزارنے کے عادی۔ تنہائی کی زندگی میں انسان ایک خاص وضع کی زندگی کا عادی ہوجاتا ہے۔ وکرم صاحب کو ان کے بے تکلف احباب اور ارادت مند ''ایک اکیلی ذات'' پر مشتمل ''فوجی دستے'' کا نام دیتے ہیں۔

میں اُن کو ہمیشہ رشک کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ اُن کی آزادہ روی واقعی قابلِ رشک ہے۔ جب چاہا معمول سے الگ کچھ کھانے کا، جس طرح چاہا کھالیا۔ ایک رات فون آیا کہ ''آج چار گول گپے کھا لیے تھے، اب کھانا نہیں کھاؤں گا۔!'' اپنی Will یا ارادے کا ایسا بے دریغ استعمال وکرم صاحب ہی کرسکتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں دیکھ کر ایک گھنے سایہ دار درخت کی شبیہہ ذہن میں رونما ہوتی ہے..... اور دنیا، اصل میں جیسی کچھ ہے، اس سے بہتر محسوس ہونے لگتی ہے۔ شمع محفل کی طرح سب سے جُدا سب کا رفیق!

ابھی تو کتنے بہت سے کام ہیں جو وہی کرسکتے ہیں اور کیسے کیسے راستے ہیں کہ انہی کے قدموں کی چاپ کے منتظر ہیں۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محبّی، مربی، مداحِ گلزار، برادرم گلزار جاوید، زادالطافہ۔

برادرم آپ کا بالخصوص اور آپ کے جملہ مدیرانِ معاون و وابستگان چارسوئے عالم کا میں تہہ دل سے اپنی طرف سے اور انجمن تعمیر اردو کے جملہ اراکین کی طرف سے آپ کا نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے عظیم ماہنامہ میں میرے متعلق عمیق اور وافر تعارفی معلومات اور اردو کی تبلیغی جہادی آرا، تعلیمی خدمات کا تفصیل سے تذکرہ شائع کیا اور میرے کلام، حالاتِ زندگی اور اردو کے استاد الاساتذہ حضرات سے ادبی اور خانگی وابستگی کا تذکرہ شائع کر کے نہ صرف مجھے نوازا بلکہ علامہ زار دہلوی یادگارِ داغ و علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی یادگارِ حالی ؒ و نواب سائل دہلوی جانشین و دامادِ داغ اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے میری وابستگی کے ذکر سے دلّی کے ۱۵۰ برس کی فضا کو بھی بالواسطہ یاد فرمایا۔ شکریہ، جزاک اللہ۔ اللہ زورِ صحافت چہارسو کو چارسوئے عالم میں پھیلائے۔ آمین۔

باقی رہے نام اللہ کا

میرے محترم کرم فرما اور ادبی برادران جناب نند کشور وکرم صاحب اور عزیزم فاروق ارگلی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ حضرات سے میرا تعارف کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔

الحمد لله رب العالمين

آپ کا مخلص نیازکیش، فقیر نظامی، سفیر دلّی، گلزارِ خسرو، امام اردو، یادِ اسلاف، کافرِ ہندی مجذوبِ اردو۔

گلزار دہلوی (دہلی، بھارت)

محبی گلزار جاوید صاحب، دعائے صحت وسکون۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں ''چہارسُو'' اب ایک مکمل ادبی مجلّہ ہے جس نے ڈھونڈ، ڈھونڈ کر دنیا کے ہر گوشے سے قلم برداروں کو جمع کر لیا ہے۔ اپنے سوالنامے کے علاوہ اس میں آپ کا تخلیقی کام بھی شامل ہوتا ہے جو علیحدہ ستائش کا حق رکھتا ہے۔ ہمت کی بات ہے اور نیک نیتی کی۔ نہ کسی بیر نہ تنفر، اور نہ داد اور بیداد دونوں تخلیق پر نہیں، ذاتی رائے پر مبنی ہوتے ہیں جس کے پسِ پشت کسی نظریے، علاقے، دین اور اعتقاد سے وابستگی کارفرما ہوتے ہیں۔ جس سے بیر اس کی تحریر سے بھی بیر، جس سے ہم آہنگی اس کا ہر لفظ سونا اور چاندی۔

حسن منظر (کراچی)

عزیزم گلزار جاوید، سلام۔

آپ نے شوق انصاری کا گوشہ نکال کر دل خوش کر دیا۔ براہِ راست سے ان کی شاعری اور شخصیت کو جس طرح اجاگر (Promote) کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی چٹکیوں میں چند ایک غضب ڈھاتی ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریر سے جو نپا تلا اقتباس ''اندرون لاہور'' ص۔ ۵۷ پر ڈالا ہے وہ ان کے اسلوب طنز و مزاح کا نمائندہ ہے۔ شوخ شریر اور پر لطف۔ ڈاکٹر رؤف خیر کا انشائیہ ''حیدرآباد کے ادبی اڈے'' مزا دے گیا۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی سے بڑی، تیکھی سے تیکھی بات کہہ جانا کوئی ان سے سیکھے۔ دل آزاری سے گریز لائقِ تحسین ہے اور ہاں یہ ''کھانے پینے اور پینے کھانے'' میں مطلب کا فرق واضح کرنے کی ادا بھی خوب جچی۔ آپ کا افسانہ ''مولانا گاؤدی'' ایک بار پھر آپ کے منفرد بیانوی اسلوب کی گواہی دے رہا ہے۔ وقوعہ کس مزاج کا اور بیانیہ کس مزاج کا۔۔؟ موضوع کی گھمبیرتا کو بھی نبھایا جا رہا ہے اور شگفتگی کا ماحول بھی برقرار رکھا جا رہا ہے۔ جہاں تک مجھ کم علم کا علم صورتِ حالات پر روشنی ڈالتا ہے اس کی رو سے ہمارے حضور نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ نے صراحت کے ساتھ ارشادِ مبارک سے مسلمانوں کو نوازا ہے کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کا اقتدار نہیں ہے وہاں ہر قسم کی Notoriety نمائش اور Fuss غیر ضروری اختلاف سے پرہیز لازمی ہے۔ بہرحال اس افسانے پر بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام وعلیکم۔

گلزار دہلوی نمبر دیکھا۔ گلزار دہلوی اردو ادب میں ایک اہم نام ہے۔ آپ کیسے کیسے گوہرِ نایاب ڈھونڈھ نکالتے ہیں، یہ آپ کا ہی خاصہ ہے۔ آپکے توسط سے اردو ادب کی اہم شخصیات سے ہم متعارف ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی ادبی جہات سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔

افسانے پڑھے، سب ہی اچھے ہیں۔ کہتے ہیں ادب کی بنیاد اظہار اور اخفا دونوں پر استوار ہوتی ہے۔ حسن منظر کے افسانے 'شب ہراس' کو اس بیان کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ انکا ہر فقرہ کچھ کہتا بھی ہے کچھ چھپاتا بھی ہے۔ اس عجیب وغریب تکنیک کے استعمال کے لئے موصوف نے کسی فرانسیسی ناول کے انگریزی ترجمے کے مطالعے سے کام لیا ہے۔ حمید صاحب کے زیرِ مطالعہ ناول کا جو حصہ ہے وہ خوف و ہراس سے معمور ہے۔ اس خوف و ہراس کا مرکز ایک ۸ سالہ ملازمہ ہے جس پر سرائے کی مالکن بہت ظلم کرتی ہے۔ اور اسکو رات کے وقت آبادی سے دور ایک چشمے سے بالٹی میں پانی بھر کر لانے کے لئے بھیجتی ہے۔ جب وہ بھری بالٹی لے کر چشمے سے لوٹتی ہے تو اس کی مدد کے لئے ایک آدمی آموجود ہوتا ہے۔ اس منظر میں حمید صاحب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، ان کا ذہن خدشوں اور وسوسوں سے بھر جاتا ہے۔

پاکستان کی موجودہ صورت حالات ان کے سامنے آجاتی ہے جہاں

انسان کی جان، مال، عزت سب کچھ غیر محفوظ ہے۔حمید صاحب فرنچ لڑکی کو پاکستانی لڑکی سے بدل لیتے ہیں۔ان کی رات شب ہراس کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔بعد میں جب ناول کچھ آگے بڑھتا ہے اور وہ شخص محض ایک ہمدرد انسان کی صورت میں بچی کی بالٹی خود اٹھائے ہوئے چلتا ہے تو حمید صاحب کی جان میں جان آتی ہے۔ افسانے کا سارا لطف اس آنکھ مچولی میں مضمر ہے جس کی مدد سے افسانہ نگار نے افسانے کی تعمیر کی ہے۔ایک اور بات حمید صاحب اور افسانہ نگار حیرت انگیز طور پر، ہم دیگر متبدل ہوتے رہتے ہیں۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

بہت دنوں بعد حاضر ہو رہی ہوں۔وقت کے ساتھ دوڑ میں شرط ہار کر بھی دوڑ جاری رہتی ہے۔ان دنوں اپنے کئی آرٹ شوز کے سلسلے میں سفر کی مصروفیت یوں رہی کہ چہارسو کے شمارے ہر جگہ ساتھ لے جاتی رہی، قسطوں میں پڑھتی رہی، عمدہ تحریروں پر اپنے تاثرات بھی قسطوں میں لکھتی رہی جو کہیں کاغذات کے انبار میں کھوتے رہے۔اطمینان سے لکھنے کے ارادے میں دیر ہوتی رہی اور خط پورا کرنے کی نوبت بھی جاتی رہی۔ بارہا بہترین تخلیقات نے روک لیا، لکھنا چاہا لیکن ۔۔۔۔آج اللہ نے یہ توفیق عطا کی ہے کہ عجلت میں ہی سہی کچھ تو اظہار کر سکوں۔اس بار چہارسو ستمبر اکتوبر کا شمارہ بہت جلد نیٹ پر آ گیا۔ابھی سرسری طور پر دیکھ سکی ہوں۔ ہارڈ کاپی جب آجاتی ہے تو بھرپور مطالعہ کرتی ہوں۔گلزار دہلوی کے متعلق اشتیاق سے پڑھوں گی۔

کبھی کبھی کسی شمارے کا سرورق ہی تھام لیتا ہے۔فسوں گر تخیلات سے بھرپور۔شوق انصاری نمبر کا سرورق بھی اس خوبی سے لبریز ہے۔دور تک لہراتے ہوئے دھند کے آنچل میں کچھ نہاں کچھ عیاں سوکھے ہوئے درختوں کے ڈھانچے، کہر کی تہوں میں کچھ ڈھونڈتی ہوئیں آنکھیں، اور ان کی لکیروں پر ابھرتے ہوئے جانے انجانے پیکر۔۔۔۔کئی کہانیاں سناتے ہیں۔بہت عمدہ۔مبارک باد۔

تمام ممالک کے ادیبوں کا ایک دوسرے سے تعارف چہارسو کے ذریعہ بہ خوبی ہوتا رہتا ہے۔یہ ادبی دنیا کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔شوق انصاری سے ملاقات دلچسپ ہے۔ماہ کامل۔۔اور۔۔گہرے پانیوں سے دوستی۔۔۔پراثر افسانے ہیں۔آپ کے مولانا گاؤدی نے زندگی کی بدصورتی کو کامیابی سے اجاگر کیا ہے جو عبرت ناک ہے۔مارچ اپریل کے شمارے میں۔۔ایم ایس ایس پرائیویٹ لمیٹیڈ نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقی سے زندگی کو زیادہ فائدہ ہوا ہے یا نقصان؟ بشریٰ رحمٰن کی نظم Beta Blocker بہت پسند آئی اور محترم یوگیندر بہل تشنہ کی نظم۔۔خیالات کا پرندہ۔۔دل میں اتر گئی۔رینو بہل اردو ادب کو مسلسل خزانے عطا کر رہی ہیں۔ انھوں نے اپنا ناول ۔۔گرد میں اٹے چہرے۔۔مجھے عنایت کیا تھا۔کتاب کا نام جتنا پر معنی ہے اتنا ہی اثر انگیز اس کا موضوع بھی ہے۔پڑھنا شروع کیا تو خود کو روک نہ سکی جب تک ختم نہ کر لیا۔اور اب انھوں نے ۔۔۔میرے ہونے میں کیا برائی ہے۔۔۔میں زندگی کے بہت نازک اور اچھوتے پہلو کو چھو لیا ہے۔انھیں بے حد مبارک باد اور نیک تمنائیں۔

چہارسو کے توسط سے چند ماہ قبل ہندستان کے معروف ادیب اور شاعر۔۔جناب مہندر پرتاپ چاند صاحب اور ان کی فیملی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔بے حد نفیس اور اخلاق مند لوگوں سے مل کر از حد مسرت ہوئی۔اور اب پچھلے ہفتے دوران سفر، بہت دردمند، پُر خلوص اور پدرانہ شفقت سے بھرپور محترم جناب تشنہ صاحب اور ان کی فیملی سے ملاقات ہو گئی۔اتنے اچھے اور سچے لوگ اب اس دنیا میں عنقا ہیں۔ چہارسو کے ذریعہ ہی ان لوگوں کو جان سکی اور یہ محسوس ہوا کہ دنیا میں اب بھی اتنے اچھے لوگ باقی ہیں۔

میں محترم یوگیندر بہل تشنہ، عبدر رحمٰن قاضی، نوید سروش، ابرہیم عدیل، ڈاکٹر ریاض احمد، نجم الحسن رضوی، مہندر پرتاپ چاند صاحب اور بہن رینو بہل کی تہ دل سے ممنون ہوں کہ میری تخلیقات کو انھوں نے سراہا اور میری حوصلہ افزائی کی۔نوید سروش صاحب نے رس رابطے میں فرمایا ہے کے میری نئی کتاب ۔۔بے کرانیاں۔۔بھی انھیں نہیں ملے گی۔ایسا بالکل نہیں۔ بہ راہ کرم وہ اپنا پتہ مجھے عنایت کر دیں تو میں اپنی سب کتابیں انھیں بھجوا دوں گی۔

پروین شیر (نیو جرسی سٹی)

بردارِ عزیز گلزار جاوید، محبتیں۔

محو تو میں چہارسو کے شوق انصاری نمبر میں تھا مگر یکا یک دل میں ایک خواہش اجاگر ہوئی میرے ذمے ایک پرانا قرض تھا اس کو میں ساتھ ہی اٹھا لایا اور وہ تھا "براہ راست" جہان دانش کے ممتاز و منتخب اہل قلم سے مکالمہ 'حصہ اول "ابھی پہلے پائدان پر ہی قدم رکھا تھا کہ اس عشق میں لطف آ گیا آپکی 23 مارچ 2004ء کی لکھی ہوئی تحریر:

"لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی اتنے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے"

اس کتاب کے 41 روشن ستاروں کو دیکھ کر یہ مشکل ہو گیا کہ اس عشق کے سفر کو کہاں سے شروع کروں اور فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہو بہو اسی طرح جیسے نئے وصول شدہ چہارسو کا 'براہ راست' پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگلا قدم کس پائیدان پر رکھیں. ابھی تک صرف 5 سیڑھیاں طے کرنے کی ہمت ہوئی ہے. سرسری نظر ڈالنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ جن پائدانوں پر احمد فراز، پروفیسر انور مسعود اور جناب افتخار عارف جلوہ افروز ہیں وہاں سے تو میرا کافی پہلے گذر ہو چکا ہے. واپسی کے سفر میں آخری پائیدان سے بھی ہو آیا جہاں محترمہ پروین شاکر نے رستہ روکا ہوا ہے. باقی پائدانوں پر ایسے ایسے ہیرے جڑے ہیں کہ کئی دفعہ اوپر جمپ کرنے کو جی چاہتا ہے مگر ان اساطیر لاولین کی کشش انکے انقطاع کی بھی اجازت نہیں دیتی.

کرنل کبیر (ملائیشیا)

''چہارسُو''

برادرِ عزیز گلزار جاوید جی، سلام مسنون۔

ستمبر اکتوبر ۲۰۱۷ء کا شمارہ تین دن قبل موصول ہوا اور اب تک اس کا مطالعہ مکمل طور پر کر چکا ہوں۔ گذشتہ شمارہ بروقت مل تو گیا تھا مگر اس پر اپنی رائے اور موجودہ شمارے کے لئے کوئی تخلیق نہ بھیج پایا تھا، آپ کا شکریہ کہ آپ نے پچھلے ماہ بھیجی ہوئی میری غزل ''داشتہ آید بکار'' کے زمرے میں لگا دی اور یوں حاضری لگ گئی۔ جزاکم اللہ۔

گذشتہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز جناب شوق انصاری جیسے اچھے مگر گمنام شاعر کے نام تھا تو اس مرتبہ یہ ایک ایسے مشہور و معروف اور ''ہر فن مولا'' ادیب، شاعر، دانشور اور عاشقِ اُردو کے نام ہے جس کے چرچے چار دانگِ عالم میں ہیں، اور میری بدقسمتی کے ساتھ ساتھ خوش قسمتی دیکھیے کہ فیصل آباد میں رہنے والے شوق انصاری سے تو آج تک نہ مل سکا مگر پنڈت گلزار دہلوی سے کئی ملاقاتیں رہی ہیں، اور وہ بھی محض ''مشاعروں والی'' نہیں، سعودی عرب کے شہر الجبیل میں ڈاکٹر وجاہت فاروقی کے ہاں اور جدہ میں ان کے ساتھ کئی نجی اور خوبصورت نشستیں رہیں اور اب چہارسُو میں ان کا اتنا بھرپور گوشہ دیکھنے کے باوجود ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'' کا سا احساس ہوتا رہا کہ جناب گلزار دہلوی جس خوبصورت، دل نشیں انداز میں گفتگو کی لڑیاں پروتے ہیں اور حسنِ سماعت کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں وہ انہی کا حصّہ ہے۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہیے، تھکن، بوریت یا اکتاہٹ قریب سے بھی نہ گزرے گی۔ مشاعروں میں ان کا کلام سماعت کرنے والے کلام کے ساتھ ساتھ ان کے نثری خطاب اور اردو زبان پر ان کی لامحدود دسترس کے بھی قائل ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے جوہر کسی محفل سے خطاب کرتے ہوئے ہی کھلتے ہیں۔ آپ نے ان سے انٹرویو میں اور آپ کے معاونین نے ان کے شعری انتخاب میں جتنی محنت کی ہے اس کی داد بھی دینا چاہوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرطاسِ اعزاز کے لیے کسی کا انٹرویو لینے سے پہلے آپ موزوں ترین سوالات کی تیاری میں بڑی محنت کرتے ہیں اور یوں اپنے ممدوح کی پوری پوری شخصیت کو قاری تک منتقل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔

افسانوں میں جناب حسن منظر کا ''شبِ ہراس'' اور محترمہ بشریٰ رحمٰن کا ''کھلونا جان کر'' بہت پسند آئے۔ محترمہ عذرا اصغر نے شمس آغا کے بارے میں بڑا عمدہ تاثراتی مضمون تحریر کیا ہے۔ جناب تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کی دسویں قسط بھی نہایت دلچسپ رہی اور حسبِ معمول اسے پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا انتظار میری طرح باقی قارئین بھی ضرور کر رہے ہوں گے۔ نثری حصّے میں جناب سلام بن رزاق کا یکبابی ڈرامہ ''کام دھینو'' بڑے علامتی انداز میں منظر در منظر ہمارے سامنے جس انداز میں مختلف نیتاؤں کے ہاتھ ایک غریب گوالے کی گائے کا دودھ دوہنے کی عکاسی کرتا ہے اس سے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں عوام کا خون نچوڑنے کی بات بڑے سلیقے کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔ عموماً ڈرامہ پڑھنے کی نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز ہوتا ہے مگر اس ڈرامے کا کمال یہی ہے کہ اس میں لفظی تصویر کشی اس قدر خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ ڈرامہ گویا خود بخود منظر در منظر سٹیج ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے اس شمارے سے بیماریوں اور ان کے علاج کے بارے میں جو سلسلہ آغاز کیا ہے وہ ایک مستحسن قدم ہے اور جس سلیس انداز میں انہوں نے ڈایالیسس کے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے یقیناً وہ قارئین کو صحت کے بارے میں احتیاط، پرہیز اور علاج کے سلسلے میں آگہی بخشے گا۔

آخر میں شعری حصے میں سے کچھ اچھے اشعار:

کبھی شعور کبھی لاشعور تک دیکھا
بکھر کے میں نے بہت دور دور تک دیکھا

(غالب عرفان)

تتلیوں میں بہت ہیں رنگ، مگر
وہ نہیں ہیں جو ڈھونڈتا ہوں مَیں

(قیصر نجفی)

تسکینِ جسم و جان ہے ایقان و آگہی
تشکیک کیا ہے ایک مسلسل عذاب ہے

(رؤف خیر)

نظموں میں تہران سے محترمہ شاہ رخ حیدری کی نظم ''مَیں ایک عورت ہوں'' نے چونکا دیا، عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، مرد کے استحصال کی مرئی اور غیر مرئی صورتوں کا شکار ہوتی رہتی ہے، چاہے کوئی ملک اپنے آپ کو کتنا ہی اسلامی اور مذہبی کیوں نہ کہے۔ ویسے تو ان کی پوری نظم ہی دبنگ اور تخلیقی احتجاج میں رچی ہوئی ہے مگر یہ تین لائنیں بڑے بلیغ انداز میں عورت کو درپیش المیہ بیان کرتی ہیں:

میں دو کام کرتی ہوں، وہ کام سے آتا ہے آرام کرتا ہے
میں کام سے آ کر پھر آرام کرتی ہوں
اور اسے سکون فراہم کرنا مرا ہی کام ہے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

بھائی گلزار جاوید، محبتیں۔

چہارسو کا تازہ ترین شمارہ بنام گلزار دہلوی وصول ہوا۔ جس شخصیت کی مطبوعات، اعزازات، انعامات اور دیگر کارناموں کو بیان کرنے میں چہارسو کے تین صفحات درکار ہوں اور جن پر بابائے اردو مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، آل احمد سرور، خواجہ حسن نظامی اور قراۃ العین حیدر جیسے مشاہیر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہو ان کے متعلق میں کیا عرض سکتا ہوں سوائے اس کے کہ آپ کمال محنت سے ہم جیسے کم علم قارئین کو اردو کے آسمان ادب کے روشن ستاروں سے متعارف کر کے بہت احسان کر رہے ہیں۔ پنڈت آنند موہن زتشی صاحب انجمن اردو کی ایک روشن ترین شمع ہیں جو کئی دہائیوں سے اپنے علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور انکے خوشہ چیں ان سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

''چہارسُو''

تاریخ اب جو ہوگی مرتب زبان کی
گلزار دہلوی کو بھلایا نہ جائے گا

افسانوی حصے میں بشریٰ رحمٰن صاحبہ (جو موجودہ دور کی معروف، مقبول اور کامیاب ترین قلم کار ہیں) کا ''افسانہ کھلونا جان کر۔'' حسن منظر کا ''شب ہراس'' اور نجم الحسن رضوی کا ''منزل کہاں ہے'' نے بہت متاثر کیا۔ دیگر افسانے بھی خوب ہیں مگر مجھے رینو بہل کا ''دو نیناں'' بہت اچھا لگا۔ رینو عورت کے احساسات کو خاص طور سے اسکی بنیادی جبلت یعنی ماں بننے کی خواہش اور اس سے وابستہ جذبات وحالات کی منظر کشی خوب کرتی ہیں۔

آغا گل نے اپنی پہچان بنالی ہے۔ وہ بلوچستان اور قبائلی علاقوں کے پس منظر میں قیامت خیز افسانے لکھ رہے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی انکا ناول ''دشت وفا'' پڑھا ہے۔ جو انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے بھیجا تھا آج کل وقت کی کمی کی وجہ سے ناول کم پڑھتا ہوں مگر یہ ناول مجھ سے ایسا چمٹا کہ میں اسے چھوڑ نہ سکا۔ اسی طرح ''چہارسو'' کے قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو اور قلمکاروں کے ناولوں نے مجھے ایسا گرفت میں لیا کہ میں انہیں چھوڑ نہ سکا۔ ایک رینو بہل کا ''گرد میں اٹے چہرے'' اور اور دوسرا انل ٹھکر صاحب کا ''پس اشک''۔ اس سے قبل میں نے کوئی چار سال پہلے شمس الرحمان فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' پڑھا تھا اور اس درمیان میں کسی ناول میں دل نہیں لگا تھا کہ اسے ختم کر سکتا۔ میری نظر میں وہی کتاب کامیاب ہے جو خود اپنے آپ کو پڑھوالے۔ میں ان تینوں قلمکاروں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

تابش کا زہریلا انسان خوب ہے۔ منظوم سیکشن میں نسیم سحر کا عیدا لفطر کے موقعے پر دہشت گردی، یوگی بہل کا فکر جدید، ڈاکٹر ریاض احمد کا یادوں کا خزانہ اور شگفتہ نازلی کا گھنگرو خوشی کے۔۔ قابل توجہ وستائیش ہیں۔ خطوط میں آپکے ''مولانا گاؤدی'' کی اتنی تعریفیں پڑھ کر تحریک ہوئی کہ میں۔ اسے دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہوگیا اور مزہ اٹھایا۔

آپ نے چہارسو کے ذریعہ ایک چھوٹا سا کنبہ تخلیق کر دیا ہے جس میں باہمی محبت اور ربط ہے۔ ہم سب اس کے لئے آپ کے ممنون ہیں۔

فیروز عالم (امریکہ)

برادرم گلزار جاوید، تسلیمات۔

بہت دنوں راہ دیکھی چہارسو کی۔ دراصل رفتہ رفتہ چہارسو قبیلہ بن چکا ہے نہ ملنے کے باوجود بھی تخلیق کاروں کو ہم جانتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا انتظار رہتا ہے۔ رینو بہل کا اپنا ایک انداز ہے جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر فن کار کی اپنی ایک شخصیت ہوا کرتی ہے۔ جیسے میں موپساں یا کرشن چندر کا انداز تو اپنا سکتا ہوں ویسا بن نہیں سکتا۔ تابش خانزادہ کا زہریلا انسا میں ڈرتے ڈرتے پڑھتا ہوں۔ میرے بچپن میں ہمارے ملازم پر جو حملہ ہوا وہ بچ تو گیا مگر ایک گہرا خوف دل میں بیٹھ گیا۔ حتیٰ کہ سائیکیٹرسٹ سے مدد بھی لی۔ جس نے مشورہ دیا کہ میں ان کی تصویریں کمرے میں لگاؤں۔ سپیرے سے لے کر ہاتھ میں تھاموں اور ذہن سے کہوں کہ یہ میرے دوست ہیں۔ بہت دن ہوئے اسکوٹر چلاتے اپنے دوست کے ہمراہ سنّی کے جنگل میں جھومتے ہوئے ناگ پہ چڑھ دوڑا۔ وہ تو غنیمت ہوئی کہ ناگ نے جھومنا ترک کر کے جھاڑیوں کی راہ لی۔ شاید ان کا خوف بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ذکاء الرب رباب نے بھی سپیرن سے عشق کی کہانی ناول کی صورت میں لکھی۔ پھر برسوں بعد جب میں نے پوچھا کہ کہانی کی طاقت بتلا رہی ہے کہ یہ کوئی سچی کہانی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ان کی اپنی کہانی ہے۔ تابش خانزادہ کے پاس بے حد معلومات ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ بڑے معرکے کا ناول ہے۔ کیا Imagination ہے اور کیا محویت ہے۔ ڈوب کے لکھتے ہیں۔

دوقومی نظریہ انگریزوں کی دین ہے۔ جنگ آزادی 1857ء جو اپنوں کے ہاتھوں ناکام ہونے کے بعد ہیوم نامی ایک انگریز سے انڈین نیشنل کانگریس نے بنوائی۔ پرانی نوابیاں موقوف کر کے نئی نوابیاں دی تھیں۔ نواب سلیم اللہ سے مسلم لیگ بنوائی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد نصاب سے وحشت کلکتوی کو نکالا گیا اور سلیم اللہ کی بجائے نواب محسن الملک کو مسلم لیگ کا بانی قرار دیا گیا۔ دونوں ملک حالت جنگ میں رہتے ہوئے باہم تجارت بھی کرتے ہیں۔ حکمران خاندانوں کی باہم محبت بھی جاری رہتی ہے۔ مگر اسلحہ بھی خریدا جا رہا ہے۔ ایٹم بم بنائے جاتے ہیں۔ وہ پرتھوی میزائل بناتے ہیں تو جواب آں غزل کے طور پر یہاں غوری میزائل بنایا جاتا ہے۔ بھارت نے تین کھرب کا Night Vision خریدا۔ اب ہمارے لوگ بھی رات کو دیکھنے والی عینکیں بنائیں گے۔ ننگے بھوکے عوام کا پرسان حال کون ہوگا؟ میرے افسانے پوئنٹ (مینڈک) کا ہیرو کہتا ہے کہ میرا دشمن تو مچھر ہے، کھٹمل ہے، غربت ہے، بھوک ہے۔ ایسی توپ بناؤ کہ چلنے سے آٹے کے ٹین نکل پڑیں ایسی بندقیں بناؤ کہ آٹے کی بوری نکل پڑے۔ بھائی یہ جنگی دیوتا کب مرے گا؟ مسلمان تو دیوی کی پوجا نہیں کرتے۔ یہ جنگی دیوتا کے پجاری کیوں بنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابرہیم نے تو انسانی قربانی پہ پابندی لگا دی تھی۔ وطن عزیز تک یہ قانون کیوں نہ پہنچا۔ کھربوں روپے کے قرضوں میں جکڑی ہوئی یہ قوم اربوں روپے خرچ کے یوم آزادی کیوں مناتی ہے؟ پولو میں ہول کیوں ہے؟ پول گول کیوں ہے؟ آپ نے معاشی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ خوفناک سہی مگر سچ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم ایک ڈوبتے ہوئے ٹائی ٹینک کے بے بس و بے کس مسافر ہیں۔ جو صرف افسانے ہی لکھ سکتے ہیں۔ راجواڑوں Royal Domains کے اتحاد کو جمہوریت کا نام دیا تا ہے۔ حالانکہ یہاں موروثی بادشاہت ہے۔ پیروں کی مانند گدّی بیٹے بیٹی یا نواسے کو ہی ملا کرتی ہے۔ دیکھیں کب ہمارا بھی Magna Carta منظور ہو اور ان خون آشام 900 خاندانوں سے نجات ملے۔ آپ کی حب الوطنی اور انسان دوستی کو سلام پیش کرتا ہے۔ چہارسو دوقومی نظریے کو باہم ملانے والا جوڑنے والا پُل ہے۔ بھائی دوقومی سہی۔ لڑو تو مت۔ منشی پریم چند کے بیلوں جھوری اور بھوری کی مانند باہم مل کے رہنے تو دو۔

آغا گل (کوئٹہ)

مدیرمحترم،سلام مسنون۔

ستمبر واکتوبر کا شمارہ محترم گلزار دہلوی صاحب کی کثیر الجہات و ہمہ گیر شخصیت کے علمی وادبی کارناموں، اعزازات وخطابات اور دیگر لسانی وسائنسی شاندار خدمات کو جن فنی مشاقی اور مدیرانہ ہنروری سے احاطۂ تحریر میں لایا گیا وہ بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی قابلِ تحسین سعی ہے۔ علاوہ ازیں متفرق و متنوع اقتباسات، دانشوروں کی آرا کے حوالے سے اُن کے ادبی مرتبے اور علمی تشخص کا تعین بحسن وخوبی کرتے ہیں۔ ختم المرسلینؐ۔۔۔در نعت۔۔۔کا مطالعہ بھی روحانی سرور کا باعث بنا۔ سبحان اللہ۔

کھوج کا سفر پڑھتے ہوئے لاشعوری طور پر یاد آتا گیا کہ مریدۂ محترمہ کے کہنے پر شمس آغا صاحب کے لیے مضمون بعنوان ''اظہر من الشمس'' شمس آغا تحریر کیا تھا جو ''تجدید'' کے دسمبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جمال درانی صاحب نے ''اندھیرے کے جگنو'' کے علاوہ طنز ومزاح پہ اپنی ذاتی کتاب بھی عنایت کی تھی۔ اور ''اندھیرے کے جگنو'' کے ڈیلکس ایڈیشن کے لیے فلیپ بھی لکھوایا تھا کیونکہ خطوط میں وہ اُن کے بارے میں نہایت مخلصانہ ودوستانہ جذبات وکیفیات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

شعری تخلیقات کے لیے پسندیدگی کا شکریہ۔ یہ حسنِ اتفاق ہی ہے کہ ڈیرہ اور پشاور سے قبل ازیں گزشتہ برسوں کے دوران پروفیسر غفار بابر، ناز سیٹھی صاحب اور صابر حسین امداد صاحب نے نہ صرف کتب وقلمی کاوشوں کی پذیرائی کی بلکہ مذکورہ صاحبان نے اردو، فارسی، ہندکو، سرائیکی شعری مجموعوں سے بھی نوازتے رہے۔ طبّی نکتہ نظر سے تحریر کردہ مضامین کا سلسلہ بہت مفید ومثبت نتائج کا حامل رہے گا کیونکہ آج کل ہر انسان کسی نہ کسی حوالے سے ذہنی، جسمانی، نفسیاتی بلکہ مابعد الطبیعاتی عوارض میں مبتلا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ڈایالیسس ہے اور اگلی سے مرض کی تشخیص ادویات کا بروقت استعمال وتسلسل اور ڈسچارج ہونے پر بھی فالواَپ میں رہنا مزید خدشات وشکوک کو اس جدید ٹیکنالوجی سے دور کرنے کا باعث وسبب بنے گا۔

''دعا زمین'' کو خاک نشین کے بوریے پر بنے نقش کی سی سچائی واخلاص سے مشابہہ کہنا کتاب کے مرکزی خیال کا عمیق مطالعہ ہے۔ تونے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا۔ میں تو پانی میں اُترا تھا دریا تیرے کہنے پر۔ ''میرے کشکول میں'' کا فنی وشعری محاسن کے ساتھ تجزیہ وتبصرہ حوالہ اقبالؒ کے ساتھ کچھ اور معتبر ومعزز محسوس ہوا۔

اس لیے وقتِ سحر جاگ رہا ہوتا ہوں
میں پرندوں سے تیرا ذکر سنا کرتا ہوں

''جب تصور ماں کا ہو'' میں محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب نے بھٹی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بڑی معنویت آمیز گہرائی سے ہجرت کے ساتھ مربوط ومنسلک کیا ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

عزیز محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''مسافرت'' پر تھا لوٹا تو ''چہارسُو'' دیکھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ آپ یاد کرتے ہیں رونق ہو جاتی ہے۔ شاعرِ بے بدل گلزار دہلوی کی شاعری کی جہتیں اپنی گونا گوں رعنائیوں کے ساتھ آنکھوں کا نور ہوئیں۔ ان سے متعلق مضامین معلومات افزا ہیں۔ ان کے بہت سے شعر اچھے لگے۔ مثلاً ایک دو

چرچا رہے گا جس کا سدا لامکان میں
آوازِ بازگشتِ مکاں چھوڑ جاؤں گا
محتسب سے حساب کیا ہوگا
خیر سے بے حساب پیتے ہیں

غرض گلزار دہلوی کی طرح داریوں کے جوہر چہارسو نظر آتے ہیں۔ بڑی قیامت خیز شاعری ہے۔ میری غزل کی کمپوزنگ موتی موتی ہے۔ مہربانی آپ کی۔ میرے خط میں لتا منگیشکر سے متعلق ایک نظم ہے۔ دسویں لائن میں لفظ نگاریں کی جگہ نگار میں لکھا گیا ہے۔ یہ نظم رسالہ ''پیامی'' میں نہیں ''بیاض'' میں چھپائی تھی۔ احباب نے اپنے خطوں میں مجھے یاد کیا ہے۔ آپا جمیلہ شبنم نے بھی ''ذکرِ کثیر'' کیا ایک شعر بھی دیا۔ آپا مجھ سے عمر میں چھوٹی ہوں گی پھر بھی آپا ہی کہوں گا کہ ہم لوگ چھوٹی بہنوں کو آپا ہی کہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن قاضی، نوید سروش اور اپنے ''دل پشوری'' ڈاکٹر ریاض احمد سے اظہارِ محبت!!! افسانہ لوح لاعی حیرت انگیز رہا۔ آغا گل افسانے میں دور از کار فضا استوار کر کے خوش گوار حیرت در انداز کرتے ہیں۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

عین انتظار میں ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، مسرت ہوئی۔ مسرت تو اس لیے بھی ہوئی کہ اس بار اردو کے مخلص پرستار شاعر گلزار دہلوی کو آپ نے قرطاسِ اعزاز عطا کیا جو واقعی حق بہ حقدار رسید کے مترادف تھا۔ پہلے صفحے پر ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے یادگاری خطابات ''کراچی میں بہار'' اور حضرت خواجہ حسن نظامی کے ''چکبستِ ثانی'' نے دل موہ لیا پھر براہِ راست نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی میں ان کے بارے میں کیا لکھوں کیا نہ لکھوں کہ ایسے اردو کے شیدائی تو برسوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں کی کمی پوری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ایک طویل صحت مند زندگی عطا کرے، آمین۔ ہاں صفحہ ۳۶ پر شائع قطعات میں سے ایک منتخب قطعہ ان کی عقیدت میں پیش کر رہا ہوں۔

صدیوں کے اتحاد کا زندہ نشان ہے
آزادی کا وسیلۂ ہندوستان ہے
دلّی و لکھنؤ میں مقید نہیں ہے اب
مقبول سارے دہر میں اردو زبان ہے

افسانوں میں ''شاک تھراپی'' (مہتاب عالم پرویز) اور عذرا اصغر کا ''کھوج کا سفر'' جس میں مرحوم شمس آغا کی یاد موجود ہے پسند آئے۔ سلام بن

رزاق بہت دن بعد اپنے اک بابی ڈرامے ’’کام دھنیو‘‘ کے ساتھ نظر آئے اور اپنے رنگ میں ہی نظر آئے۔ ’’گائے‘‘ کے موضوع پر اس سے خوبصورت تمثیل شاید ممکن نہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ڈایالیسس کے موضوع کو جس طرح عوامی دلچسپی کا باعث بنایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ مبارک ہو!

دیپک کنول نے مشہور ہدایت کار، فلمساز اور اداکار ایل۔ وی۔ پرساد کی حیات کے اوراقِ زندگی ’’چہار سو‘‘ کے قارئین کے سامنے کھولے ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔ مجھے پرساد پروڈکشن کی فلم ’’شاردا‘‘ کبھی نہیں بھولے گی جس میں راج کپور اور مینا کماری کی یادگار اداکاری نے فلم کے آخر تک تماشائیوں کو باندھے رکھا تھا یہ دراصل ایک داستانِ عشق تھی جس میں عاشق کی محبوبہ کی شادی عاشق کے باپ سے ہو جاتی ہے!

غالب عرفان (کراچی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہار سو کا گلزار دہلوی نمبر ایسے نابغۂ روزگار لیجنڈ سے منسوب ہے جو بانوے سال کی عمر میں تسلسل سے گیسوئے اردو سنوارنے اور متعدد شعبوں میں زبردست خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی خوبصورت شاعری اور دیگر خدمات کو برصغیر کی جن بلند پایہ ہستیوں نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے اُن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالحسن ندوی، جوش ملیح آبادی اور علامہ نیاز فتح پوری شامل ہیں۔ آپ نے قارئین کے سامنے ان کی شخصیت، ادبی خدمات اور دیگر پہلوؤں سے خوب پردہ اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے سلیس اردو میں طبّی معلومات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ زیرِ نظر شمارے کے چھ کے چھ افسانے خوب ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل نے ’’دو نیناں‘‘ میں انسانی جذبات و حالات کے بدلتے ناپائیدار رنگ کی ایسی دلپذیر منظر کشی کی ہے جو دیر تک قاری کے دل پر اثر انداز رہتی ہے۔ کلیم فیض پوری کا افسانہ ’’آرام گھر‘‘ معاشرے کے مختلف طبقوں کی ایسی مثالیں پیش کرتا ہے جب انسانیت اور خدمت کے جذبے سے معمور لوگ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں وہیں بے بسی اور بے کسی کے مناظر بھی سامنے آتے ہیں جو بدلتی ہوئی پست اقدار کی علامت ہیں۔

شاعری کا حصہ بھی خوب ہے۔ آصف ثاقب کی ’’تقویم‘‘ پروین شیر کا ’’گول آئینہ‘‘ یوگیندر بہل تشنہ کی ’’فکرِ جدید‘‘ کے علاوہ غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، رؤف خیر، شگفتہ نازلی کے کلام نے بہت متاثر کیا۔

میں اُن احباب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مجھ ناچیز کی بابت اچھے کلمات تحریر فرمائے بالخصوص آپا جمیلہ شبنم کا دل سے شکریہ۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

’’چہار سو‘‘ کا تازہ بہ تازہ شمارہ اپنی اعلیٰ ادبی روایت کے ساتھ ۹۔ اکتوبر کو نظر نواز ہوا اور رات گئے تک آدھے سے زیادہ صفحات پڑھ ڈالے۔ امام اردو اور افتخار اردو گلزار دہلوی صاحب کی شخصیت، اُن کی فکری و فنی، تہذیبی و سماجی اور اردو زبان کی عملی خدمات سے رسالے کے صفحات منور کیے ہیں۔ ’’براہِ راست‘‘ میں بڑی سادگی اور سچائی سے جوابات دیے ہیں مگر بحالتِ مجبوری ایک سوال کے جواب سے بچ کر نکل گئے۔ گلزار دہلوی صاحب نامور لوگوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں اور فیض یاب ہوئے ہیں جو اُن کی نگارشات اور پھر انعامات و اعزازات سے ظاہر ہے۔ جگر مراد آبادی، پروفیسر آل احمد سرور، مولانا حفیظ الرحمان، علامہ نیاز فتح پوری اور دیگر کی آرا بڑا اعزاز ہے۔ عطیہ سکندر علی صاحبہ نے گلزار دہلوی کے نظمیہ کلام کا انتخاب خوب کیا ہے خصوصاً قطعات زبردست ہیں۔ فاری شا نے غزلیہ انتخاب پیش کیا ہے۔ ان کی غزل پرانی اور نئی غزل کا خوب امتزاج ہے۔ قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، سید حامد، فاروق ارگلی اور دیگر نے اُن کی شخصیت، علمی و ادبی، سماجی اور اردو زبان کی خدمات پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

نجم الحسن رضوی کا افسانہ ’’منزل ہے کہاں تیری‘‘ میں تجسس، روانی کے ساتھ ساتھ مصنف کا مشاہدہ اور مطالعہ کمال کا ہے۔ کہانی کو بین الاقوامی سیاسی تناظر اور مہاجروں کی آبادکاری کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کہانی ’’ہرنام داس‘‘ میں ماضی کی بازگشت کے ساتھ بچے کی نفسیاتی کیفیت کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ حسن منظر صاحب نے ’’شبِ ہراس‘‘ میں سوانحی انداز اپنایا ہے۔ حنیف باوا اور عذرا اصغر بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہیں۔ ’’نغمہ محمدی‘‘ جرمن سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ہم تک پہنچا ہے مگر اس کی تاثیر برقرار ہے ڈاکٹر شان الحق حقی اردو انگریزی زبانوں کے ماہر تھے۔

آصف ثاقب، مہندر پرتاپ چاند، غالب عرفان، کرامت بخاری، اشرف جاوید، عطا الرحمٰن قاضی، عارف شفیق، ابراہیم عدیل اور ظہیر اقبال کی غزلیں اپنے عہد کی شناخت ہیں ان کی انفرادیت خیال کی تازگی ہے۔ انجم جاوید کی نظم ’’وراثت‘‘ میں ماضی، حال اور مستقبل گونج رہا ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمان ’’ارض پاکستان‘‘ ایک دعائیہ نظم ہے جس میں اچھے دنوں کی آس ہے۔ آفتاب مضطر کے طنزیہ قطعات اثر انگیز ہیں۔ شاہ رخ حیدری کی تلخ نظم ’’میں ایک عورت ہوں‘‘ میں مردوں کی حکمرانی تصویر پیش کی ہے۔ مگر اب عورت بھی اتنی مجبور و بے بس نہیں ہے۔ پروین شیر کی نظم ’’گول آئینہ‘‘ مشاہدے اور مطالعے کو ظاہر کر رہی ہے۔ یوگیندر بہل، یونس صابر اور وشال کھُلر کی نظمیں اچھی لگیں۔ فیصل عظیم، پروین کمار اشک کی کتاب ’’دعا زمین‘‘ کا تعارف قرینے سے کروایا ہے جس سے کتاب پڑھنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ فیصل عظیم ہی نے فیس بک کے ذریعے ہی معروف شاعر انجم جاوید کی والدہ کے انتقال کی اطلاع دی تھی بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ والدہ کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

نوید سروش (میر پور)

..... داغ دہلوی.....

زیرِ نظر انتخاب میں داغ کے چاروں دواوین سے غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کلامِ داغ کے تدریجی ارتقائی مطالعہ کے لیے مطبوعہ دواوین، کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس انتخاب کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ کلامِ داغ سے ایک ایسا منتخب حصہ شاعری مجموعہ کی شکل میں سامنے آجائے کہ اسے پڑھنے والا داغ کے فکر وفن کی اساسی خوبیوں سے بھی آشنا ہو جائے اور ان کے معروف اشعار سے بھی لطف حاصل کرے۔ لہٰذا اس انتخاب میں شامل غزلیں اور فردیات کو باقاعدہ تدریجی ارتقائی ترتیب سے پیش کرنے کے بجائے ذوق شعری کی تسکین کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے مزید یہ کہ اس طرز انتخاب میں غزلوں اور دیگر منتخب اشعار کی ترتیب وتہذیب میں حروفِ تہجی کے اصول سے بھی قصداً صرف نظر کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ طریقۂ انتخاب قارئین کے ادبی ذوق کی تربیت میں معاون ثابت ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ پر بہت کچھ لکھا گیا اور ان کی شاعری کے منتخب حصے بھی شائع کیے گئے۔ مگر یہ کام اس نکتہ نظر سے نہیں ہوسکا۔ داغ کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور گیرائی کو سامنے رکھ کر ایک ایسے انتخاب کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جارہا تھا جس میں داغ کے ایسے اشعار شامل ہوں جو ابدی تاثر کے حامل ہوں اور ان کی معنویت ہر زمانے میں قائم رہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ زبان کی چاشنی سے لطف اندوز ہوں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ شعر کو تسکین جسم وروح کا سامان ہونا چاہیے۔ وہ اس انتخاب سے ضرور متمتع ہوں گے۔ .....ڈاکٹر نثار ترابی

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۱۳۰ روپے، دستیابی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔

..... عالمی اردو ادب .....

عالمی اردو ادب کا اگست ۲۰۱۷ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ لیکن افسوس کہ اس بار اس میں ہمیں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ہم اس میں افسانوی گوشے کو کوئی جگہ نہیں دے سکے اور صرف ہی کہانیاں شامل اشاعت کی گئیں جو مرحومین کی تحریر کردہ ہیں تاکہ قارئین اُن کے افسانوی اسلوب و تحریر سے واقف ہوسکیں۔ اسی طرح ۲۰۱۶ء میں وفات پانے والے متعدد ادباء وشعراء پر صرف ایک ایک مضمون پر اکتفا کرنا پڑا حالانکہ ان پر بھرپور گوشے شائع کرنے کی ضرورت تھی۔ یہی نہیں ہمیں نظموں اور غزلوں کے صفحات میں بھی کمی کرنی پڑی۔ وجہ یہ کہ ۲۰۱۶ء میں ہمارے بے شمار اہلِ قلم ہم سے بچھڑ گئے جن میں پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر اسلوب انصاری، انور سدید، بیکل اُتساہی، پیغام آفاقی، جوگندر پال، خلیق انجم، زبیر رضوی، شکیل الرحمٰن، جمیل الدین عالی، شمیم نکہت، عابد سہیل، کشمیری لال ذاکر، م۔ ناگ، منظر شہاب، ندا فاضلی کے علاوہ اور بھی کئی اہم ادبی شخصیات تھیں جن پر گوشے اور مضامین شائع کرنا ضروری تھا مگر اس کے لیے پانچ چھ سو صفحات کی ضرورت تھی جبکہ ہم نے اپنے آپ کو ۴۰۰ صفحات تک محدود کر رکھا ہے لہٰذا انہیں پوری طرح سے متعارف نہیں کرا سکے جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ اگر موقع ملا تو ہم آئندہ شمارے میں ان پر مضامین شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ .....نند کشور وکرم

قیمت: ۴۰۰، دستیابی: کرشن نگر، دہلی۔

..... نملوس کا گناہ.....

شموئل احمد کے افسانوں کا انتخاب قارئین کی خدمت میں بصد شوق حاضر ہے۔ ان کا نام برصغیر کے نمائندہ تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو کسی بھی رسمی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہم شموئل صاحب کے افسانوں کا انتخاب شائع کرتے ہوئے مسرور بھی ہیں اور مطمئن بھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے بک اسٹال میں ان کا کوئی افسانوی مجموعہ دستیاب نہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اپنے وقت کے بڑے افسانہ نگار جناب شموئل احمد کے منتخب افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جائے جس سے قارئین کی تشنگی کم ہو۔ یوں تو ان کی چند کہانیاں ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں جس کے باعث برصغیر سے باہر بھی اُن کی شہرت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ شموئل صاحب اردو زبان کے ساتھ ہندی زبان میں بھی یکساں قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ہندی ادب کے قارئین کو ان کی کہانیوں میں نیا نکتہ نظر آیا اور ان کے اسلوب، تفہیم اور نکتہ نظر کو کافی سراہا گیا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انتخاب دونوں زبانوں کے قارئین کو محظوظ کرے گا۔ .....مصطفیٰ سید

قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔

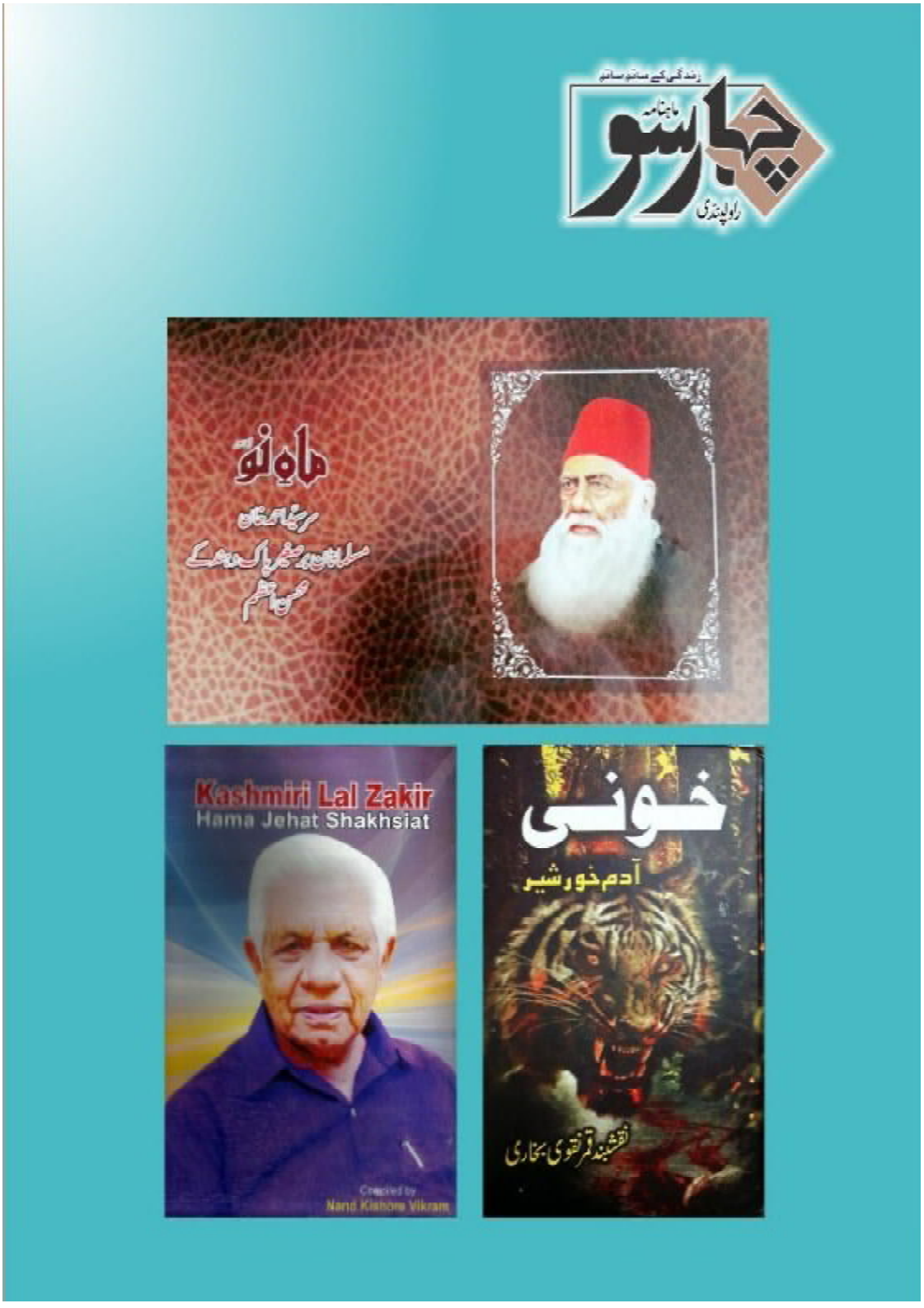
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
ماہِ نو
Kashmiri Lal Zakir
Hama Jehat Shakhsiat
Compiled by
Nand Kishore Vikram
خونی
آدم خور شیر
نقشبند قمر نقوی بخاری